جنگل روتے ہیں

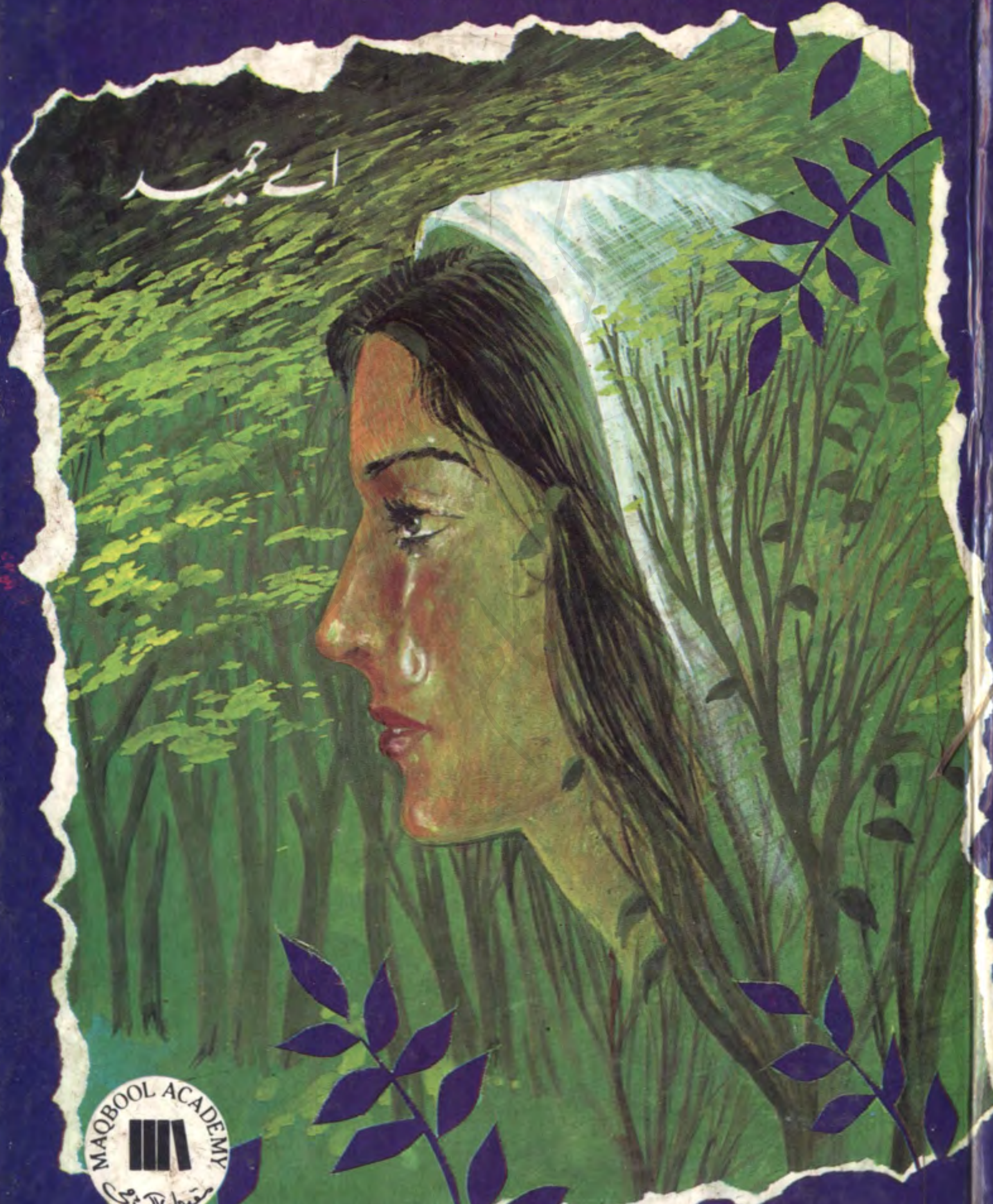

چمبہ گلی میں ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔
ابھی ایک پہر رات باقی ہے اور قصبہ پنج ناگ جانے والی پتھریلی سڑک دھند کی لطیف چادر اوڑھے سو رہی ہے۔ اس کے دونوں کناروں پر اُگے ہوئے سفیدے کے درخت بڑے نالے کے پُل تک چلے گئے ہیں۔ ان درختوں میں بسیرا لینے والے پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں چُپ چاپ پڑے ہیں اور ان کے اوپر پہاڑوں کے گہرے نیلے شفاف آسمان پر چمکیلے ستاروں کے فانوس جھلملا رہے ہیں۔ چمبہ گلی سے تین کوس اوپر قصبہ پنج ناگ کے اک منزلہ مکانوں کے ہلکے ہلکے خاکے تاروں کی دھیمی روشنی میں سایوں کی مانند دکھائی دے رہے ہیں، چنار اور چیڑھ کے سنسان جنگلوں میں شروع بہار کی راتوں کی گہری اور صحت مند خاموشی چھائی ہے اور ان کے عقب میں جموں، کانگڑہ، کشمیر اور تبت کی برف پوش چوٹیاں کہرے کی سرد چادر میں چھپی ہوئی ہیں چراگاہوں میں شبنم میں بھیگی ہوئی تازہ گھاس ان بھیڑ بکریوں کے انتظار میں ہے جو خاردار باڑوں کے اندر ایک دوسری سے لگی سو رہی ہیں، اگرچہ یہ بہار کے دن ہیں اور مئی شروع ہو چکا ہے تاہم مکئی اور باجرے کے کھیتوں میں سردیوں ایسی دھند چھائی ہوئی ہے اور آلوچے اور ٹنگ کی ٹہنیوں پر لگے ہوئے نیم کاسنی اور سپید پھولوں پر سے شبنم کے قطرے ٹپک رہے ہیں، سیب اور گلاس میوے کے باغات میں رات کے آخری سائے دم توڑ رہے ہیں اور مشرقی آسمان پر پہاڑوں کے اوپر صبح کاذب کی نیلگوں جھلک سی نمودار ہونے لگی ہے۔
زمین سے دس ہزار فیٹ کی بلندی پر جب پہاڑوں پر صبح ہوتی ہے تو جنگلوں، وادیوں اور

چراگاہوں میں بھونروں کا جشن منایا جاتا ہے۔ اس جشن میں چیڑھ کے جھومر، سیب کے شگوفے، آلوچے کے پھول اور اس کی کلیاں اور چشموں کی رل ترل اور بل کھاتی پتلی دبلی ندیوں کی موسیقی اور گلدموں، ٹڈموں، بھنوروں اور طوطوں کے گیت حصہ لیتے ہیں۔ یہاں جب سورج سر پر کرنوں کا سنہری تاج رکھے کوہ قاف کی برف پوش چوٹیوں سے جھانکتا ہے تو وہ کارخانوں کی طرف بھاگتے ہوئے فکرمند چہروں کی بجائے گھاس کے سبز تلوں پر آزادی اور بے فکری سے کلیلیں کرتی سپید سپید بھیڑوں کو دیکھتا ہے اور کاروں، موٹروں، ریڑوں اور گھوڑا گاڑیوں کے بے ہنگم شور کی بجائے دودھ بلوتی گوالنوں کی چوڑیوں کی میٹھی جھنک سنتا ہے اور بادام کے درختوں میں پھدکتی ہوئی چڑیوں کی چہکاریں سنتا ہے۔ وہ ان عورتوں کو نہیں دیکھتا جو اپنے کاہل اور بھدے جسم ریشمی کمبلوں میں چھپائے سو رہی ہوتی ہیں۔ اور جنھیں کبھی کھانا ہضم نہیں ہوتا اور جو دو قدم چلنے پر ہانپنے لگتی ہیں۔ وہ ان پتلی چھریری چرواہنوں کو دیکھتا ہے جو صبح کی تازہ ہوا میں ہرنیوں کی طرح مرطوب ڈھلانوں پر بھیڑ بکریوں کے پیچھے بھاگتی پھرتی ہیں جو دن میں کئی بار باجرے کی روٹی پر کرم کا ساگ ڈال کر کھاتی ہیں اور دیر دیر دھوپ میں پھرنے سے جن کا رنگ کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے اور جسم سے کچے دودھ کی مہک اٹھنے لگتی ہے۔ وہ کارخانے کی چمنیوں میں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی بجائے پھولوں کے گرد سیاہ بھنوروں کو منڈلاتے دیکھتا ہے اور بکریوں کی میں میں اور چڑیوں کی چیوں چیوں سنتا ہے، ان آوازوں میں کارخانے کی چیخوں سے زیادہ خلوص اور نغمگی ہے۔ ان میں فیضؔ کی ساری نظمیں اور میرا بائی کے سارے گیت ہیں اور راگ کے تمام سُر ہیں یہ سمپورن راگ ہے، یہ بڑے ٹھاٹھ کا راگ ہے اور اسے ہر کوئی سن سکتا ہے اور کوئی کوئی سمجھ سکتا ہے۔ شہروں کا سورج پہاڑوں کے سورج سے بہت مختلف ہے، بہت الگ تھلگ ہے پہاڑوں پر اس کا چہرہ خوشی سے مسکرا رہا ہوتا ہے اور شہر کی سنگین عمارتوں کے عقب میں اداس اور بجھا بجھا سا ہوتا ہے۔ پہاڑوں پر وہ ایک خوبصورت صحت مند نوجوان ہے جس کا جسم تانبے کی طرح دمک رہا ہو اور جو سرخ رومال گلے میں باندھے چشمے پر بیٹھا سیب کھا رہا ہو۔ اور شہر میں وہ ایک مریض ہے جو اپنی چارپائی پر نیم درانہ ویران نظروں سے وارڈ کے مریضوں کو تک رہا ہو اور سوچ رہا ہو۔

میں کب اچھا ہوں گا؟ میں کب یہاں سے جاؤں گا؟

شہروں میں آکر سورج بھی یہی سوچتا ہے۔ ہر چرواہا یہی سوچتا ہے۔

میں کب اچھا ہوں گا؟ میں کب یہاں سے جاؤں گا؟

شہروں میں بھی پھول کھلتے ہیں لیکن ان پر شبنم نہیں گرتی اور جس پھول پر شبنم نہ گرے، وہ خدا کی مشین میں رکا ہوا پیچ ہے، میز پر رکھا ہوا راکھدان اور راکھدان میں رکھا ہوا سگریٹ ہے مگر پھول نہیں ہے۔ شہر میں آکر پھول راکھدان بن جاتے ہیں اور وادیوں میں اگر راکھدان پر شبنم کے موتی گریں تو وہ اپنے آپ مہک دینے لگتا ہے جیسے وہ رات کی رانی ہو، گل شبو ہو، گل صد برگ ہو، گیندا ہو، گلاب ہو، نرگس ہو۔

لیکن چمبہ گلی میں نرگس بہت کم ہوتا ہے۔ خودرو پھولوں کے علاوہ یہاں چمبہ گلی، موتیا، گلاب اور ترناری کے پھول عام پائے جاتے ہیں اور چمبہ گلی گاؤں کے لوگ ان پھولوں کی بڑی حفاظت کرتے ہیں اور ان سے بڑی محبت کرتے ہیں، یہ لوگ ریاست چمبہ کے رہنے والے ہیں اور تقسیم کے بعد قصبہ بیج ناگ کے قرب و جوار میں آکر آباد ہو گئے ہیں، چمبہ گلی گاؤں میں کل سات آٹھ اک منزلہ سلیٹی چھتوں والے مکان ہیں جن کے اوپر تنگ اخروٹ اور بادام کے گنجان درختوں کی پُرسکون چھاؤں پھیلی ہوئی ہے۔ اس گاؤں کا نام انھوں نے خود رکھا ہے۔ اس نام میں ان پھولوں کا بھی ذکر ہے جن کی بیلیں ان کے آبائی گھروں کی چھتوں اور دیواروں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ اور اس سرزمین کا بھی جس کی دیواروں میں کھیل کود کر، ہل چلا کر اور جس کے چشموں کا پانی پی کر یہ لوگ صدیوں سے زندگی بسر کر رہے تھے اور جو اب ان سے ہزاروں میل دور ہے جو سامنے والی پہاڑیوں کے عقب میں ہے لیکن جوان سے لاکھوں میل دور ہے اور دیوارِ چین کے عقب میں ہے اور ماؤنٹ ایورسٹ کے اس پار ہے۔ چمبہ گلی کے سپید سپید چھوٹے چھوٹے پھولوں سے اس گاؤں کی سبھی عورتیں اور مرد محبت کرتے ہیں۔ یہ پھول انھیں اپنے وطن اور اس کی مہک اور اس کی ہواؤں کی یاد دلاتے ہیں۔ وہ پانچ چار سال کے عرصے میں بظاہر اپنے وطن کو بھول سے گئے ہیں، لیکن چمبے کی یاد ایک داغ بن کر ان کے دلوں میں سلگ رہی ہے اور شادی بیاہ کے موقع پر جب کوئی سیاہ آنکھوں اور شہد بھرے ہونٹوں والی گوالن سر ایک طرف لٹکا کر ڈھولک کی

تھاپ پر گاتی ہے ۔

پھلاں بھری چنگیر اک پھُل چمبے دا

ہو چمبے دا

تو سننے والوں کی آنکھیں بھر آتی ہیں، ان کے دل چمبے کی یاد میں سسکنے لگتے ہیں اور وہ پلک جھپکنے میں اپنے وطن پہنچ جاتے ہیں اور ان کا وطن ان کے پاس آجاتا ہے اور راستے میں کوئی ماؤنٹ ایورسٹ نہیں آتی، کوئی واہگہ حائل نہیں ہوتا۔ اور کوئی پرمٹ نہیں پوچھتا۔ وہ صرف آنکھیں بند کرتے ہیں اور اپنے وطن کی پتھریلی گلیوں میں گھوم رہے ہوتے ہیں اور چشموں کے پاس درختوں کی چھاؤں میں بیٹھے حُقّہ پی رہے ہوتے ہیں اور ان کی بچیاں خچروں پر دودھ لادے اور لمبوتری ٹوکریوں میں سبزیاں اور پھل رکھے شہر جاتے ہوئے ان کے سامنے سے گزرتی ہیں اور ایک دم خاموش ہوجاتی ہیں اور تھوڑی دور جاکر پھر وہی آپس میں ہنسی مذاق شروع کر دیتی ہیں۔ آنکھیں بند کیے وہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور آنکھیں کھولتے ہی یہ سب کچھ غائب ہوتا ہے اور وہ سوچتے ہیں کہ وہ اپنے وطن کو کبھی نہ بھُلا سکیں گے۔ جب تک وہ زندہ ہیں ان کے دلوں کا ہر زخم، ہر داغ زندہ رہے گا اور رِستا رہے گا اور سلگتا رہے گا اور کون جانے ابھی وہ کب تک زندہ رہیں۔

ترناری کا پھول گیلی زمین اور زیادہ پانی مانگتا ہے۔ یہ عام طور پر چشموں، باؤلیوں اور ندی نالوں کے کنارے الجھی ہوئی گنجان بیلوں میں اُگتا ہے۔ یہ بیلیں نصف کے قریب پانی میں ڈوبی رہتی ہیں۔ اس کا رنگ ہلکا نیلا ہوتا ہے اور ستاروں سے ملتا جُلتا ہے، اس کی خوشبو بڑی گہری اور میٹھی ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے رات کی رانی میں موتیے کی مہک مخلوط ہو رہی ہو۔ چمبہ کلی کی خوشبو بھی شیریں اور ٹھنڈی ہوتی ہے اور یہ پھول اپنی بیل پر کافی دنوں تک مہکتا رہتا ہے۔ ترناری کے پھول بچیاں توڑ توڑ کر اپنی جھولیاں بھر لیتی ہیں اور ندی کنارے درختوں تلے بیٹھ کر ان کے ہار پروتی ہیں اور گجرے بناتی ہیں لیکن چمبہ کلی کے پھول انھیں نہیں دیئے جاتے۔ ان پھولوں کے ساتھ گاؤں والوں کی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں اور انھیں صرف بیاہ شادی کے موقع پر دُولہا دُلہن کو سجانے کے لیے توڑا جاتا ہے۔ جب کوئی لڑکی بے دھیانی میں

چمبہ کلی کی بیل کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے تو دوسری فوراً پکار اٹھتی ہے۔

چمبہ کلی نہ توڑ ویر میرا بیاہے گا

اور واقعی پھول توڑنے پر ان کے ویر (بھائی) ان سے ناراض ہوجاتے ہیں، پھر وہ اداس ہوجاتی ہیں اور ان کے آگے پیچھے پھر کر ان کی منتیں کرتی ہیں، انھیں مناتی ہیں اور جب وہ مان جاتے ہیں تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہیں اور یہ کہہ کر بھاگ جاتی ہیں۔

"ہم تو کھیل رہی تھیں، نہیں بولتے تو نہ بولو"

چمبہ کلی میں سبھی گھرانے گوالوں کے ہیں ان کے پاس اپنی بھینسیں ہیں، جن کا دودھ یہ قصبے میں لے جاکر بیچتے ہیں۔ قصبہ پنج ناگ کافی بڑی آبادی ہے اور دو ایک سال سے پاکستان کے پہاڑی مقامات میں شمار ہونے لگا ہے۔ شروع شروع میں یہاں کوئی پختہ سڑک اور ڈاکخانہ نہ تھا لیکن اب وہاں ڈاک گھر بھی ہے اور کمیٹی کا دفتر بھی ہے اور ایک چھوٹا سا ہسپتال بھی زیر تعمیر ہے۔ قصبے کے بازاروں میں سڑکیں پختہ کر دی گئی ہیں اور شہری لوگوں نے حکومت سے زمینیں خرید کر اپنے مکان بنانے شروع کر دیے ہیں، کئی ایک سُرخ سُرخ چھتوں والے خوبصورت مکان بن چکے ہیں۔ اور کئی ایک بن رہے ہیں۔ گرمیوں میں یہ مکان آباد ہو جاتے ہیں میدانوں کی گرمی، تپش اور جھلسا دینے والی لو سے بھاگے ہوئے لوگ یہاں کی ٹھنڈی ہواؤں میں آکر اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور جب نومبر میں برفباری شروع ہونے والی ہوتی ہے تو پھر میدانوں میں بھاگ جاتے ہیں۔ حکومت اس قصبے کو بہترین پہاڑی مقام بنانے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔ اگرچہ ابھی تک لاریوں کے گزرنے کی کوئی باقاعدہ سڑک نہیں بنی کیونکہ پنج ناگ کو جانے والا راستہ بڑا پیچیدہ اور خطرناک ہے۔ لیکن دریائے جہلم کی جانب سے ایک کافی بڑی سڑک کی پیمائش وغیرہ کا کام شروع ہو گیا ہے۔ جس سڑک پر سے لوگ آجکل پنج ناگ جاتے ہیں وہ زیادہ چوڑی نہیں ہے۔ اس پر چھوٹے پتھروں کے ٹکڑے بچھے ہیں اور کائل اور چیڑھ کے درختوں کی چھاؤں رہتی ہے۔ یہ سڑک دو تین پہاڑیوں کا چکر کاٹتی تاریک گھاٹیوں اور بھیانک کھڈوں کے منظر پیش کرتی تیس میل تک نیچے چلی گئی ہے۔ پنج ناگ آنے والے لوگ قاضی پور تک لاریوں میں آتے رہتے ہیں۔ اور اس کے بعد خچروں پر سوار ہو کر پہنچتے ہیں۔

راستے میں ہر دس میل پر ڈاک بنگلہ ہے جہاں کھانے پینے کی ہر شے مناسب دام پر مل جاتی ہے۔ قاضی پور سے پنج ناگ پچیس میل ہے۔ یہ راستہ خچر پر دو دن میں طے ہو جاتا ہے۔۔۔ چڑھائی دشوار ہونے کے باوجود لوگ راستے کا لطف اٹھاتے ہوئے آتے ہیں۔ جب پنج ناگ تین سوا تین میل رہ جاتا ہے تو چمبہ گلی کا گاؤں آتا ہے۔ یہ گاؤں سڑک سے ہٹ کر، سیب بگگوشے اور خوبانی کے باغ کی پشت پر واقع ہے اور سڑک پر سے دکھائی نہیں دیتا۔ یہاں سے ایک پگڈنڈی باغ کے بیچوں بیچ اس گاؤں کو جاتی ہے۔ اس مقام پر سڑک کنارے اونچے تلے پر ٹھنڈے پانی کی ایک باؤلی ہے جس کا پانی اوپر پنج ناگ کے چشموں سے آتا ہے، میدانوں سے آنے والے کبھی کبھار یہاں اپنی خچروں کو پانی پلانے کے لیے رکتے ہیں اور پانی پلا کر پھر آگے چل دیتے ہیں سیب کے باغ میں سے گزرتی ہوئی پگڈنڈی دودھ لے جانے والے گوالوں کی آمد و رفت سے چھوٹی سی کچی سڑک میں تبدیل ہو گئی ہے۔ باؤلی پر دوپہر کو گاؤں کی عورتیں میلے کچیلے کپڑوں کا انبار لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اور شام تک جی بھر کر باتیں بھی کرتی ہیں اور کپڑے بھی دھوتی ہیں۔ گاؤں میں تقریباً ہر مکان کے ساتھ ایک آدھ کھیت بھی ہے جہاں یہ عورتیں اور ان کے مرد مکئی اور ترکاریاں وغیرہ بوتے ہیں۔ سارا دن ان کی بھینسیں سرسبز ڈھلوان چراگاہوں میں ادھر ادھر پھر کر چرتی رہتی ہیں، بھینسیں چرانے کا کام عام طور پر نوجوان گوالنوں کے سپرد ہوتا ہے۔ جو دو دو تین تین ٹولیوں کی شکل میں بٹ جاتی ہیں۔ بھینسیں گھاس پر چل پھر کر جگالی کرتی رہتی ہیں۔ اور گوالنیں کھیتوں میں سے چرائے ہوئے ادھ پکے دودھیا بھٹے بھون بھون کر کھاتی ہیں۔ اور یا کچے سیب توڑ کر لے آتی ہیں اور انھیں کچر کچر چبانے لگتی ہیں اور یا ایک دوسری کے ہاتھ تھام کر گردنیں پیچھے کو ڈھلکا کر جھومر ساڈالنے لگتی ہیں اور جب اس کھیل سے بھی تھک جاتی ہیں تو کوئی نٹ کھٹ گوالن اپنی کمر کے گرد سے سیاہ رسی کھول کر کسی درخت کی جھکی ہوئی شاخ پر اچھال دیتی ہے۔ اس کی پینگ تیار ہو جاتی ہے اور ہنسی مذاق اور ہاؤ ہو کے شور میں اسے زور زور سے بڑھایا جاتا ہے۔ جب دوپہر ڈھلنے لگتی ہے تو وہ ڈھور ڈنگروں کو ہنکاتی باؤلی پر لے جاتی ہیں، جہاں انھیں نہلاتے ہوئے ایک دوسری کے منہ پر پکڑ کر دودھ کی دھاریں پھینکی جاتی ہیں اور پانی کے چھینٹے مارے جاتے ہیں اور اگر کوئی مسافر اپنی خچر کو پانی پلانے وہاں آ جائے

اس کی خوب گت بنائی جاتی ہے۔

اس دوران میں ان کے بھائی اور خاوند قصبے میں محنت مزدوری کرنے گئے ہوتے ہیں اور یہ گھر میں جھاڑ پونچھ، ڈنگر خانوں کی صفائی پھٹے پرانے کپڑوں کی مرمت وغیرہ میں لگی رہتی ہیں۔ ان کے بوڑھے ماں باپ رسیوں کی بٹائی وغیرہ کرتے ہیں۔ پرانی چارپائیوں کے بان کھول کر انھیں بٹتے رہتے ہیں، انھیں دھوپ میں الٹا الٹا کر گرم پانی سے کھٹمل مارتے ہیں اور اگر کوئی کام نہ ہو تو کھیت میں جا کر ہرے ہرے ریشمی بھٹوں اور ٹماٹروں کا بڑے غور سے معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ دن ڈھلنے سے کچھ دیر پہلے جب مویشی اپنے اپنے باڑوں میں ہانک دیے جاتے ہیں تو ان کا دودھ دوہا جاتا ہے اس میں پانی ملایا جاتا ہے اور گوالنیں انھیں خچروں پہ لاد کر قصبہ پنج ناگ کی طرف روانہ ہو جاتی ہیں، جہاں سے ان کے بھائی بند دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد واپس آ رہے ہوتے ہیں۔ چاندنی راتوں میں عورتیں چرخے لے کر درختوں کے نیچے آنگن میں بیٹھ جاتی ہیں۔ گوالنیں نیلی چاندنی میں مل جل کر آنکھ مچولی کھیلتی ہیں، جھومر ڈالتی ہیں۔ اور آگ کے گرد بیٹھ کر ان پردیسیوں کی باتیں کرتی ہیں جو انھیں کبھی نہیں ملے۔ پھر ایکا ایکی کوئی بول اٹھتی ہے۔

"اڑیو! ساروکو نہ چھیڑو۔ نہیں تو فیروز ہمیں مارے گا۔"

اور پھر سب کی سب کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہیں اور پرے بیٹھے ہوئے ان کے بوڑھے ماں باپ چھوٹی چھوٹی گھنڈیوں ایسے کنوارے قہقہوں پر انھیں آہستہ سے گردنیں گھما کر دیکھتے ہیں اور ان کی شادیوں کی فکر میں ڈوب جاتے ہیں۔ گاؤں کی برادری کا ہر لڑکا ان کی آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ علیا۔۔۔ نہیں۔۔۔ رحمو۔۔۔ نہیں۔۔۔ شامی۔۔۔ نہیں۔۔۔ فیروز۔۔۔ ہاں۔۔۔ اور اس کے بعد کہیں نہ کہیں ڈھولک دھمک اٹھتی ہے اور چمبہ گلی کے ہار پروئے جاتے ہیں اور گڑ کی ڈھیلیاں جمع ہوتی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور دلہن بات بات پر شرمانے لگتی ہے اور اس کی سہیلیاں گاتے جاتی ہیں۔

جھوے دیے لاڑیے نی   چٹ ہور کتے۔ اڑیے ہور کتے

اور یہ گیت رات رات بھر جاری رہتے ہیں ان گیتوں کے سینے میں ہر گوالن کے دل کی

آواز چھپی ہوتی ہے۔ ہر لاڑی، ہر دلہن کی پکار دفن ہوتی ہے۔ چھبہ گلی کی ہر گوالن جنوں کی رانی ہے اور چھبے کی ملکہ ہے لیکن اگر اس کا دل کہیں اور ہے اور جسم کہیں اور، تو وہ آک کا پودا ہے۔ جس کا دودھ دیکھنے میں خالص دودھ سے زیادہ گاڑھا ہوتا ہے لیکن چکھنے میں نیم سے زیادہ کڑوا۔ پہاڑی راتیں خالص دودھ سے زیادہ مہکیلی اور زیادہ صحت مند ہوتی ہیں۔ یہ گرانڈ ٹرنک روڈ سے زیادہ لمبی اور اطالوی صوفوں سے زیادہ آرام دہ ہوتی ہیں۔ انھیں بسر کرنے کے لیے صرف ایک کمبل چاہیئے۔ موٹا، کھردرا اور گرم کمبل۔ کسی ایسپرین، کسی خواب آور ٹکیہ، کسی میٹرو ہوٹل، کسی پلازا سینما اور کسی وکٹورین پلنگ کی ضرورت نہیں۔ بس آدمی کمبل اوڑھ کر بجھی بجھی د آگ کے پاس درخت تلے لیٹ جائے اور صبح یوں تازہ دم اٹھے گویا دنیا میں اس کا پہلا دن شروع ہو رہا ہو۔ گرمیوں میں پہاڑوں پر ایک رات بسر کرنا ایسے ہی ہے جیسے سردیوں میں ضلع جھنگ کے کسی کھیت میں بیٹھ کر سنہری دھوپ میں گنے چوسنا۔ لیکن یہ گنے دیسی ہونے چاہئیں اور راتیں کھلے میدانوں میں بسر کرنی چاہئیں۔ صبح دم جب تبّت کی پہاڑیوں پر سورج طلوع ہو ہے۔ اور اس کا سونا پگھل پگھل کر دودھیا برف پر بہنے لگتا ہے تو باؤلی کے ٹھنڈے پانی میں آدھی ڈوبی ہوئی ترناری کی بیل پر شبنمی پھول چمک اٹھتے ہیں اور چیڑھ کے جنگلوں میں روشنی کے آڑے ترچھے ستون جگمگانے لگتے ہیں۔

لیکن چھبہ گلی میں ابھی سورج نہیں نکلا۔

ابھی صرف پو پھٹی ہے اور گاؤں میں کسی مرغ نے پہلی اذان دی ہے جس کے جواب میں قصبے کی جانب سے ایک اور کمزور مرغ کی آواز سنائی دی ہے۔ کوئی بھینس ڈکرائی ہے اور ساتھ ہی کہیں سے چکی کی گھمر گھمر سنائی دینے لگی ہے۔ یہ آواز کسی بند کوٹھری سے آرہی ہے اور پچھلے پہر کے سناٹے میں یوں لگ رہا ہے جیسے دور کہیں سرنگ میں سے ریل گزر رہی آسمان پر نیلے ستاروں کی رنگت اڑنے لگی ہے اور سحر کے بڑھتے پھیلتے نور میں گاؤں کے لوگ آہستہ آہستہ بیدار ہو رہے ہیں۔ ایک مکان کے پتھریلے آنگن میں خوبانی کے ٹھگنے لیکن گھنے درخت تلے ادھیڑ عمر کا آدمی قدرے جھک کر تنے کے گرد لپٹا ہوا رسہ کھول رہا ہے۔ رسہ کھول کر اس نے کندھے پر رکھ لیا ہے اور جیسے خواب میں صحن عبور کر کے وہ پھوس کے چھپر کھٹ تلے ایک چارپا

پاس جاکر رک گیا ہے۔

"ریشم!... رشمی!.... اٹھو بیٹی دن چڑھ آیا ہے۔"

چارپائی پر سیاہ رنگ کے موٹے کمبل میں کچھ حرکت ہوئی۔ "ہوں" کی نیند بھری آواز سنائی ی اور پھر پہلے ایسی خاموشی چھا گئی۔

"اٹھو بیٹا... بینا بھوکی ہے۔"

اتنا کہہ کر بوڑھا مکان کے عقب میں گھوم گیا جہاں سے بھینسوں کے ڈکرانے اور بکری کے یانے کی مسلسل آوازیں آرہی تھیں۔ ایک عورت کوٹھری کا پٹ کھول کر باہر نکلی، اس کا قد پھوٹا اور بدن بھاری تھا۔ وہ سیاہ قمیض اور سیاہ شلوار میں تھی اور سر اور پاؤں سے ننگی تھی۔ ر کے اعتبار سے وہ پینتیس چالیس کے قریب تھی، اس نے کھڑے کھڑے پورا منہ کھول کر جمائی ، اور دودھ کے خالی برتن اٹھا کر وہیں سے بولی۔

"ریشم!۔ اری ریشم!۔ اب اٹھ بھی چکو۔"

کمبل میں ایک بار پھر کھسر پھسر ہوئی۔ چاندی کے کڑے ایک دوسرے سے بج کر کھنکھنائے ور ریشم نے کمبل پرے پھینک کر لیٹے لیٹے ایک لمبی انگڑائی لی اور جھمک کر اٹھ بیٹھی منہ پر دونوں ھ پھیر کر اس نے سرہانے پر پڑا ہوا کالا دوپٹہ سر پر اوڑھا اور نیند میں ڈوبے بے ربط سے قدم ٹھاتی صحن میں آگئی۔ مرغیوں کے ڈربے کے پاس گئی۔ دروازہ کھول کر انھیں باہر نکالا۔ رات کے رکھے ہوئے آٹے کی گولیاں بنا کر انھیں ڈالیں۔ باڑے میں جا کر اپنی بکری کے آگے مکئی کے سرسبز پودے ڈالے۔ بکری ریشم کو دیکھ کر اور شدت سے مے مے کرنے لگی۔ جب چارہ دیکھا تو اپنے کان جھاڑتی خاموش ہو گئی اور تھوتھنی ہلا کر مکئی کے لمبے لمبے تازہ پتے کھانے لگی۔ اس کے پاس ہی ریشم کا باپ دودھ دوہ رہا تھا۔ ریشم کو بکری کے آگے پولے ڈالتے دیکھ کر بولا۔

"اسے بھوکے مت دینا۔"

ریشم نے جمائی لیتے ہوئے نیند بھری آواز میں کہا۔ "وہ کھاتی ہی نہیں۔"

اس کے بعد وہ صحن میں آگئی، جہاں اس کی ماں چولھے کے پاس چوکی پر بیٹھی چکی کے پاٹ صاف کر رہی تھی۔ پاس ہی چنگیر میں مکئی کی چھوٹی سی ڈھیری لگی تھی۔ آنگن والے خوبانی کے پیڑ

میں چڑیاں جاگ اٹھی تھیں اور گھنیری شاخوں میں اچھلتی کودتی چہچہا رہی تھیں۔ آس پا
مکانوں میں کہیں کوئی بکری یا بھیڑ ممیا رہی تھی اور کہیں بھینس ڈکرا رہی تھی، مرغے لگاتار با
رہے تھے اور قصبہ پنج ناگ کے مرغوں سے اذانوں کا تبادلہ کر رہے تھے۔ ریشم نے مٹی کے
کوزے میں مٹکے سے ٹھنڈا پانی بھرا اور اسے ٹینگ اور آلوچے کے پودوں پر ڈالنے
آسمان پر صبح کی تازہ تازہ ہلکی نیلی روشنی نمودار ہو رہی تھی اور تارے ایک ایک کرکے
جا رہے تھے۔ ریشم آلوچے کی جڑوں کو پانی دے رہی تھی اور وہ کچھ جھکی ہوئی تھی اور اس
بالوں کی ایک لٹ پھسل کر نیچے جھول رہی تھی اور ریشم نے سیاہ قمیص اور سیاہ شلوار پ
رکھی تھی۔ اور پھوٹتی سحر کے نیم اندھیرے نیم اجالے میں وہ خواب کی وادیوں کی کوئی شہزادی
ہو رہی تھی جو چشمے پر جھکی کسی پیاسے شہزادے کو پانی پلا رہی ہو۔ آلوچے اور ٹینگ
شہزادوں کو پانی پلا کر ریشم نے وہیں پتھر کی سل پر بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور خوبانی کے
نیچے بچھی ہوئی صف پر نماز پڑھی اور باڑے میں آ گئی۔ اس کی ماں نے آنگن میں چکی
گھمر گھمر شروع کر دی تھی۔ اور اس کا باپ لکڑی کی باڑھ کے پاس بیٹھا دودھ بھر
چھوٹے ولٹوہوں میں پانی ڈال رہا تھا۔ ریشم نے خچر پر کمبل ڈال کر اور انھیں اچھی طرح
سے کستے ہوئے کہا۔

"باپو! تم روز ایسا کرتے ہو، کیا تمہیں گناہ نہیں ہوتا۔؟"

اس کا باپ بوڑھوں ایسے لہجے میں کھی کھی کرتا ہنس پڑا۔ "اری پگلی کسی کو پانی پلا
کیسے ہوا؟ میں تو دودھ کو پانی پلاتا ہوں۔ دیکھتی نہیں اسے کتنی پیاس لگ رہی ہے۔ ہونہہ

"ہاں پانی پلاتا ہوں،" ریشم بڑبڑانے لگی۔

بوڑھے نے دونوں ولٹوہوں میں چھ سیر کے قریب باؤلی کا نیم گرم پانی ملا کر ان کے منہ گھ
کے ڈاٹوں سے بند کیے اور انھیں خچر پر لاد دیا۔

"لے اب پھرتی سے جا اور اسی طرح واپس آ، اور دینو سے کہنا، شب برات کو جو د
گیا تھا اس کے پیسے بھی دیدے۔ لے اب جلدی چل بھور ہونے کو ہے۔"

ریشم نے پتلی سی لمبی چھمک ہاتھ میں لی اور بڑی پھرتی سے خچر پر بیٹھ گئی، خچر نے جگالی

قدم قدم چھوٹے چھوٹے پتھروں پر سے گزرتی اس پگڈنڈی پر ہولی جو سیب کے باغ میں سے
پنج ناگ جانے والی سڑک سے جا ملتی تھی۔

سورج نکلنے سے پہلے کی سحر گدانہ نیلگوں چمک میں سیب کا باغ رات کے پُراسرار سایوں
بچھڑ رہا تھا۔ درختوں پر طوطے چلا رہے تھے اور کچے سیبوں کو کتر کتر کر خراب کر رہے تھے۔
سب معمول ٹھنڈی اور گھاس پتوں اور قسم قسم کے پھولوں کی مہک سے لدی ہوئی تھی، چشمے
ی چھوٹی سی ندی کی شکل میں درختوں کے درمیان سے بل کھاتا گزر رہا تھا اور گرل گرل کی
باز دھیمی لے میں باؤلی میں گر رہا تھا۔ جہاں سے ایک پتلا دبلا نالہ نیچے وادیوں اور چراگاہوں
رف نکل گیا تھا۔ باؤلی میں پانی کی سیاہ چادر میں صبح کی روشنی جھلک رہی تھی اور اس کے
ے کی سلیں خشک تھیں۔ ریشم نے وہاں رک کر خچر کو پانی پلایا اور اس سڑک پر آ گئی۔ جو
رے کے دو رویہ درختوں کے درمیان سے گزرتی بڑے نالے کے پل اور وہاں سے قصبہ
ناگ کو چلی گئی تھی۔ سڑک کنارے گھاس میں آدھے چھپے زرد زرد پھول سحر کی خوشگوار
میں ہولے ہولے ڈول رہے تھے اور درختوں پر چڑیوں، طوطوں نے صبح کے راگ الاپنا
رع کر دیئے تھے۔

ریشم جس وقت سڑک کا آخری موڑ گھوم کر قصبے کے بڑے بازار میں داخل ہوئی تو جموں
یر کی برف پوش چوٹیوں پر سورج کا گرم گرم، گہرا سرخ تھال نمودار ہوا اور اس کی سنہری روشنی
قصبے کے بازار اور وادیوں اور ہرے بھرے میدانوں میں سونے کا غبار سا اڑنے لگا۔ اوپر چیڑھ
جنگلوں میں پگھلے ہوئے زرد سونے کی آبشاریں سی بہہ نکلیں اور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر تیرتے
لے بادلوں کے ٹکڑے زرد، سنہری اور نارنگی رنگت اختیار کر گئے۔

قصبے کے بازاروں میں دکانیں کھل چکی تھیں اور کاروبار شروع تھا۔ ریشم کو بازار میں سے
ر پر سوار گزرتے دیکھ کر روز کی طرح جاکھو پنساری نے آواز دے کر ریشم کے باپ کی خیر خیریت
پھی۔ جھنڈو موچی نے اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور دینو حلوائی نے شب برات کے
یسے چکانے پر ٹال مٹول کیا۔

"دینو بابا آج پیسے ضرور دے دو۔ آج میرے باپو کو بڑی ضرورت ہے۔ یہ لو! دے

دو گے نا؟"

دینو بابا نے ہونٹ لٹکا کر گردن کھجلائی۔

"اری بیٹی! کام تو مندے میں جا رہا ہے۔ کل سارا دودھ پھٹ گیا۔ رات جاگ دیر لگائی اور صبح دہی الگ تھا اور پانی الگ، اوپر سے تمھاری ماسی بیمار ہو گئی ہے۔ میری تو جان میں ہے۔ باپو سے کہنا۔ اگلی شبِ برات تک صبر کر لے، اللہ نے چاہا تو پائی پائی ادا کر د

قصبے کی دو تین دکانوں پہ دودھ بیچ کر ریشم واپس ہوئی۔

اب دن پوری طرح نکل آیا تھا اور سپید دھوپ بدن کو چبھنے لگی تھی۔ آبادی سے با ریشم نے خچر کی پیٹھ پر دو تین جھپکیں آہستہ سے لگائیں اور وہ ذرا قدم اٹھا کر چلنے لگی، پتھر غیر ہموار سڑک پر سفیدے کے درختوں کے لمبے سائے پھیلے ہوئے تھے اور فضا میں کہیں شہ مکھیوں کی بھنبھناہٹ تھی اور کہیں طوطے شور مچا رہے تھے، راستے میں شہر سے آنے و کچھ لوگ خچروں پر سوار ریشم کے پاس سے گزر گئے۔ ان کا سامان اور بچے ٹٹوؤں پر لدے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ایک خچر پر بیٹھی ہوئی دبلی پتلی سی زرد چہرے والی عزارہ پوش نے بڑے غور سے ریشم کو دیکھا اور اگلے خچر پر بیٹھے ہوئے لمبی گردن والے نوجوان سے لگی۔

"یہاں عورتیں کیا کھاتی ہیں؟"

"درختوں کے پتّے۔"

"او گڈ! میں بھی یہی کھاؤں گی۔ پھر میری صحت کتنی اچھی ہو جائے گی۔"

"ہو جائے گی۔ مگر اس خچر نے تو میرے کولھے توڑ دیے ہیں۔ سالا چلتا ہی نہیں۔"

خچر نے گردن گھما کر اپنے سوار کے مریل چہرے کو دیکھا۔ اور تھوتھنی جھاڑ کر پھر اسی ط چلنے لگا۔

آدھ پون گھنٹہ میں ریشم چمبہ گلی، اپنے گاؤں کے موڑ پر پہنچ گئی۔ سیب کے باغ ہوئے وہ خچر پر سے اتر پڑی اور اسے پانی پلانے کے لیے باؤلی پر آ گئی۔ بادام کے بڑے کی چھاؤں میں پہنچ کر وہ ٹھٹھک سی گئی۔ باؤلی پر ایک اور خچر گردن جھکائے پانی پی رہا تھ

صرف ایک بستر لدا تھا اور وہاں کوئی آدمی نہ تھا۔ ریشم قدم قدم چلتی اپنے خچر کو لے کر باؤلی تک آئی اور متلاشی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ خچر کا مالک کہیں قریب ہی ہو گا۔ مگر وہ بستر سمیت خچر کو اکیلا چھوڑ کر کہاں چلا گیا؟ اس نے اپنے خچر کی باگ ڈھیلی کر کے اسے پانی پلایا اور دوسرے خچر کے پاس جا کر اس کی گردن پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ معًا کوئی پیچھے سے بولا۔

"یہ خچر چوری کا نہیں گوالن!"

ریشم نے چونک کر پہلے خچر کو اور پھر اپنے عقب میں دیکھا۔ یہ جملہ خچر کی گردن پر ہاتھ لگتے ہی بلند ہوا تھا اور اسے یوں لگا جیسے خچر بولا ہو۔ لیکن اپنے پیچھے ایک نوجوان کو دیکھ کر وہ جلدی سے پرے ہٹ گئی۔ اور اپنی خچر کی گردن پر ہاتھ پھیرنے لگی جو پانی پی رہی تھی، اجنبی نوجوان کا رنگ سپید، قد چھوٹا اور جسم چوڑا تھا۔ اور وہ آنکھوں پر عینک چڑھائے، ایک ٹانگ بڑے سے پتھر پر رکھے سگریٹ پی رہا تھا اور عینک میں سے ریشم کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔

"تم نے سمجھا ہو گا، چلو صبح صبح خچر ہاتھ لگا۔ یہاں کے لوگوں میں چوری کا مرض عام ہے۔"

ریشم کے گال شرم اور غصے میں لال ہو گئے، اسے اپنی بڑی بے عزتی محسوس ہوئی اس نے تیزی سے کہا۔

"شہری بابو! آدمی دیکھ کر بات کیا کرو۔ چور ہوں گے تمھارے کوئی اور۔ ہم محنت کرتے ہیں اور کھاتے ہیں۔"

شہری بابو سگریٹ ایک طرف پھینک کر باؤلی کی سل پر آ کر بیٹھ گیا اور منہ ہاتھ دھونے لگا۔

"میں نے کب کہا کہ تم چور ہو۔ میں نے تو کہا ہے کہ یہاں چوری کا مرض عام ہے۔"

ریشم کچھ نہ بولی۔ وہ اپنی خچر کو پانی پلا کر خود منہ ہاتھ دھونے بیٹھ گئی، نوجوان باؤلی سے ہاتھ باہر نکالتے ہوئے بولا۔ "پانی گندہ نہ کرو لڑکی! پہلے مجھے پی لینے دو۔"

ریشم سوچنے لگی کہ یہ کیسا آدمی ہے جو ہر بات میں لڑائی جھگڑا ڈھونڈتا ہے۔ "مگر پانی تو تمھاری طرف سے آ رہا ہے۔"

"میری طرف سے آ رہا ہو یا خدا کی طرف سے آ رہا ہو، تم ہاتھ باہر نکالو۔"

"نہیں نکالتی"، ریشم کو بھی غصہ آ گیا۔

"نہیں نکالتیں؟"، نوجوان نے گرج کر کہا۔

ریشم کا خون گرم ہو گیا۔ اس نے دانت پیس کر کہا "نہیں"

نوجوان نے بڑے ٹھنڈے اور دھیمے لہجے میں کہا "تو نہ نکالو، ہم نکال لیتے ہیں۔"

اس نے ہاتھ باؤلی کے پانی سے نکال کر پتلون سے پونچھے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور خچر پر اپنا بستر درست کرنے لگا۔ ریشم کو اپنے جی میں بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ اس پر جیسے کسی نے اچانک ٹھنڈا پانی ڈال دیا۔ یہ کیسا آدمی ہے؟ ابھی لڑنے پہ تیار تھا اور ابھی یوں خاموش ہے گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ ریشم کو یوں لگا جیسے وہ نوجوان ہمیشہ پیاسا رہے گا اور اب کبھی پانی نہیں پیئے گا۔ نہ جانے وہ بیچارہ کہاں سے چل کر آ رہا ہے اور اسے کہاں جانا ہے۔ کیا خبر وہ رات بھر سے پیاسا ہو۔ ریشم کو اس سے ایک دم ہمدردی ہو گئی لیکن وہ اس کی منت سماجت نہ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ کھینچ کر صرف اتنا کہا۔

"میں نہیں پیتی۔ پہلے تم ہی پی لو۔"

نوجوان کچھ نہ بولا اور خچر پر بستر کستا رہا۔ ریشم نے پھر کہا "اب پانی کیوں نہیں پیتے؟"

نوجوان بدستور خاموش رہا۔ ریشم کو الجھن سی ہونے لگی "اب پی لو نا"

"نہیں پیتا"، نوجوان نے گرج کر کہا، ریشم کانپ گئی اور خچر کے ساتھ لگ گئی، نوجوان نے غصے میں ریشم کو دیکھا اور اپنی خچر کی باگ تھام کر سیب کے باغ میں سے نکل کر پنج ناگ جانے والی سڑک پر چلنے لگا۔ ریشم ایک لمحہ کے لیے مبہوت سی ہو کر رہ گئی۔ پھر وہ اس آدمی کی عقل پر ہنس پڑی۔

"عجیب آدمی ہے"

باؤلی پہ پانی پی کر اس نے خچر ساتھ لیا اور گھر کی جانب چل دی۔

ریشم کی ماں آنگن میں بیٹھی دودھ بلو رہی تھی۔

اس کے پاس ہی مرغیاں دانہ دنکا چن رہی تھیں اور ان کے درمیان لال کلغی والا مرغ گردن اٹھائے کھڑا تھا۔ بکری خوبانی کے درخت تلے گیلی زمین پر بیٹھی جگالی کرتے ہوئے اونگھ رہی تھی۔ بھنگ کے نازک شگوفوں کے گرد سیاہ رنگ کا بھنورا چکر لگا رہا تھا۔ ریشم کو آتا دیکھ کر مرغیاں ادھر ادھر ہٹ گئیں۔ اور خچر کے کھروں کی آواز پر بکری نے آنکھیں کھول کر ریشم کو دیکھا اور آہستہ سے ممیا کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ریشم نے باڑے میں جا کر خچر کو باندھا اور اپنی ماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ماں نے کہا۔

"روٹی تندوری میں رکھی ہے۔ نکال کر کھا لے۔ ساگ تو تیری بکری کھا گئی ہے۔ صندوق میں سے گڑ لے لینا۔"

ریشم نے غصے سے بکری کی طرف دیکھا۔

"ساگ کے بغیر اسے روٹی ہضم نہیں ہوتی۔ اس عید پر اسے ذبح ہی کر لوں گی۔"

بکری نے ریشم کی بات سن لی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر عجیب نظروں سے ریشم کو دیکھا۔ ان میں محبت اور رحم کی التجا تھی۔ اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

ریشم نے مکی کی روٹی پر گڑ اور تھوڑا سا مکھن رکھ کر کھانا شروع کر دیا۔ وہ ایک لقمہ خود کھاتی تھی اور دوسرا مرغیوں کے آگے ڈال دیتی تھی۔ دوسری طرف سے اس کا باپ آنگن میں داخل ہوا اور ریشم کو بیٹھے دیکھ کر بولا "دینو نے پیسے دیے؟"

"نہیں بابو! وہ کہتا تھا، اگلی شب برات کو دوں گا۔"

"بڑا چالاک آدمی ہے۔"

"اور بابو کنجوس بھی ہے۔ اس کی پگڑی اتنی میلی ہوگئی ہے کہ اس میں جوئیں رہنے لگے ہیں مگر وہ نئی نہیں خریدتا۔"

ریشم کا باپ ہنسنے لگا اور اپنی بیوی کے پاس چوکی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں مونج تھی۔ پانی کا کوزہ پاس رکھ کر اس نے اس میں مونج بھگوئی اور رسی بانٹنے لگا۔

"اچھا اگر اس نے اس شب برات پر بھی پیسے نہ دیے تو پھر اس کا دودھ بند ہی کرنا پڑے گا۔"

اس کی بیوی مٹکے میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے بولی "لاج کی ماں ابھی ابھی پھر آئی تھی۔"

بوڑھے نے پیشانی پر شکنیں ڈالتے ہوئے کہا "تو کیا ہوا۔ پھر بیس روپوں ہی کی بات ہے آج نہیں کل، آخر دینے ہی ہیں، دے دیں گے۔"

"میں تو کئی دن سے کہہ رہی ہوں۔ تم کٹی بھینس بیچ ڈالو، اب تو وہ دودھ بھی چھوڑ رہی ہے۔"

ریشم کے باپ نے ترشی سے کہا "ریشمی کی ماں! پھر مت کہنا۔ بھینس میں کبھی نہ بیچوں گا چاہے میرا کمبل بک جائے۔ ذرا سی ماندہ ہے۔ دو دن سے تیل پلا رہا ہوں۔ کل ہی ٹھیک ہو جائے گی۔"

ریشم نے روٹی کھا کر پانی پیا۔ چنگیر اور گلاس چولھے کے پاس رکھا اور ذرا پرے درخت تلے چرخہ لے کر بیٹھ گئی۔ چرخے کی گھوں گھوں اور تکلے کے ہلکے ہلکے شور میں اس نے اپنے عقب میں کسی کی آواز سنی۔

"یہ خچر چوری کا نہیں گوالن"

اس نے بے خیالی میں گردن گھما کر پیچھے دیکھا، بکری آنکھیں بند کیے تھی۔ ریشم کے ہونٹوں پر اپنے آپ تبسم کی پھلجھڑی سی چمکی اور وہ شرما کر دل ہی دل میں ہنس پڑی۔

"کیسا عجیب آدمی تھا، پہلے کہا میں پانی پیوں گا اور جب میں نے کہا کہ پی لو، تو کہتے [illegible] نہیں پیتا۔"

ریشم کے ہاتھ چرخے کی ہتھی گھماتے گھماتے رک سے گئے اور اس نے دیکھا، ایک شہری بابو نکھوں پر کالی عینک چڑھائے خچر پر لیسٹر کس رہا ہے اور پھر اس کی باگ تھامے پنج ناگ الے والی سڑک پر سفیدے کے درختوں میں گزر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا خیال لاج ماں کی طرف چلا گیا۔ جس سے اس کے باپو نے شہر سے نئے نعل منگوانے کے لیے بیس روپے دھار لیے تھے۔ اور جو دن میں کئی بار اپنے روپوں کا تقاضا کرتی تھی۔ مگر اس کی بیٹی لاج تو اس سہیلی ہے۔ وہ تو ایسی نہیں ہے۔ ریشم نے سوچا کہ وہ آج ہی لاج سے کہے گی کہ وہ اپنی ماں وتسلی دے اور کہے کہ اس کا قرضہ بہت جلد چکا دیا جائے گا۔

جب وہ سوت کی دو تین تکلیاں نکال چکی تو اس کے باپ نے آواز دی۔

"ریشمی! ڈھور جنگل گئے ہیں بیٹا۔"

"اچھا بابو" ریشم نے کہا اور چرخہ چھوڑ کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے پوٹلی میں مکی کی روٹی اور گڑ رکھا۔ کمر کے گرد رسی لپیٹی اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں اور پتھروں پر سے اچھلتی کودتی چراگا میں پہنچ گئی۔ جہاں ان کی بھینسیں ادھر اُدھر چر رہی تھیں۔ وہاں اس کی اور سہیلیاں بھی مل گئیں جو اخروٹ کے ایک گنجان درخت تلے آگ جلائے بھٹے بھون بھون کر کھا رہی تھیں۔ سارو نے ریشم کو آتے دیکھ کر کہا۔

"ایلو ریشی بھی آگئی .... ریشی! بھٹے لائی ہو؟"

سب لڑکیوں نے گھوم کر ٹیلے کی جانب دیکھا۔ ریشم پھمک والا ہاتھ یونہی ہری بھری جھاڑیوں میں چلاتی چلی آ رہی تھی۔ سب نے پوچھا "ریشی! بھٹے کیوں نہیں لائی؟"

ریشم نے پاس آ کر گھاس پر گرتے ہوئے کہا۔

"اری ہمارے بھٹے تو ابھی سارے کچے ہیں .... میں گڑ لائی ہوں۔"

"ہائے میں مرگئی۔ گڑ؟ ذرا دکھانا تو" لاج بولی۔

ریشم نے پوٹلی کھول کر گڑ نکالا۔ تھوڑا تھوڑا سب نے بانٹ لیا۔ چمبہ کلی کی گوالنیں گڑ کے ساتھ بھٹے اور بھٹوں کے ساتھ گڑ کھاتے ہوئے آپس میں ہنسی مذاق کرنے لگیں اور اخروٹ کا اونگھتا ہوا بوڑھا درخت ان کے نقرئی قہقہوں پر چونک اٹھا۔

ریشم سارو کی جھولی سے ایک بھٹہ چھین کر لاج کے پاس جا بیٹھی اور اپنی دُم کٹی بھینس کا ذکر کرتے ہوئے بولی "لاج تمھاری ماں آج پھر آئی تھی"۔

"اچھا.... سویرے آئی ہوگی"۔

"ہاں لاج! تم اسے میری طرف سے تسلی دو کہ ہم پیسے اپنے آپ دے دیں گے اور جلدی دے دیں گے"۔

"ریشم! تم نہیں جانتیں، میری ماں بڑی سخت ہے۔ میں نے اگر ایک لفظ بھی کہا تو فوراً سمجھ جائے گی اور میرے گلے پڑ جائے گی، لیکن تم اس کے آنے کا بُرا کیوں مانتی ہو؟ آنے دو اگر آتی ہے تو"۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن..."

"لیکن کو چھوڑ دو، آؤ نیلی سے بھٹے چھینیں"۔

اور وہ دونوں سازش کر کے دبے دبے پاؤں نیلی کی طرف بڑھنے لگیں جو اپنے خیال میں محو پتھر پر بیٹھی ٹانگیں لٹکائے بھٹے کھا رہی تھی۔ ان دونوں کا جھپٹنا تھا کہ نیلی نے شور مچانا شروع کر دیا اور یہ دونوں بھاگ اٹھیں۔ اور نیلی ان کے پیچھے بھاگنے لگی۔

اسی بھاگ دوڑ اور ہنسی مذاق کے شور اور سہیلیوں کی میٹھی میٹھی سرگوشیوں اور چہکتے قہقہوں میں دوپہر ڈھل گئی۔ شام ہونے سے پہلے ریشم نے حسبِ معمول دودھ کے ولٹوہے خچر پر لادے اور قصبہ پنج ناگ کی طرف چل پڑی۔ واپسی پر وہ بڑے نالے کے پُل پر سے گزر رہی تھی کہ اسے وہی نوجوان سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس نے پہلے روز کی طرح سفید کپڑے پہن رکھے تھے لیکن آنکھوں پر عینک نہیں تھی۔ ریشم کا دل اپنے آپ ہی تیزی سے دھڑکنے لگا اور وہ آنکھ بچا کر گزرنے ہی والی تھی، اس نوجوان نے قریب آ کر خچر کی لگام تھام لی۔

"گوالن! اس روز میں پوچھ نہیں سکا، تمھاری خچر کا نام کیا ہے؟"

ریشم کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا اسے کبھی کسی نوجوان نے اس بے باکی سے مخاطب نہ کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ اس شہری نوجوان سے کس طرح پیش آئے۔ آخر اس بڑی ہمت سے کہا۔

"تم پوچھنے والے کون ہو؟"

"میں وحید ہوں اور قصبے میں چائے کمپنی کا مالک ہوں اور وہی ہوں جو کل تمھیں باؤلی پر ملا تھا اور جسے تم نے پانی پلانے سے انکار کر دیا تھا اور جو کل سے پیاسا ہے۔ پرسوں سے پیاسا ہے جنم جنم سے پیاسا ہے"۔

ریشم کو صرف اسی قدر سمجھ آئی کہ اس نے کل سے پانی نہیں پیا۔

"مگر میں نے تو کہہ دیا تھا، پہلے تم ہی پانی پی لو"۔

"تم نے کب کہا تھا شام کے وقت کیوں جھوٹ بولتی ہو؟ تم کہتیں اور میں پیتا نہ؟ تم نے تو کہا تھا، چلے جاؤ یہاں پانی نہیں ملے گا۔ یہ یزید کا گاؤں ہے، یہاں کوفی رہتے ہیں"۔

ریشم حیران رہ گئی کہ شہری لوگ کتنا جھوٹ بولتے ہیں۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"تم لوگ بڑے جھوٹے ہوتے ہو۔ لگام چھوڑ دو، مجھے گھر پہنچنا ہے اور سانجھ ہو رہی ہے"۔

"پہلے خچر کا نام بتاؤ"۔

ریشم تنگ آ کر بولی... "مینا.... اس کا نام مینا ہے۔ اور کچھ"۔

نوجوان نے آنکھیں سکیڑ کر ریشم کو دیکھا اور بولا "بڑا پیارا نام ہے، تم اسے فلم ایکٹریس کیوں نہیں بنا دیتیں؟"

"کیا؟"

"میرا مطلب ہے، تمھارا نام کیا ہے؟"

ریشم کو فوراً محسوس ہوا کہ اس نے پہلے کچھ اور کہا تھا اور اب کچھ اور کہہ رہا ہے۔ مگر وہ ان باتوں میں اپنا وقت ضائع نہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ لگام کھینچتے ہوئے بولی۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میرا راستہ چھوڑ دو، ورنہ میں شور مچا دوں گی"۔

نوجوان نے بڑے آرام سے گردن ایک طرف جھکا کر کہا "میم صاحب! جتنا جی چاہے شور مچائیں، یہاں کوئی نہیں سنے گا اور جب تک اپنا نام نہ بتاؤ گی چھٹکارا مشکل ہے"۔

ریشم کو ایکا ایکی شام کی بڑھتی پھیلتی سنسان تاریکی کا احساس ہوا اور وہ ڈر گئی۔ اسے یوں لگا کہ اگر اس نے اپنا نام نہ بتایا تو وہ نوجوان اس کا سر کاٹ کر نیچے نالے میں پھینک دیگا

وہ خود بخود بول اٹھی۔

"ریشی ... میرا نام ریشم ہے۔"

"ریشم"، نوجوان نے چونک کر کہا۔ کتنا پیارا ریشمی نام ہے۔ جی چاہتا ہے اسے مفلر کی طرح گلے کے گرد لپیٹ لوں۔ اچھا تمھاری ماں کا نام کیا ہے؟"

ریشم بڑی زچ ہوئی اور اس کا جی چاہا کہ وہ بے اختیار رو دے۔ اس نے بڑی عاجزی سے کہا "خدا کے لیے مجھے جانے دو، نہیں تو میری ماں مجھے مار ڈالے گی۔"

نوجوان نے ایک دم خچر کی لگام جھٹک دی۔ "تو جاؤ تمھیں روکتا کون ہے؟"

اور پھر بڑے اطمینان سے سیٹی بجاتا وہاں سے گزر گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، جیسے ریشم اسے کبھی نہیں ملی۔ جیسے اس نے راستے میں کسی گوالن، کسی چرواہن سے بات نہیں کی۔ جیسے ریشم کچھ بھی نہ ہو، پتھر ہو، نالے کا جنگلہ ہو۔ جنگلے پر پڑا ہوا لٹھا ہو۔ ریشم نے پہلے روز کی طرح اسے تعجب سے دیکھا اور پھر اسے گھر کا خیال آگیا اور جلدی جلدی خچر ہانکتی نالہ عبور کرنے لگی۔ باؤلی پر پہنچتے پہنچتے اسے اندھیرا ہوگیا اور جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو آنگن کے طاق میں دیا ٹمٹما رہا تھا اور اس کی ماں روٹیاں پکا رہی تھی۔ اس کا باپ چھپر کھٹ تلے چارپائی پر بیٹھا گڑگڑی پی رہا تھا۔ اور ڈربے میں بند مرغیاں کٹکٹا رہی تھیں۔ اس کی ماں نے صافی سے روٹی کی راکھ جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"راستے میں کہیں رک گئی تھی؟"

"نہیں تو ... اوپر بستی میں ہی دیر لگ گئی تھی۔"

خالی ولٹوہے آنگن میں ایک طرف ڈال کر ریشم نے خچر کو باڑے میں جا کر باندھا اور روٹی کھا کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ کتنی دیر وہ اس عجیب سے اجنبی نوجوان کے متعلق سوچتی رہی۔ وہ کتنا عجیب ہے، آج اسے کتنی بے شرمی سے گھور رہا تھا۔ کل وہ عینک چڑھائے ہوئے تھا اور آج اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ریشم نے دو چمکیلی اور شفاف آنکھوں کو اپنے بالکل اوپر جھکے محسوس کیا۔ اسے بالکل خبر نہ ہوئی، کب اس کا باپو گڑگڑی اٹھا کر وہاں سے چل دیا اور کب اس کی ماں برتن وغیرہ دھو کر کوٹھری میں سونے چلی گئی۔ اس نے چارپائی پر لیٹے لیٹے گردن اٹھا کر صحن میں

جھانکا۔ شروع تاریخوں کا چاند خوبانی کے پیڑ میں سے جھانک رہا تھا اور آنگن میں اس کی کمزور روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ لکڑی کی باڑھ سے پرے آہستہ آہستہ اوپر اٹھتے ہوئے سرسبز ٹیلوں کا فراز کھلے نیلے آسمان کے پس منظر میں صاف دکھائی دے رہا تھا، دور کہیں کوئی پرندہ فضا میں اڑتے ہوئے رہ رہ کر چیخ رہا تھا۔ اوپر قصبے کی جانب سے کسی کتے کے بھونکنے کی دبی دبی آواز آرہی تھی۔ سادو کے گھر میں ان کی بیمار بچھیا تھوڑی تھوڑی دیر بعد بول رہی تھی۔ آسمان پر سنہری تارے جھلملا رہے تھے اور باڑھ کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے موتیے کے جھاڑوں میں سپید پھولوں کی ٹھنڈی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ریشم نے اپنا سر آہستہ سے میلے تکیے پر رکھ دیا، اسے اپنے قریب ہی کسی کی آواز سنائی دی۔

"ریشم! .... ریشم! کتنا ریشمی نام ہے۔"

ریشم کا خون ایک دم گرم ہوگیا اور اس کی پلکیں کسی انجانی مسرت سے کانپنے لگیں۔ اس سے پہلے کسی نے اس کے نام کی یوں تعریف نہ کی تھی۔ اس سے پہلے اسے کبھی اپنے نام کی نرمی اور خوبصورتی کا احساس نہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے کبھی وہ کچھ نہ ہوا تھا جو اب ہو رہا تھا۔ چاند کبھی خوبانی کی شاخوں میں سے اس طرح نہ جھانکا تھا۔ اور موتیے کی خوشبو کبھی اتنی میٹھی نہ تھی اور سرِ شام اس کی چارپائی تک نہ پہنچی تھی اور شاداب ٹیلوں کا فراز اتنا پُراسرار نہ تھا۔ اس سے پیشتر ریشم نے کبھی سر اٹھا کر وادیوں پر پھیلی ہوئی دھند اور آنگن میں چھٹکی ہوئی چاندنی اور آسمان پر بکھرے ہوئے سنہری تاروں کو نہ دیکھا تھا۔ آج وہ ہر شے میں ایک خاص قسم کی تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ جیسے اس نے رنگدار عینک لگالی ہو۔ اور زمین کی ہر چیز دیکھتے دیکھتے رنگین اور خوابناک ہوگئی ہو۔ وہ سوچنے لگی، کیا واقعی اس کا نام ریشمی ہے؟ خوبصورت ہے؟ لیکن اس کی ماں نے اسے کیوں نہیں بتایا؟ باپو نے اس کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ اس کی سہیلیوں نے اس کا نام لیتے ہوئے وہ نرمی، حسن، اور گداز پن کیوں نہیں محسوس کیا۔ جو پہلی بار سننے پر اس اجنبی نوجوان نے محسوس کیا تھا۔ کہیں وہ اجنبی اسے بنا تو نہیں رہا تھا، جھوٹ تو نہیں بول رہا تھا۔ وہ جھوٹ تو بہت بولتا ہے۔ کہہ رہا تھا۔ "تم نے پانی پینے ہی نہیں دیا۔" تو یہ کتنا بڑا جھوٹ تھا۔ جموں کی پہاڑیوں سے بھی بڑا۔ جموں کی پہاڑیوں کے ساتھ ہی اسے جموں ... اپنا وطن یاد آگیا تھا، جہاں اس نے جنم لیا تھا اور جس کی پتھریلی گلیوں اور

ہرے بھرے ٹیلوں اور وادیوں اور گھاٹیوں اور چشموں اور مرغزاروں میں کھیل کود کر اس نے اپنا کھلا آزاد اور صحت مند بچپن گزارا تھا۔ جہاں رہ گئی ہندو سہیلیاں اب بھی اسے یاد آتی تھیں اور جن کی یاد میں وہ کبھی کبھی سب کی نظریں بچا کر رو لیا کرتی تھی۔ خیال، ناخیال میں وہ چھبے کی وادی میں نکل گئی اور وہیں کہیں گھومتے گھامتے اسے نیند آ گئی اور وہ سو گئی۔

صبح قصبے کی طرف جاتے ہوئے وہ باؤلی پر سے گزری تو اس نے یوں ہی ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا، شاید وہ اجنبی پھر آیا ہو۔ پنج ناگ پہنچ کر بھی وہ بازاروں میں کچھ دیکھتی رہی۔ کچھ تلاش کرتی رہی۔ واپسی پر بڑے نالے پر سے گزرتے ہوئے اسے ایک بار پھر چمکیلی آنکھوں والے اجنبی کا خیال آ گیا مگر آج وہ کہیں نہ تھا۔ نہ باؤلی پر، نہ قصبے کی سڑکوں پر اور نہ بڑے نالے کے پُل پر۔ ریشم دل میں رنج کا ہلکا سا احساس لیے گھر میں داخل ہوئی اور کام دھندے میں لگ گئی۔

شام کو پھر دودھ لے کر نکلی تو دل میں یہ خیال لیے ہوئے کہ شاید وہ ضدی، جھوٹا اور عجیب سا نوجوان راہ میں کسی پتھر پر درخت کی اوٹ میں بیٹھا سگریٹ پی رہا ہو۔ لیکن صبح کی طرح اسے پھر ناامیدی ہوئی۔ سونے سے پہلے وہ سوچنے لگی کہ آخر اسے خواہ مخواہ فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی آئے نہ آئے، اسے ان باتوں سے کیا لینا۔ وہ اس نوجوان کو اپنے ذہن سے نکال کر سو گئی۔ اور خواب میں اس نے دیکھا کہ وہ دونوں نالے کے پُل پر کھڑے ہیں اور نوجوان اس کے خچر کی لگام پکڑ ا ایک طرف زبردستی کھینچے لیے جا رہا ہے اور وہ بری طرح سٹپٹا رہی ہے اور چیخ رہی ہے مگر وہاں اس کی فریاد کوئی نہیں سنتا۔ پھر اس نے دیکھا، وہ باؤلی کے پتھر پر بیٹھی ہے۔ اس کے دونوں پاؤں پنڈلیوں تک ٹھنڈے پانی میں ہیں۔ اس کے سر پر سرخ سیبوں سے لدی ہوئی ٹہنیاں جھکی ہوئی ہیں۔ اجنبی نوجوان اس کے پاس گھاس پہ بیٹھا ہے۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کے شگوفوں ہار ہے اور وہ محبت کی پیاسی نگاہوں سے ریشم کی طرف دیکھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔ گوالن! یہ پھول میں بڑی دور سے لایا ہوں۔ یہ غرناطہ کے شاہی باغات میں نیلے انگوروں کی بیلوں تلے رہے تھے۔ انھوں نے دجلہ اور فرات کے درمیانی نخلستانوں میں آنکھ کھولی ہے۔ انھیں وادیٔ کی خنک ہواؤں اور گلمرگ کی چراگاہوں میں گرنے والی شبنم نے پالا ہے۔ ان میں کنواریوں کے خواب اور دلہنوں کی سرگوشیاں ہیں اور ان کا رنگ بے داغ ہے اور خوشبو اَن چھوئی ہے۔

اور میں انھیں تمھارے قدموں پر چڑھاتا ہوں۔ گوالن! ریشم!... ریشی!... یہ پھول قبول کر، یہ آنسو قبول کر۔

ریشم کی آنکھ ایک دم کھل گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور گرم ہونٹ کپکپا رہے تھے اس نے چونک کر اپنے ارد گرد دیکھا۔ جنگلوں، وادیوں میں پہاڑی راتوں کی سنگین خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چاند ٹیلوں کی اوٹ میں جا چھپا تھا۔ اور تارے زیادہ شوخی سے جھلملانے لگے تھے۔ ریشم کی نیند اُچٹ چکی تھی۔ یہ اس نے کیسا خواب دیکھا تھا؟ یہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ اسے ایسے خواب کیوں آنے لگے ہیں؟ وہ سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ اس نے کئی بار اجنبی نوجوان کو گلاب کے شگوفوں کا ہار لیے اپنی طرف بڑھتے دیکھا اور اس کا سارا بدن کانپ گیا۔ اس کی زبان پر مسافر کا نام آتے آتے رہ گیا، کیا نام تھا؟ وہ دماغ پر زور ڈال کر یاد کرنے لگی۔ ہاں... وحید۔ کیسا عجیب نام ہے۔ ریشم نے ایسا نام پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ اس نے اپنا نام بھی پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ ریشم! ریشم۔ کتنا ریشمی نام ہے۔

وہ اپنے آپ شرما گئی اور دانتوں سے کمبل کا کنارا کاٹنے لگی۔

دو روز گزر گئے۔ اسے وہ اجنبی نوجوان کہیں دکھائی نہ دیا۔ ریشم سوچنے لگی کہیں وہ واپس نہ چلا گیا ہو۔ وہ یہ سوچ کر کچھ اداس سی ہو گئی۔ تیسرے دن سہ پہر کے بعد جب نچان کی بستیوں پر شام کے اودے سائے جھک آئے تھے۔ وہ قصبے سے واپس آتے ہوئے باؤلی پر سے گزری تو اسے مسافر ترناری کی بیلوں کے پاس سل پر بیٹھا نظر آیا۔ اس کی پتلون پنڈلیوں تک اوپر چڑھی ہوئی تھی۔ دونوں پاؤں پانی میں تھے اور جوتے پاس ہی پتھر پر پڑے تھے۔ ریشم کا دل دھک سے رہ گیا۔ خچر کے پاؤں جیسے خود بخود ہی رک گئے۔ مسافر نے ابھی تک گوالن کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کی پیٹھ ریشم کی طرف تھی۔ ایکا ایکی خچر نے اگلے کھر جھاڑتے ہوئے زور سے گردن ہلائی۔ مسافر نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور پہلے روز کی طرح آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولا۔

"تم لوگ میرا پیچھا کرنے سے باز نہیں آؤ گے؛ جہاں جاتا ہوں، کوئی نہ کوئی آ نکلتا ہے بولو، کیا چاہتی ہو۔؟"

ریشم کو مسافر کا یہ انداز بڑا بُرا لگا۔ وہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو! اسے اس نوجوان کا خیال آیا جو اسے خواب میں ملا تھا۔ وہ کتنا دھیما اور نرم دل تھا۔ اس کی آواز میں کس قدر لوچ محبت اور ہمدردی تھی اور اس کی آنکھیں کتنی روشن اور چمکیلی تھیں۔ وہ باؤلی پر بیٹھے ہوئے مسافر سے کتنا مختلف تھا۔ کتنا الگ تھا، کتنا بیگانہ تھا۔ ریشم نے گردن اٹھا کر کہا۔

"میں تمھارا پیچھا کیوں کرنے لگی۔ تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو۔؟"

مسافر نے باؤلی میں سے پاؤں نکال لیے اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا، بہادر جرنیلوں ایسے انداز میں وہ بڑی شان سے چلتا ہوا ریشم کے پاس آکر رک گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

"گوالن! یہ مت بھولو کہ جس خچر پر تم کھڑی ہو وہ زمین پر کھڑی ہے اور زمین گائے کے سینگ پر کھڑی ہے اور گائے کہیں نہیں کھڑی ہے۔"

ریشم بے اختیار ہنس پڑی۔ مسافر گرج کر بولا۔

"اور یہ بھی مت بھولو کہ جب تم ہنستی ہو تو تمھارا چہرہ پکے ہوئے سیب کی طرح سرخ ہو جاتا ہے اور تمھارے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں اور جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے اس کے لیے کنواں تیار ہوتا ہے۔"

ریشم ہنستے ہنستے ایک دم رک گئی اور شرم سے اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہوگئیں۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تمھاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ میں جاتی ہوں۔"

وحید نے خچر کی لگام تھام لی۔

"خوبصورت باتیں اور خوبصورت چہرے سمجھ سے باہر ہوتے ہیں، شہر سے باہر ہوتے ہیں... لیکن تم ابھی نہیں جا سکتیں۔"

وہ خچر کی لگام تھام کر باؤلی کے پاس جا کر رک گیا۔

"تمھاری باؤلی کا پانی بڑا ٹھنڈا ہے گوالن!"

ریشم خچر سے اتر پڑی اور اسے پانی پلانے لگی۔

"یہ اوپر چشموں سے آتا ہے۔"

"چشمے کہاں سے آتے ہیں؟"

ریشم نے بڑی بڑی پلکیں جھپکا کر مسافر کو دیکھا۔ "یہ تم کیسی باتیں کرنے لگتے ہو۔"

"تم ان باتوں کو چھوڑو... اچھا بھلا بتاؤ ان پھولوں کا نام کیا ہے۔؟"

"یہ ترنماری کے پھول ہیں۔"

"بڑے خوبصورت ہیں لیکن تمھاری آنکھوں سے بڑھ کر نہیں۔"

"کیا؟" ریشم نے جیسے چونک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وحید جلدی سے بولا اور پھر ذرا پرے اُگے ہوئے پھولوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھنے لگا۔ "ان پھولوں کا کیا نام ہے۔؟"

"وہ... وہ سنہال کے پھول ہیں۔"

وحید پائنچے نیچے کرتے ہوئے بولا۔ "یہ کوئی پناہ گیر پھول معلوم ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے ضلع کرنال کے باشندے ہیں۔ گوالن! تم بھی پناہ گیر ہو کیا؟"

"ہاں! ہم لوگ چھپے سے آئے ہیں... اور تم؟"

وحید نے پتھر پر بوٹوں کا کیچڑ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "میں بھی پناہ گیر ہوں اور بمبے سے آیا ہوں"

"بمبے؟" ریشم نے تعجب سے پوچھا۔ "یہ شہر کہاں ہے؟"

"یہ شہر ریل کے آگے لگا ہوتا ہے۔"

بوٹ پہن کر وحید نے کچھ سوچے بغیر گوالن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "کل شام پھر آؤں گا ریشم! تم بھی آنا۔"

ریشم کے جسم میں بجلی کی لہر سی سنسنا گئی، اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور خچر ہنکاتی باغ میں سے گزر گئی۔ باغ کے کنارے پر جا کر اس نے پیچھے دیکھا۔ مسافر باؤلی پر کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور درختوں کے درمیان شام پاؤں پھیلا رہی تھی۔

اگلے روز ریشم صبح ہی سے شام کا انتظار کرنے لگی۔

وہ ہر کام جلدی جلدی اور تیزی سے کر رہی تھی۔ جیسے اگر کام ختم ہوگئے تو شام ہو جائے گی اور وہ باؤلی پہ پہنچے گی، جہاں مسافر پانی میں پاؤں لٹکائے گلاب کے شگوفوں کا ہار لیے اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ صبح اٹھ کر اس نے آٹا پیسا۔ ولٹوہوں کو گرم پانی سے دھویا بھینسوں، بکر وربینا کو چارہ ڈالا۔ بٹنگ اور آلوچے کے پودوں کو تازہ پانی دیا۔ باپ کے ساتھ مل کر دودھ دو ورا سے لے کر قصبے کی طرف چل دی۔ واپس آکر اس نے مکی کی روٹی اور گنہار کا ساگ کھایا ا ڈھور لے کر انھیں چھڑی سے ہنکاتی چراگاہ میں آگئی۔ جہاں اس کی دو تین سہیلیاں جھولے وغیر جھول رہی تھیں۔ ڈنگر چھوڑ وہ بھی ان میں شامل ہوگئی۔ سارو کی پینگ سب سے زیادہ بڑھتی تھی، اسے اوپر چڑھاتے ہوئے وہ اپنی گردن پیچھے ڈھلکا لیتی۔ اور اپنے جسم کا پورا زور لگاتی ا واپس آتے ہوئے کبوتری کی طرح ایک دم اکٹھی ہو جاتی۔ لاجو اور نیلو دوسری پینگ پر تھیں۔ ا سارو سے آگے بڑھنے کی کوشش میں پورا زور لگا رہی تھیں۔

"ریشم! اسے ہلارے مت دینا۔"

نیلو نے وہیں سے چیخ کر کہا۔ ریشم چھڑی لیے ایک طرف کھڑی ہوگئی اور سارو کا دل بڑ لگی۔

"شاباش! بس ذرا سی کسر رہ گئی ہے۔ ایک ہلارا اور وہ مارا۔۔۔"

اور وہ دونوں بازوؤں کو پینگ کی طرح جھلاتے ہوئے گانے لگی۔

مینوں جھوٹے دیہن سہیلیاں

پیاں اک دوجی دے ول

پینگ کے مقابلے میں سارو جیت گئی اور ہارنے والیاں اس سے لڑائی مار کٹائی پر اتر آئیں جس پر وہ ریشی کے ساتھ ٹیلے والے چنار کے درخت کی طرف بھاگ گئی۔ درخت کی چھاؤں میں پہنچ کر انھوں نے اطمینان کا سانس لیا اور بکھرے ہوئے بالوں کو اچھی طرح باندھ کر گھاس پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئیں۔ اور باتیں کرنے لگیں۔ پہلے پہل انھیں گرمی لگ رہی تھی۔ اور جسم پسینے میں بھیگ چلے تھے لیکن جموں اور کشمیر کی طرف سے آنے والی ٹھنڈی ہوائیں ان کے پسینے سوکھ گئے۔ اور ماتھوں پہ آئے ہوئے بالوں کا ریشم لہرانے لگا۔ ریشم نے آنکھوں پر آئے ہوئے بال پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"سارو! تمھیں فیروز پھر نہیں ملا؟"

"کون، فیروز! نہیں پھر نہیں ملا۔"

سارو کا شگفتہ چہرہ سنجیدہ ہو کر اداس ہوگیا اور وہ دو پہاڑوں کی برف آلود چوٹیوں کو تکنے لگی۔ ریشم نے بے خیالی میں سارو کے زخم پر انگلی رکھ دی تھی مگر وہ آج ہر اس زخم پر انگلی رکھنا چاہتی تھی جو مندمل ہو سکتا ہو، جو اچھا ہو سکتا ہو۔ سارو اس کی پیاری سہیلی تھی۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی اور اس کے ہر غم کو اپنا غم سمجھتی تھی۔ اپنا غم سمجھنا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ فیروز اس سے ناراض ہو کر شہر چلا گیا ہے، جہاں وہ کسی ہوٹل میں باورچی کا کام کرتا ہے۔

"اس کا خط بھی کوئی نہیں آیا؟"

"نہیں۔"

"بڑا بے وفا نکلا۔ یہ مرد ہوتے ہی ایسے ہیں۔"

سارو نے کان کی بالی ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے کونسی اس کی پروا ہے، نہیں بولتا تو نہ بولے۔ جب تک یہاں تھا اس کی ہر طرح سے دلجوئی کی، برادری کے طعنے سنے، ماں باپ کی جھڑکیاں سہیں، پھر بھی اس سے ملنا نہ چھوڑا۔ اور اب اگر وہ ذرا سی بات پر جھگڑ کر چلا گیا ہے تو میں اسے منانے نہیں جا سکتی۔"

سارو خاموش ہوگئی، ریشم بھی چپ ہوگئی۔ سارو نیچے چیڑ کی وادیوں پر منڈلاتی ہوئی چیلوں کو دیکھنے لگی اور اس کا خیال اس شہر میں نکل گیا جہاں کسی ہوٹل میں فیروز دہکتی ہوئی بھٹیوں کے سامنے کھڑا اتر کاریاں پکار رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر سے پسینہ ٹپک رہا تھا اور چہرے کا رنگ دھواں کھائی لکڑی کی مانند ہو رہا تھا۔ وہ بار بار پسینہ پونچھ رہا تھا اور دیگچوں میں چمچ ہلا رہا تھا، اسے وہ دن یاد آگئے جب وہ چیڑ گلی کی چراگاہوں میں مل کر ڈھور چرایا کرتے تھے اور فیروز اپنے کھیت کے سارے بھٹے اسے لا کر دے دیا کرتا تھا۔ اور وہ ان کی ریشمی دُموں سے فیروز کے لیے مونچھیں تیار کیا کرتی تھی۔ سارو کا چہرہ مغموم ہو کر جیسے کہیں ڈوب سا گیا اور ریشم میدانوں میں پھیلی ہوئی سفید دھوپ کو دیکھ کر سوچنے لگی۔ شام کب ہوگی؟ سورج کب چھپے گا؟ ذرا دور گھاس پر بھیڑیں چر رہی تھیں اور نوعمر چرواہے درختوں تلے بیٹھے آرام کر رہے تھے۔ ریشم جانتی تھی۔ جب یہ چرواہے اپنی بھیڑیں لیے گھروں کو پلٹیں گے تو شام ہو جائے گی لیکن آج تو وہ یوں بے فکری سے ٹانگیں پسارے لیٹے ہوئے تھے۔ جیسے وہ کبھی گھروں کو لوٹ کر نہ جائیں گے، جیسے شام کبھی نہ ہوگی اور وہ مسافر کو باؤلی پر کبھی نہ مل سکے گی، سارو نے آہستہ سے ٹھنڈا سانس بھرا اور ریشم سے قصبے میں آئے ہوئے لوگوں کے متعلق باتیں کرنے لگی۔ ان کے اوپر چنار کی ٹہنیوں پر چھوٹے نازک پتوں کی سرخ سرخ کونپلیں پھوٹ رہی تھیں اور نیچے گھاس پر کچھ زرد پتے یہاں وہاں بکھرے ہوئے تھے۔

جوں جوں دن ڈھل رہا تھا۔ ریشم کا دل ڈر اور خوشی کے ملے جلے احساس سے ڈوب رہا تھا۔ آج اس نے ریشم کو خود بلایا تھا۔ وہ مسافر سے ملنا چاہتی بھی تھی اور نہیں بھی چاہتی تھی۔ اگر کسی نے اسے وہاں دیکھ لیا تو؟ بڑی آفت آئے گی، وہ بدنام ہو جائے گی۔ اور اس کا باپ گاؤں میں کسی کو منہ نہ دکھا سکے گا اور ماں تو اسے زندہ ہی گاڑ دے گی۔ وہ اپنی ماں کی خاموشی مگر غصے زہری طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی، اسے وہ دن نہیں بھولے تھے، جب ذرا کام خراب ہو جانے پر اس کی ماں اسے مار مار کر لہو لہان کر دیا کرتی تھی۔ ان دنوں وہ اتنی چھوٹی بھی نہ تھی، باوجود وہ اپنی سہیلیوں کے سامنے بیٹھی جاتی تھی۔ ریشم سوچنے لگی کہ اسے آج شام باؤلی پر جانا چاہیئے۔ اسے آج شام قصبے میں دودھ لے کر بھی نہ جانا چاہیئے۔ وہ باپو کو بھیج دے اسے مسافر کا...... وحید کا خیال آیا اور اس نے اسے باؤلی پر اپنے انتظار میں بے چینی

اور ادھر ادھر تکتے دیکھا۔ اس کے ارادوں کے تنے ہوئے جالے ہوا کے پہلے ہی جھونکے پر ڈولنے لگے، نہیں ... اسے آج شام وہاں ضرور جانا چاہیئے۔ کل سے بے شک مت جائے، نہیں تو وہ بیچارہ یونہی انتظار کرتا رہے گا۔ اور اسے بہت افسوس ہوگا، ٹھیک ہے وہ آج شام مسافر سے مل کر کہہ دے گی کہ اب وہ اس سے کبھی ملنے نہ آئے گی۔ اور اس کا خیال وہ دل سے نکال دے۔ کیونکہ اس کا باپ بوڑھا ہے اور ماں غصے کی زہری ہے اور ریشم کے سوا ان دونوں کا دنیا میں اور سہارا نہیں۔ یہ سوچ کر وہ ہنسی خوشی شام کا انتظار کرنے لگی۔

تیسرے پہر اس نے دودھ خچر پر لادا اور قصبے کی جانب روانہ ہوگئی۔ وہ بہت جلد پلٹنا چاہتی تھی۔ اس نے جلدی جلدی دودھ تقسیم کیا اور پہلے روز کا حساب کیے بغیر واپس ہولی۔ سارا راستہ وہ ادھر اُدھر دیکھتی آئی کہ شاید مسافر...... شاید وحید باؤلی کی طرف جا رہا ہو، لیکن وہ اسے کہیں دکھائی نہ دیا۔ جب وہ سڑک سے ہٹ کر اپنے پاؤں گاؤں کی کچی سڑک پر آئی تو اسے سیب کے درختوں کے درمیان سے باؤلی پر ڈھلتی سہ پہر کے ہلکے ہلکے ٹھنڈے سایوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آیا۔ اس کے دل میں ایک خیال کانٹے کی طرح ابھرا۔ شاید وہ نہیں آیا، شاید اس نے یونہی مذاق کیا ہو، لیکن اسے ضرور آنا چاہیئے۔ اگر وہ نہ آیا تو وہ اپنے کانوں میں لٹکتی چاندی کی بالیاں کسے دکھائے گی اور کس سے مخاطب ہو کر کہے گی۔

"مسافر! میں کل سے نہیں آؤں گی۔ تم میرا خیال دل سے نکال دینا، اس لیے کہ میرا باپو بوڑھا ہے اور ماں...."

وہ خچر سے اتر پڑی اور کچی پگڈنڈی پر جانور کی لگام تھامے متلاشی نگاہوں سے باغ میں دیکھتی چلنے لگی۔ باؤلی پر ہلکا ہلکا اندھیرا تھا جو محض درختوں کے جھرمٹ کی وجہ سے تھا۔ کناروں پر پتھروں کے درمیان کہیں کہیں صابن ملا پانی رکا ہوا تھا اور معلوم ہو رہا تھا کہ گاؤں کی عورتیں یہاں سے تھوڑی دیر ہوئی کپڑے دھو کر گئی ہیں۔ باغ کا چکر کاٹ کر آتا ہوا چھوٹا سا نالہ گرل گرل کی دھیمی آواز کے ساتھ باؤلی میں گر رہا تھا۔ دوسری طرف سے شفاف پانی چھوٹے چھوٹے سیاہ پتھروں کے بیچ سے ہوتا ہوا نیچے چراگاہوں کی طرف جا رہا تھا۔ جانور گردن لمبی کر کے پانی پینے لگا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ منہ اٹھا کر خرخر کی سی آواز پیدا کرتا اور پھر پانی پینے میں مشغول ہو جاتا۔

ریشم ایک پتھر پر چپ چاپ بیٹھی تھی اور اوپر اخروٹ اور بادام کے جھنڈوں میں چڑیاں شور مچا رہی تھیں، ایک طوطا اوپر والے درخت سے غوطہ مار کر سیب کی ٹہنی پر آن بیٹھا اور اپنی لال لال چونچ سے پکے ہوئے سیب کو کترنے لگا۔ اچانک وہ پھڑ پھڑا کر اوپر اڑ گیا۔ جیسے کسی اجنبی کو دیکھ کر ڈر گیا ہو۔ ریشم نے مڑ کر دیکھا۔

سامنے سفید قمیص، سفید شلوار اور پشاوری چپل پہنے، مسافر کھڑا تھا۔

وہ ایک دم اٹھی اور اپنی خچر کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ وحید اس کے قریب آکر مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں نے تھانیداروں کی وردی تو نہیں پہن رکھی گوالن! پھر تم ڈر کیوں گئیں"۔

ریشم نے بڑی مشکل سے نظریں اوپر اٹھا کر کہا۔ "یہ آج کپڑے کیسے پہن لیے ہیں؟"

یہ میرا مادری لباس ہے ریشم!"

"مادری کیا ہوا؟" ریشم نے تعجب سے پوچھا۔

"میری ماں پٹھانی ہے"۔

ریشم جلدی سے بولی "اور باپ؟"

وحید بھی جلدی سے بولا "مراثی۔ جالندھر کا اصلی مراثی"۔

ریشم کھلکھلا کر ہنس پڑی اور وحید بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور دونوں نے ایک دوسرے کے سپید سپید دانت دیکھے اور چمکیلی آنکھیں دیکھیں۔ اور گالوں پر دوڑتا ہوا خون دیکھا۔ اور وہ دونوں وہاں سے ہٹ کر ذرا پرے درختوں کے درمیان نالے کے کنارے بیٹھ گئے اور خچر چرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا۔

جنگلی سیب کے جھکے جھکے پھلدار درختوں تلے گہری سبز چھاؤں میں خنکی تھی اور نالے کے پانی میں بھورے سیاہ اور کتھئی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پتھر چمک رہے تھے۔ ریشم گھٹنوں پر کہنیاں رکھے بیٹھی تھی اور وحید نے درخت سے ٹیک لگا رکھی تھی، اس نے پہلی بار ریشم کے گالوں پر ادھ پکے سیبوں کی پھیکی پھیکی سرخی اور تازگی دیکھی، سیاہ قمیص اور سیاہ شلوار میں اس کا سانولا رنگ کندن کی طرح نکھر رہا تھا اور کان سیاہ بالوں کی لمبی مینڈھیوں میں چھپ گئے تھے، جہاں چاندی

کی گول گول باریک بالیاں لٹک رہی تھیں۔ گردن کے نیچے حلق کے قریب جلد کا رنگ کھل گیا تھا۔ اور کلائیوں میں چاندی کے کڑے تھے اور آنکھوں میں جھیل مانسرور کی گہرائیاں تھیں اور ہونٹوں پر ان چھوئی کلیوں کی چمک تھی اور وہ بولا۔

"گوالن! تم کبھی شہر گئی ہو؟"

ریشم نے نالے میں پڑے ہوئے پتھروں کو دیکھ کر کہا۔ "ہاں گئی ہوں ایک بار باپو کے ساتھ گئی تھی"۔

"کون سے شہر؟"

"لاہور"۔

مسافر کو ایک دم لاہور یاد آ گیا۔ کس قدر بارونق شہر ہے۔ اس نے انارکلی بازار میں شام کے وقت لوگوں کے ہجوم دیکھے، برقعوں، ساڑھیوں اور غراروں کو دکانوں میں داخل ہوتے، دکانوں سے باہر نکلتے دیکھا۔ لارنس میں لوگوں کو اوپن ایئر کیفے میں میزوں کے گرد بیٹھے سکویش اور کولڈ کافی پیتے دیکھا، لارنس، انارکلی، مال، میکلوڈ، چڑیا گھر، میانی صاحب، ہائے لاہور!۔

"پھر تم نے خوب سیر کی ہو گی گوالن! ... ہے ناں!؟"

ریشم نے گردن جھکا کر کہا۔

"ہاں تھوڑی سی سیر کی تھی۔ داتا صاحب کے دربار گئے تھے۔ وہیں ایک تنور پر روٹی کھائی تھی اور پھر رات کو سرائے میں سوئے تھے اور صبح کچہری چلے آئے تھے۔"

"کچہری کیوں؟"

"باپو کی تاریخ تھی"۔

وحید خاموش ہو گیا۔ وہ اس لاہور سے بے خبر تھا جو داتا صاحب اور کچہریوں کا لاہور تھا جہاں دیہاتوں سے آئے ہوئے لوگ تنوروں پر ڈنر کرتے تھے اور سرائوں میں کیبرے دیکھتے تھے۔ اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"کچھ بھی ہو، لاہور، لاہور ہی ہے گوالن! کاش تم نے رات کے وقت سٹیشن پر لوگوں کی چہل پہل دیکھی ہوتی۔ اور تم پلازا میں والٹ ڈزنی کے رنگین کارٹون دیکھ سکتیں اور میٹرو میں موتیے کی جھاڑیوں کے پاس بیٹھ کر ہسپانوی رقاصاؤں کو کولہے مٹکا مٹکا کر رقص کرتے دیکھ سکتیں"۔

گوالن! تم نے لاہور دیکھا ہی نہیں۔"

ریشم بڑے بھولپن سے منہ اوپر اٹھائے وحید کی باتیں سن رہی تھی۔ جب وہ چپ ہوا تو وہ افسوس بھرے لہجے میں بولی۔

"ہم لوگ سارا شہر کیسے گھوم سکتے تھے۔ باپو کے پاس پیسے ہی نہیں تھے، اپنے شہر میں تو ہم ہر روز گھوما کرتے تھے۔"

"چمبے میں۔"

ریشم کی آنکھوں میں اس نام کے سنتے ہی نرم و ملائم چمک سی جھلکنے لگی۔

"ہاں! چمبہ میں... چمبہ کی ساری گلیاں ہمارے بازار مجھے جانتے ہیں۔ مجھے ہر گلی کا نام یاد ہے۔ ہمارا گھر شہر سے کچھ اوپر راجہ کے محل کے پاس تھا۔ ہماری کتنی ہی بھینسیں تھیں۔ میں روز انھیں چارا ڈالا کرتی تھی۔ اور ان کی دھاریں لیا کرتی تھی۔ محل کے باہر روز شام کو سنتری پریڈ کیا کرتے تھے۔ اور بگل بجایا کرتے تھے اور میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ لوہے کے جنگلے سے لگی ان کا تماشا کیا کرتی تھی۔ بسنت، رکمن، لیلا، رامی یہ سب میری سہیلیاں تھیں۔ یہ سب وہیں رہ گئی ہیں۔ مجھے بہت یاد آتی ہیں۔ باپو کہتا ہے۔ اب میں انھیں کبھی نہ مل سکوں گی۔ کیوں مسافر، کیا میں انھیں کبھی نہ مل سکوں گی؟"

"شاید" وحید نے آہستہ سے کہا۔

"لیکن آخر کیوں؟" مجھے تو ان سے بڑی محبت ہے۔ میں انھیں روز خواب میں دیکھتی ہوں۔ ابھی کل میں نے رکمن کو اپنے آنگن میں دھان کوٹتے دیکھا ہے۔ اللہ میاں مجھے ان سے جلد ملائے۔ میرا شہر بڑا اچھا تھا۔ میرے شہر کے سارے لوگ بڑے اچھے تھے۔ میں نے اپنے گھر کے طاق میں گلدموں کے نیچے پیال رکھے تھے۔ جب ہم گھر چھوڑ کر بھاگنے لگے تو میں نے دیکھا، گلد میں سہمی بیٹھی تھیں اور ہانپ رہی تھیں۔ میں انھیں ساتھ لانا چاہتی تھی۔ مگر باپو نے کہا وہ راستے میں مر جائیں گی۔ اب تو وہ بڑی ہو گئی ہوں گی اور دموں کو جھاڑ پھیلا کر آنگن میں دانا دنکا چنتی ہوں گی... خبر جو لوگ ہمارے مکان میں رہتے ہوں، انھوں نے انھیں بھون کر کھا لیا ہو۔ باپو کو پٹواری کہہ رہا تھا کہ چمبے میں اب جو لوگ آباد ہیں وہ جانوروں کو بھون کر کھا جاتے ہیں... کیوں مسافر، کیا یہ ٹھیک ہے؟"

وحید بڑی دلچسپی سے گوالن کی باتیں سن رہا تھا، گوالن کی نرم آواز پر اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سوئی کے ناکے میں سے ریشمی دھاگہ گزر رہا ہو۔ وہ اس کے ہونٹ ہلتے دیکھ رہا تھا اور انھیں بے اختیار ہو کر چوم لینا چاہتا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ پٹواری درست کہہ رہا تھا۔"

پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "پٹواری نے کیا کہا تھا؟"

ریشم ہنسنے لگی۔

"ابھی تو کہہ رہے تھے کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔"

"ہاں! وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔"

وہ دونوں ہنس پڑے۔

"گوالن! تم کبھی لاہور آؤ تو تمھیں خوب سیر کراؤں گا۔ تمھیں ملّاں حسین کا فالودہ اور خلیفے کے کباب اور لتا منگیشکر کے گانے سنواؤں گا۔"

ریشم نے جلدی سے پوچھا "کس کے گانے؟"

"لتا منگیشکر کے۔"

"یہ کون ہے؟"

"یہ لتا منگیشکر ہے۔ بڑی ظالم گانے والی ہے۔ آواز بالکل کوئل ایسی ہے شکل بھی کچھ کوئل سے ملتی جلتی ہے۔ اس کا وہ ریکارڈ ہے تو نے ہائے میرے لخت جگر کو چھو لیا... اور ورا لال دوپٹہ ململ کا، ہو جی، ہو جی!... گوالمنڈی کے ہوٹلوں نے یہ ریکارڈ بجا بجا کر ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ ہائے لتا منگیشکر! ہائے گوالمنڈی کے ہوٹل! ہائے خلیفہ کیا بیا! اور ہائے ہور یہ! چل موچی لوہاری، اک سواری!"

ریشم پھر ہنسنے لگی۔

"یہ اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے تمھیں کیا ہو جاتا ہے؟"

"ہوتا نہیں... ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔"

"اچھا اب میں چلی۔ سانجھ ہو رہی ہے۔ ماں ناراض ہوگی۔"

رشیم اٹھ کھڑی ہوئی۔ مسافر بھی جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ابھی سانجھ نہیں ہوئی گوالن! ذرا دیر اور رک جاؤ۔"

رشیم نے عجیب کھوئی کھوئی آنکھوں سے مسافر کو دیکھا اور دھیمے سے کہا، پھر آجاؤں گی مسافر

وحید اس پُراسرار لہجے پر مسحور سا ہو گیا اور گوالن کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ "پھر کب؟

"کسی دن شام کو؟"

"کسی دن شام کو؟"

"کل"

"اچھا! میں اسی جگہ انتظار کروں گا۔"

"اچھا۔"

شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ خچر ذرا پرے درختوں تلے گھاس چر رہا تھا۔ رشیم نے پاس جا کر اس کی لگام پکڑی۔ وحید کو آخری بار دیکھا اور سیب کے جھکے جھکے پیڑوں میں سے گزر کر دوسری طرف نکل گئی۔ وحید کچھ دیر وہاں کھڑا اسے شام کے سایوں میں گم ہوتے دیکھتا رہا۔ پھر وہ تنہا رہ گیا اور گھاس پر اس جگہ دیکھنے لگا جہاں ابھی ابھی گوالن بیٹھی اسے کھوئی کھوئی نگاہوں سے تک رہی تھی۔ وہ مسکرایا اور گردن جھٹک کر وہاں سے چل دیا اور قصبہ پنج ناگ آنے والی سڑک پر آگیا۔

آہستہ آہستہ باؤلی کی رل ترل، رل ترل کی آواز کہیں پیچھے رہ گئی۔

تین میل تک گھومتی، بل کھاتی پتھریلی سڑک پر چلنے کے بعد وحید قصبہ پنج ناگ کے بڑے بازار میں پہنچا تو رات ہو گئی۔ آسمان پر تارے چمکنے لگے اور درختوں تلے ادھر ادھر بکھرے ہوئے مکانوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔ بتی جلائی۔ دروازہ بند کیا اور کھڑکی کے پاس بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹ گیا اور دونوں پاؤں کھڑکی کی سل پر رکھ دیے۔ وہ کتنی ہی دیر خاموشی سے لیٹا گوالن کے متعلق سوچتا رہا۔ پھر ایکا ایکی وہ اٹھا۔ چارپائی کے نیچے سے سوٹ کیس باہر گھسیٹا۔ ڈھکنا کھول کر لفافے میں رکھی ہوئی کچھ تصویریں نکالیں اور انھیں میز پر پھیلا کر غور سے دیکھنے لگا۔

پہلی تصویر پتلے سے لمبے ناک والی لڑکی کی تھی جو معمولی کپڑے پہنے کوٹھے کی چھت پر دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ اسے اپنی تصویر اتروانے کا شدید احساس تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہ تھا۔ یہ تصویر تیز دھوپ میں اتاری گئی تھی اور دھوپ چھاؤں کا ناقابلِ برداشت حد تک نمایاں تضاد پیش کر رہی تھی۔ کونے میں ایک طرف ٹیڑھے میڑھے حروف میں بلقیس لکھا تھا۔

بلقیس سے وحید کی ملاقات دو سال ہوئے لاہور سے سیالکوٹ جاتے ہوئے بس میں ہوئی۔ وہ کمپنی کی طرف سے وہاں چائے کی سیل وغیرہ چیک کرنے جا رہا تھا۔ جنوری کی دھندلی صبح تھی۔ رات بھر ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہی تھی۔ لاہور کا آسمان پھیکے سرمئی بادلوں کے غلاف میں چھپا ہوا تھا۔ اور دھیمی دھیمی پھوار اب بھی پڑ رہی تھی۔ بہت جلد موٹر

مسافروں سے بھر گئی اور جب وہ اڈے سے باہر نکلی، تیز ہوا میں سردی ایک دم بڑھ گئی چنانچہ تمام کھڑکیوں کے شیشے چڑھا دیے گئے اور کچھ دیر بعد اندر گرم حمام ایسی فضا پیدا ہو گئی۔ وحید جس سیٹ پر بیٹھا تھا اس کے بالکل سامنے ایک لڑکی بیٹھی تھی، اس نے فاختائی رنگ کا برقعہ اوڑھ رکھا تھا اور جالی دار نقاب میں سے اس کی چمکتی ہوئی بھوری بھوری آنکھیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے دائیں جانب ادھیڑ عمر کا دبلا پتلا سا آدمی سر پر سفید پگڑی باندھے کمبل میں لپٹا بیٹھا تھا اور کبھی کبھی جھک کر اس سے کوئی بات کر لیتا تھا۔ بائیں جانب ایک موٹی دیہاتن گرم چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ پہلے پہل وحید نے کوئی خیال نہ کیا اور وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا کمبل گھٹنوں پر رکھے خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا۔ لیکن شاہدرہ موڑ گھومتے ہوئے اچانک اس کا گھٹنا لڑکی کے گھٹنے سے ٹکرا گیا اور اس کے بدن میں جیسے گرم پانی کی لہر دوڑ گئی اور اس کی آنکھوں میں سینک سا اٹھنے لگا۔ اور اس نے دیکھا، دو بھوری بھوری چمکیلی آنکھیں اسے عجیب انداز میں تک رہی تھیں۔ وحید کو ایکا ایکی محسوس ہوا کہ سیالکوٹ بڑی دور ہے اور اگر وہ اسی طرح سیٹ پر بت بنا بیٹھا رہا تو یہ سفر کبھی ختم نہ ہو گا۔

اپنا سگریٹ پاؤں تلے مسلتے ہوئے وہ سیٹ پر ذرا آگے کھسک آیا۔ اب اس کا گھٹنا تھوڑے تھوڑے وقفے بعد لڑکی کے گھٹنے سے مس ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید لڑکی اپنا پاؤں پیچھے کھینچ لے گی۔ مگر اس نے ایسا نہ کیا۔ وحید کی ہمت بندھ گئی، کالا شاہ کاکو گزرا تو بارش پھر شروع ہو گئی اور موٹر کی چھت پہ بارش کا میوزیکل رقص شروع ہو گیا۔ وحید نے موٹی دیہاتن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "آج تو بڑی سردی ہے اماں جی!"

"ہاں بیٹا، ماگھ کے ٹھکے ہیں" موٹی دیہاتن نے سرخ ناک سڑکاتے ہوئے کہا۔

"اس کمبل سے کچھ کام لینا چاہیے"!

اتنا کہہ کر وحید نے فوراً اپنا فوجی کمبل کھولا اور آس پاس بیٹھے ہوئے کچھ مسافروں کے گھٹنوں پر پھیلا دیا اور ان میں بھوری آنکھوں والی لڑکی کا گھٹنا بھی تھا۔

"آپ بھی اوپر کریں چاچا جی"!

وحید نے لڑکی کے ساتھ والے بوڑھے سے کہا۔ اس نے احسان مند نگاہوں سے

کو دیکھ کر کمبل اوپر کر لیا۔ مینہ اسی طرح برس رہا تھا اور بس گیلی سڑک پر گرتی بارش میں لگی بندھی رفتار پر جا رہی تھی۔ قریباً سبھی مسافر بارش کے شور میں خاموش ہو گئے تھے اور اپنی اپنی سیٹ پر منہ سر لپیٹے اونگھ رہے تھے۔ صرف دو بھوری آنکھیں بیدار تھیں۔ اور وحید کو تیز نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ وحید کا گھٹنا اب مستقل طور پر لڑکی کے گھٹنے سے لگا تھا۔ اور اس کا بدن گرم ہو رہا تھا جیسے وہ چولہے کے سامنے بیٹھا ہو۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنا ہاتھ کمبل کے نیچے سے آگے کھسکاتے ہوئے پہلے اپنا گھٹنا کھجلایا اور پھر لڑکی کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ وقت بڑا نازک تھا۔ یہ گھڑی بڑی خطرناک تھی۔ اس کا ہاتھ ایک نامحرم ناواقف لڑکی کے گھٹنے پر تھا۔ انجن کے سٹارٹر پر تھا، بجلی کے سوئچ پر تھا اور طنبورے کے تار پر تھا۔ ابھی کچھ ہونے والا تھا۔ ابھی انجن میں سے بھاپ کے بادل نکلیں گے اور بتی بجھ جائے گی اور اندھیرا ہو جائے گا اور پھر... یا طنبورہ معاً چیخ اٹھے گا اور لوگ چونک کر اس کی طرف دیکھیں گے اور یا اس میں سے راگ کے ایسے دھیمے اور خواب آلود میٹھے سُر نکلیں گے جنھیں مسافروں سے بھری ہوئی اس موٹر میں سوائے ان دونوں کے اور کوئی نہ سن سکے گا۔ کچھ دیر کے لیے وحید کا ہاتھ لڑکی کے گھٹنے پہ مردہ ہاتھ کی طرح پڑا رہا اور جب لڑکی نے کوئی حرکت نہ کی تو وہاں سے کھسک کر ساٹن کی ریشمی شلوار پر پھسلتا ہوا پنڈلیوں اور پھر گول گول گرم رانوں پر پھرنے لگا اور انجن بھاپ کے مرغولے چھوڑتا سٹارٹ ہو گیا اور گاڑی چل پڑی۔ اور طنبورے میں سے خواب آلود شیریں سُر نکلنے لگے اور گرتی بارش میں میرابائی برودکر نے کھرج ملہار کے چھلے بول اٹھائے... گرج گرج برسو رے بیر وا... اور پھر خوب بارش ہوئی اور گوجرانوالے تک ہوتی رہی۔ گوجرانوالے پہنچ کر وحید نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور دو بھوری آنکھیں اسے نقاب میں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔ گوجرانوالے کچھ دیر کے لیے مینہ رکا اور بس کے چلتے ہی پھر شروع ہو گیا۔

اب وہ لڑکی ساتھ والی موٹی دیہاتن سے باتیں کر رہی تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ وہ سیالکوٹ میں استانی ہے اور بچیوں کے سکول میں اردو پڑھاتی ہے اور لاہور اپنے چچا کے ساتھ اپنی بڑی بہن سے ملنے آئی تھی۔ وحید نے سب باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لیں اور کمبل کے نیچے سے

لڑکی کا ہاتھ دباتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اس کی گرم گرم ران پر ہاتھ پھیرنے لگا اچانک اسے یوں لگا جیسے وہ اس لڑکی کے چچا کی ران پر ہاتھ پھیر رہا ہو۔ اس نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا اور یوں ہی سر کے بالوں میں انگلیاں گھمانے لگا۔ سیالکوٹ پہنچ کر لڑکی اسے بار بار معنی خیز نگاہوں سے تکتی، فاختائی برقع سنبھالتی، اپنے چچا کے ساتھ تانگہ میں سوار ہو کر چلی گئی۔ اور وحید اڈے کے چھپر تلے کھڑا سڑک کے آخری موڑ تک اس فاختہ کو اڑتے دیکھتا رہا۔

اگلے دن وہ چھٹی کے وقت اسکول کے باہر جا کر کھڑا ہو گیا اور فاختائی برقعے کا انتظار کرنے لگا۔ اسکول میں چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی کم عمر بچیوں کی ٹولیاں ہنستے کھیلتے باہر نکلنے لگیں۔ کچھ دیر بعد استانیوں کی باری آئی۔ کتنی ہی استانیاں تانگوں میں سوار ہو کر چل دیں مگر وہ لڑکی کہیں دکھائی نہ دی۔ وحید ناامید سا ہو کر سوچنے لگا کہ اسے ضرور بیوقوف بنایا گیا ہے۔ وہ سگریٹ سلگا کر وہاں سے چلنے ہی والا تھا کہ اسکول کے گیٹ پر وہی بس والا فاختائی برقع نمودار ہوا اور فٹ پاتھ پر درختوں کے نیچے ایک طرف چل پڑا۔ وحید نے دل ہی دل میں خوشی کا ایک نعرہ لگایا اور تھوڑا سا فاصلہ چھوڑ کر فٹ پاتھ پر روانہ ہو گیا۔

پہلے روز کی طرح بادل آسمان پر بدستور چھائے ہوئے تھے۔ بارش نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن انتہائی سرد ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے سڑک پر بہت کم لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سڑک آگے جا کر پرانے قلعے کا چکر کاٹ کر شہر کے اندر چلی گئی تھی۔ جب قلعے کی حدود شروع ہوئی اور سڑک نسبتاً ویران ہو گئی تو وحید لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھا اور لڑکی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا، لڑکی پہلے تو گھبرا گئی۔ اس نے تسلی طلب نگاہوں سے ارد گرد دیکھا اور پھر خاموشی سے چلنے لگی۔ وحید نے آہستہ سے پوچھا: "اگر مکان دور ہو تو تانگہ لے لیں۔"

لڑکی کچھ نہ بولی۔ تھوڑے وقفے کے بعد وحید پھر بولا: "اتنی سردی میں آپ کوٹ کے بغیر کیسے آجاتی ہیں۔؟"

لڑکی نے گلہ آمیز لہجہ میں کہا: "آپ بڑے بے شرم ہیں۔"

وحید کھسیانا سا ہو کر ہنسنے لگا۔

"وہ کیسے؟"

"کل بس میں آپ کیا کر رہے تھے؟"

"محبت کر رہا تھا۔"

"مجھے ایسی محبت اچھی نہیں لگتی۔ مجھے بڑی شرم آرہی تھی۔"

"آپ تو خواہ مخواہ شرم کر رہی تھیں۔"

"شرم عورت کا زیور ہے۔"

"زیور عورت کا کیا ہے؟"

لڑکی نے پلٹ کر وحید کو دیکھا۔ وحید کو دو بھوری بھوری چمکیلی آنکھیں اسے گھورتی دکھائی
یں۔ وہ ہنس پڑی: "آپ بھی عجیب ہیں۔"

وحید بھی ہنس پڑا: "ویسے آپ بھی عجیب ہیں۔"

کچھ فاصلہ انھوں نے خاموشی سے طے کیا۔ وہ ایک اونچے ٹیلے کے پاس سے گذر رہے
تھے۔ اس ٹیلے کی دوسری جانب شہر کی آبادی شروع ہوتی تھی۔ وحید نے ٹیلے کے اوپر اُگے ہوئے رنڈ کے بدصورت درخت کو دیکھ کر کہا۔

"یہاں ارنڈ کے درخت بہت ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارنڈیروں کا شہر ہے، لاہور میں یہ
رخت صرف قبرستانوں میں اُگتا ہے اور انتہائی بدوضع، بھدا اور بھینگا ٹیڑھا ہوتا ہے۔ اسے
یکھ کر خیال آتا ہے کہ مردہ کتنی تکلیف میں ہے۔"

لڑکی بولی: "آپ لاہور کی بات نہ کریں۔ یہ سیالکوٹ ہے۔"

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ یہ سیالکوٹ ہے۔ یہاں تو ارنڈ ہی اُگ سکتا ہے۔"

لڑکی نے تنگ آکر پوچھا: "مگر آپ کو درختوں سے کیوں دلچسپی ہے؟"

"میرا باپ لکڑہارا ہے... شاہی لکڑہارا۔"

"لکڑہارا ہے؟"

"ہاں! وہ جوئے میں ٹال کی ساری لکڑیاں ہار گیا ہے۔"

لڑکی بے اختیار ہنس پڑی اور وحید کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی جیب سے سارا

کریانہ پکی سڑک پر گرپڑا ہو۔ اکنیاں، دوّنیاں، چوّنیاں، اٹھنیاں۔ وہ ان سب کو اکٹھا کرنے لگا تاکہ وہ پھر زمین پر گرا سکے۔ وہ ایک بار پھر اس ہنسی کی کھنکھناہٹ سننا چاہتا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"یہاں وہ کنواں کہاں ہے جہاں پورن بھگت کو ہاتھ کاٹ کر پھینک دیا گیا تھا؟"

لڑکی نے قلعے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" اوپر، اس طرف ہے۔"

اور وحید نے دیکھا کہ لڑکی کی انگلیاں لمبی اور مخروطی تھیں۔ پتلی پتلی ولایتی گاجروں کی مانند۔ وہ آج صرف گاجریں کھانا چاہتا تھا۔

"میں نے سنا ہے اس کنویں میں سے رات کو بھجن گانے کی آوازیں آتی ہیں؟"

"ہم نے تو کبھی نہیں سُنے۔"

"سنا کریں نا۔ مگر سیالکوٹ میں رہتے ہوئے کوئی کیا بھجن سُنے۔"

ٹیلے کا چکر ختم ہو رہا تھا اور سامنے مکانوں کی چھتیں اور کھڑکیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ لڑکی نے ذرا رکتے ہوئے کہا۔" اچھا اب آپ واپس چلے جائیں۔"

وحید بھی رک گیا۔" اچھا... کل پھر آؤں گا۔ مگر آپ نے اپنا نام تو....؟"

"بلقیس.... یہی میرا نام ہے۔"

وہ چلنے لگی تو ایک لمحے کے لیے پیچھے گھوم کر بولی۔" اور آپ کا نام؟"

"پورن بھگت۔"

بلقیس کھلکھلا کر ہنس پڑی اور وحید سڑک پر سے کریانہ اٹھائے بغیر واپس چائے کمپنی کے دفتر آگیا۔ شہر میں اس کا کام اسی روز ختم ہوگیا تھا لیکن وہ ایک دن بھر کے لیے رک گیا۔ اور دن وہ تھا جب وہ بلقیس کے ساتھ صدر کے ایک خوبصورت ہوٹل کے کمرے میں صوفے پر بیٹھا تھا اور بلقیس اس کی گود میں تھی اور وہ کبھی ولایتی گاجریں چکھ رہا تھا اور کبھی ہونٹوں کا شہد پی رہا تھا۔ اور کبھی آنکھیں چُوم رہا تھا۔ اور اس کا ہاتھ اس کے بدن پر.... ریشمی بدن پر پھسل رہا تھا۔ عورت کے بدن پر اتنی پھسلن کیوں ہوتی ہے؟ کمبخت ہاتھ ایک جگہ رکتا ہی نہیں، ابھی یہاں ہے تو ابھی وہاں۔ ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔ ہمیشہ پھسلتا رہتا ہے۔ عورت کا جسم بھی کیلے کا چھلکا

ہے اور اس پر سے پھسلا ہوا آدمی بہت کم ثابت بچتا ہے۔ وحید سوچ رہا تھا اور اس کا ہاتھ پھسل رہا تھا، یہاں تک کہ اس کا پاؤں بے خیالی میں چھلکے پر آگیا اور وہ بھی پھسل پڑا اور چھلکے سمیت فرش کے قالین پر گر پڑا۔

اسی رات گاڑی میں سوار ہو کر وحید لاہور آگیا۔

اب وہ مہینے میں دو تین بار سیالکوٹ ضرور جاتا اور بلقیس سے ملتے ہی پھسل جاتا۔ دن میں کئی کئی بار پھسلتا۔ وہ بیچاری اسے سنبھالتی رہ جاتی اور وہ سنبھل سنبھل کر پھسلتا۔ بالآخر جب چھلکے میں مزید پھسلن باقی نہ رہی تو وحید نے سیالکوٹ جانا چھوڑ دیا اور ایک دن بلقیس کی نشانی کے طور پر دی ہوئی خوبصورت انگوٹھی غزالہ کو پہناتے ہوئے کہا۔" یہ میری محبت کی یادگار ہے غزالہ۔"

اور غزالہ نے بھی یونیورسٹی کے پروفیسر کا دیا ہوا رومال وحید کے کوٹ میں سجاتے ہوئے کہا۔

"اور یہ تمھیں میری یاد دلائے گا۔ وحید۔"

غزالہ یونیورسٹی میں ایم اے کے فائنل ائیر کی سٹڈی کر رہی تھی اس نے پولیٹیکل سائنس لے رکھی تھی اور اس کے بعد وہ براہِ راست ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہتی تھی۔ وحید کی اس سے ملاقات یونیورسٹی کیفے میں ہوئی۔ جہاں وہ چائے کے تازہ مال کے بارے میں بات چیت کرنے گیا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا تو ایک دبلے پتلے جسم اور میانے قد کی لڑکی کیفے کے منیجر سے چائے کے نقائص بیان کر رہی تھی۔

"آپ کی چائے نہایت واہیات ہوگئی ہے۔ ذرا رنگ نہیں دیتی اور ذائقہ بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بڑ کے پتے ابال دیے گئے ہوں۔ آپ کہاں سے منگواتے ہیں یہ چائے؟ آپ لپٹن استعمال کیوں نہیں کرتے؟"

اس لڑکی کی آواز بھاری اور خشک تھی اور معلوم ہوتا ہے گویا کوئی بھینس ریت پر چل رہی ہو۔ وحید خاموشی سے کاؤنٹر پر کھڑا اس کی باتیں سنتا رہا۔ منیجر بیچارہ کھسیانا سا ہو کر معذرت پیش کر رہا تھا۔ مگر لڑکی بولے جا رہی تھی۔ بھینس منہ اٹھائے چلی جا رہی تھی۔

"نہیں جی! آپ کو سٹوڈنٹس کا خیال رکھنا چاہیے۔ آپ بیشک دام بڑھائیں لیکن چیز بھی بڑھیا استعمال کریں۔ کل مس اللہ رکھی چوہان بھی شکایت کر رہی تھی، پرسوں مس خدابخش نے ساری

چائے باہر پھنکوادی .....،،

جب وہ لڑکی اپنی دوسری سہیلیوں کے ساتھ میز پر جا کر بیٹھ گئی تو منیجر وحید کی طرف متوجہ ہو

"سن لی آپ نے اپنی چائے کی تعریف؟"

"ہاں! سن لی ہے۔ مگر یہ لڑکی کون ہے؟"

"اجی کوئی بھی ہو، سوال تو یہ ہے کہ آپ ہمیں گھاس کب تک پلاتے رہیں گے؟"

"گھاس کی توہین نہ کرو، وہ چائے سے بڑھ کر ہے۔ بڑے بڑے پہلوان کسرت کرنے کے بعد گھاس کا پانی آبِ حیات سمجھ کر پیتے ہیں۔ تم چائے پی کر دو فرلانگ نہیں دوڑ سکتے لیکن گھاس کھا کر کئی میل دوڑ سکتے ہو۔"

اس کے بعد کیفے کے منیجر نے اسے بتایا کہ اس لڑکی کا نام غزالہ ہے اور فائنل ایئر کی سٹوڈنٹ ہے اور ڈفرن روڈ پر رہتی ہے۔ وحید کاؤنٹر پر ذرا جھک کر اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔ وہ میز کے گرد، قریب ہی اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اس نے بھی کاؤنٹر پر ایک نوجوان کو اپنی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھا اور گھبراہٹ میں عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگی۔ جس وقت وہ باہر نکلی تو وحید بھی ساتھ ہی باہر نکل آیا۔ فوارے کے پاس جا کر وہ لڑکی اپنی سہیلیوں سے جُدا ہو کر باغ میں سے گزرنے لگی۔ کھیلوں والے پلاٹ کے قریب، جامن کے درختوں میں سے گزرتے ہوئے وحید اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"معاف کیجئے گا، میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟"

لڑکی کچھ بدحواس سی ہو گئی مگر فوراً سنبھل گئی۔ اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ "پوچھیے۔"

"کیا آپ کشمیری ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"تو آئندہ چائے کے بارے میں کچھ نہ کہیں۔"

"کیوں؟"

اس لیے کہ اس ملک میں چائے پر بات کرنے کا حق اللہ تعالیٰ نے صرف کشمیریوں کو دے رکھا ہے۔ دوسرے لوگوں کو صرف ستوؤں پر بات کرنی چاہیئے بشکر کے شربت کے فوائد بیان

کرنے چاہئیں۔"

لڑکی کا چہرہ غصے میں سرخ ہو کر زرد ہونے لگا "آپ بڑے بدتمیز ہیں۔"

"میں کچھ اور بھی ہوں اور آپ کو کچھ عرصہ بعد پتہ چلے گا۔"

"آپ زبان سنبھال کر بات کریں۔"

"میں بہت کچھ سنبھال کر بات کر رہا ہوں محترمہ! میرا خیال تھا کہ آپ کو بات کرنے کا سلیقہ ہو گا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ آپ ڈفرن روڈ پر کیوں رہتی ہیں۔ میرے کئی ایک دوست وہاں رہتے ہیں جو بالکل ڈفر ہیں۔"

"آپ گدھے ہیں۔ میرا راستہ چھوڑیے۔"

"یہ لیجئے! میں گدھوں کا راستہ کبھی نہیں روکتا۔"

لڑکی انتہائی غصے کی حالت میں پھنکارتی ایک طرف گھوم گئی۔ اور وحید وہاں کھڑا ہنستا رہا۔ اور سگریٹ سلگا کر بجھی ہوئی دیا سلائی زور سے گھما کر گھاس پر پھینک کر واپس کیفے میں آ گیا۔

وحید نے غزالہ کے متعلق پوری پوری تحقیقات کی اور اسے پتہ چلا کہ وہ بڑی عام قسم کی لڑکی ہے اور اس وقت وہ بیک وقت کسی اخبار کے ایڈیٹر، بنک کے خزانچی اور یونیورسٹی کے پروفیسر سے عشق لڑا رہی ہے۔ وحید کو کافی حوصلہ ہوا۔ اس نے بھی اپنی پتنگ کا رُخ اس تکڈم کی طرف موڑا اور تھوڑے ہی دنوں میں اس کے پیچ بھی لڑ گئے اور غزالہ، خزانچی، ایڈیٹر اور پروفیسر سے ملنے کے بعد وحید کے ساتھ بھی مال کے ہوٹلوں اور سینماؤں میں گھومنے لگی۔ وحید غزالہ سے نشانی کے طور پر جو بھی سونے کی کوئی چیز لیتا اسے بازار میں بیچ کر اسے سینما دکھا دیتا اور کیک پیسٹری کھلا دیتا بہت کم حالتوں میں پلّے سے کچھ خرچ کرنے کا قائل تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ عشق سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ چنانچہ اس نے غزالہ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ وہ سب کچھ... وہ سب کچھ حاصل کیا جو ایک عورت..... بیک وقت چار آدمیوں سے عشق کرنے والی عورت اسے دے سکتی تھی۔ لارنس کی سایہ دار روشوں اور مال کے کیفوں میں بیٹھے ہوئے غزالہ نے کئی بار اپنے اس مستقبل کا ذکر کیا جس میں وہ اپنے آپ کو لاکھوں عورتوں کے مجمع میں تقریریں کرتے اور ہر سٹیشن پر اپنا پُر جوش خیر مقدم ہوتے دیکھ رہی تھی۔

"میں جب سوچتی ہوں کہ ایک دن اخباروں کے پہلے صفحوں پر غیر ملکی سفیروں اور لیڈروں کے ساتھ میری تصویریں بھی شائع ہوں گی اور میں ملک ملک کی سیریں کروں گی تو مجھے یقین نہیں آتا کہ میں اس وقت تمھارے ساتھ اس گھٹیا کیفے میں بیٹھی ہوں۔"

وحید بہت کم اس کی احمقانہ باتیں سنا کرتا۔ زیادہ تر وہ اس سے پہلے ملی ہوئی لڑکیوں اور اس کے بعد ملنے والی لڑکیوں کے خیال میں مگن رہتا۔ اور یا کسی وقت یہ سوچنے لگتا کہ اس سیاسی دوشیزہ کو کیسے اور کہاں چاروں شانے چت گرایا جائے؟ یہ سیاسی مسئلہ کیونکر حل کیا جائے؟ غزالہ اس کے نزدیک مسئلہ فلسطین سے کم نہ تھی۔ سینما کے بکس میں بیٹھے بیٹھے کئی بار اس کا ہاتھ اس مسئلے کی الجھنوں پر گھوما پھرا تھا مگر غزالہ ٹس سے مس نہ ہوئی تھی۔ وہ برف بنی بیٹھی رہی تھی جیسے وہ جسم کسی اور کا ہو۔ اور کئی بار ایسا ہوا کہ وحید کا ہاتھ غزالہ کی چھاتی پر ہوتا اور وہ فلم دیکھتے ہوئے یکبارگی اٹھتی۔

"واہ وا! کیا سگریٹ کے دھوئیں میں لوبان کا دھواں ڈی ڈی ٹی رولو ہوا ہے۔"

اور وحید کو محسوس ہوتا جیسے اس کے ہاتھ میں آئی ہوئی چھاتی موٹر کے پھٹے ہوئے ہارن میں ڈی ٹی رولو ہو گئی ہو۔ جیسے اس کے ہاتھ میں برف کا گولہ ہو۔ سات پردوں والا گیند ہو۔ چائے کا ہوا ور وہ ہاتھ جھاڑ کر چپکا ہو بیٹھتا۔ کسی وقت وہ اس کی باتوں سے تنگ آکر بول اٹھتا۔

"غزالہ! کیوں زندگی کا مذاق بنا رہی ہو۔ تم گھر سے ذرا باہر نکل کر دیکھو تو سہی۔ تم جس سڑک بھی چلو گی وہ گھوم گھام کر کسی نہ کسی مکان کی خواب گاہ میں آجائے گی جہاں ایک بستر تمھارا انتظار کر رہا ہوگا۔ تم اور تمھاری دوسری سہیلیاں سب احمق ہیں، تم سیاسیات میں کلوپیٹرا سے آگے نہیں جا سکتیں اور کلوپیٹرا احمق انطونی کے بازوؤں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ عورت اس سے زیادہ اور کر بھی نہیں سکتی۔ وہ فطرتاً کمزور ہے اور سہارا چاہتی ہے، اس کی تمام تر سرگرمیوں کا نتیجہ محض ایک ہے ....روتا ہوا بچہ۔ تمھاری سربلندی اسی میں ہے کہ تم اپنے اندر کی عورت کی پرورش کرو، اسے نہ ہونے دو۔ یہ کمزوری تمھاری سب سے بڑی طاقت اور یہ بدصورتی تمھارا سب سے بڑا حسن نانا فرنویس بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم چاند بی بی کی بہن ہو جسے اپنے تمام کارناموں کے باوجود یا ق کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت ناگزیر ہے غزالہ! قطعاً ناگزیر۔"

"لیکن میں ساری عمر شادی نہیں کروں گی۔"

"پھر کیا ہوگا! اس طرح تمھیں بہت زیادہ شادیاں کرنا پڑیں گی۔"

"میں خود کماؤں گی اور بغیر کسی سہارے کے عمر بھر کنواری رہوں گی۔"

"عمر بھر کیا، چار سال کے اندر اندر ہی تمھاری کنپٹیوں کے بال سفید ہو جائیں گے اور جسم سوکھ جائے گا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ جائیں گے۔ اور سنگ دلی ہوئی لکڑی ایسا ہو جائے گا ۔ تیس سال کی عمر میں ہی تم ساٹھ سال کی ہو جاؤ گی۔ اور ہر خوبصورت جوان تمھاری صحبت سے گھبرائے گا اور دور بھاگے گا اور یوں تم عورت سے بھوت بن جاؤ گی۔ بھوت، جس کی جگہ صرف شمشانوں اور قبرستانوں میں ہے۔"

لیکن وحید اسے کبھی قائل نہ کر سکا تھا۔ فلسطین کا مسئلہ اسی طرح لٹکا ہوا تھا۔ آخر وحید نے اس کا حل تلاش کر لیا۔ اس نے نیم وحشی بدو قبائل کی فوج جمع کی اور برق رفتار ریگستانی گھوڑوں پر سوار ہو کر شبخون مارا۔ اور راتوں رات فلسطین کی سرحدوں میں گھس گیا اور جب اس نے غزالہ کو اپنے ساتھ لگایا تو اس کا کمزور بدن کانپنے لگا۔ اور اس کے ہونٹ اور حلق خشک ہو گیا۔ اور وہ وحید سے یوں چمٹ گئی جیسے اب کبھی جدا نہ ہو گی۔ وحید نے تن کر ایک نعرہ مارا اور فلسطین کے نخلستانوں میں وحشیوں کی مانند اچھل اچھل کر ناچنے لگا۔

غزالہ اپنی تصویر میں کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر ہیجان افسردگی تھی۔ وحید نے تیسری تصویر اٹھائی۔

اس تصویر کی پشت پر "مس وائیلٹ میکارتھی" لکھا تھا۔ اس اینگلو انڈین لڑکی سے وحید پلازا سینما میں ملا، اپریل کی خوشگوار رات تھی۔ وہ سیکنڈ کلاس کے گیٹ پر کھڑا اپنے گیٹ کیپر دوست سے باتیں کر رہا تھا کہ ایک بھرے بھرے جسم کی سانولی سی عیسائی لڑکی پھیکے پیازی رنگ کا گون پہنے، کٹے ہوئے سیاہ بالوں میں سرخ فیتہ باندھے اندر داخل ہوئی۔ وحید ایک طرف ہٹ گیا، لڑکی نے نصف ٹکٹ واپس لیا اور سب سے پچھلی قطار میں ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گئی اور گیٹ کیپر نے وحید کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔

"میرا خیال ہے اکیلی ہے۔ ساتھ بیٹھ جاؤ۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔"

وحید ہال میں ایک طرف کھڑا ہو کر سینما شروع ہونے کا انتظار کرنے لگا تیسری گھنٹی ہال میں اندھیرا ہو گیا اور نیوز ریلیز چلنے لگیں۔ وحید نے دیکھا کہ لڑکی کے ارد گرد کافی کرسیاں خالی تھیں۔ اس نے ٹائی کی ناٹ درست کی، سگریٹ سلگایا اور بڑی بے نیازی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس لڑکی کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ لڑکی ذرا سی سمٹ گئی۔ اور اس نے وحید کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ نیوز ریلیز، نئی فلموں کے نمونے اور کارٹون وغیرہ ختم ہو گئے۔ فلم کے دو پار چل گئے۔ مگر وحید نے کوئی حرکت نہ کی، آخر اسے اپنی اس بے حسی پر سخت غصہ آیا اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر اندھیرے میں ہی ڈبی لڑکی کی طرف بڑھائی اور گیری کوپر کے انداز میں کہا۔

"سی گریٹ میڈم ایم۔"

"نو تھینک یو۔"

وحید نے اپنا سگریٹ سلگا لیا اور کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔ پردے پر دو جنگلوں کا ایک لمبا سیکوئنس آیا اور ہال میں روشنی پہلے سے بھی دھیمی ہو گئی، وحید نے اپنا دایاں ہاتھ جیب سے باہر نکالا۔ اور بڑے آرام سے لڑکی کی لجلجی ران پر رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ بڑے آرام سے جھٹک دیا گیا۔ وحید نے پردۂ سیمیں پر نظریں گاڑ دیں۔ وہاں بڑا مقدس منظر دکھایا جا رہا تھا یعنی ہیروئن جنگل کے ایک گرجا گھر میں یسوع مسیح کی مورتی کے سامنے دو زانو بیٹھی تھی۔ اور پس منظر میں ارگن پر مذہبی گیت جاری تھے۔ وحید خاموشی سے کسی اور منظر کا انتظار کرنے لگا چنانچہ دس پندرہ منٹ کے بعد جب اسی ہیروئن کو خواب گاہ کی دھندلی روشنی میں ہیرو نے دبوچا تو وحید کا ہاتھ بڑی ہوشیاری سے ساتھ والی لڑکی کے زانوؤں پر پھرنے لگا، لڑکی نے کوئی حرکت نہ کی۔ وہ دلیر ہو گیا اور اس کا ہاتھ وہاں سے ہوتا ہوا پیٹ پر اور پھر اس سے اوپر جا پہنچا۔ لڑکی نے ایک جھرجھری سی لی۔ اور اپنا ہاتھ وحید کے ہاتھ پر رکھ کر زور سے دبایا۔ دونوں کے ہاتھ گرم تھے۔ اور دونوں کے جسم شعلوں میں دہک رہے تھے۔ انٹرول کے وقت وحید نے چائے اور پھل منگوایا اور لڑکی سے ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔

وائیلیٹ مال روڈ پر ٹریکیڑوں کی ایک غیر ملکی کمپنی میں ٹائپسٹ تھی اور گڑھی شاہو میں

ماں باپ اور دو چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی، اس کا باپ بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس نے گھر میں ایک گوریلا پال رکھا تھا جس کے ساتھ وہ سارا دن کھیلتا رہتا اور شام کو اسے گود میں اٹھا ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ سیر کرانے نکل جاتا۔ وہ سوائے دن بھر چائے پینے اور گھٹیا قسم کے سگار پھونکنے کے اور کوئی کام نہ کرتا تھا۔ وائیلیٹ کی ماں کو جب گھر کے کام دھندوں سے فرصت ملتی تو وہ تھوڑی سی مزدوری پر ارد گرد رہنے والے لوگوں کے سیدھے سادے کپڑے سیا کرتی۔ وائیلیٹ کو دفتر سے صرف دو سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ جس میں بہن بھائی کی تعلیم کے علاوہ گھر کا خرچ بمشکل چل رہا تھا۔ کسی زمانے میں اس کے باپ نے اپنے بڑے بھائی سے چھ سو روپیہ قرض لیا تھا۔ وہ گڑھی شاہو میں اپنی ایک چھوٹی سی بیکری کھولنا چاہتا تھا لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا تھا اور پوری رقم ڈوب گئی۔ وائیلیٹ ڈیڑھ سال سے بیس روپے ماہوار بالاقساط اپنے باپ کا یہ قرضہ ادا کر رہی تھی۔ جس ماہ قسط ملنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو تقاضوں پر تقاضے شروع ہو جاتے اور کوئی نہ کوئی وائیلیٹ کے دفتر میں بھی آ دھمکتا۔

وحید دوسرے تیسرے وائلٹ کو بہترین چائے کا ڈیڑھ ایک پاؤنڈ دے دیتا جسے لیکر وہ بہت خوش ہوتی اور اپنے باپ کی طرف سے بھی اس کا شکریہ ادا کرتی۔

"ابّا کہہ رہے تھے یہ چائے تو غضب کی ہے یہ کہاں سے لاتی ہو؟ میں نے کہا، ابّا! میرا ایک دوست مجھے دیتا ہے اور پھر وہ تمہارا بہت بہت شکریہ ادا کرنے لگے ... وحید اس طرح چائے لانے میں تمہارا حرج تو نہیں ہوتا۔"

"او نہیں وائل! چائے کا کیا ہے؟"

اور وائلٹ کا بھی کیا ہے۔ جب اور جس وقت اور جہاں چاہا بلا لیا، وہ بیچاری بھلا انکار کر سکتی ہے۔ چنانچہ ایک شام جب وحید نے اسے چھاؤنی کے ایک ہوٹل میں چلنے کی دعوت دی تو وہ انکار نہ کر سکی، بس میں سوار ہو کر وہ چھاؤنی پہنچ گئے۔ شام کی چائے انھوں نے ہوٹل ہی میں پی۔ وحید کو شراب سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور خاص طور سے اس نے عورت کے ساتھ مل کر کبھی شراب نہ پی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح آدمی طبعی لطف سے محروم رہتا ہے لیکن وائیلیٹ کا خیال رکھتے ہوئے اس نے ڈنر پر دو بوتلیں فرنچ سائڈر کی اور دو بیئر کی منگوائیں، کھانے کے بعد وہ

اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے ۔ وحید وائیلٹ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سگریٹ دھواں اڑا رہا تھا ۔ اور وائیلٹ کی آنکھوں میں سائیڈر اور بیئر کا مخلوط خمار سلگنے لگا تھا اور اس آواز بھاری ہو رہی تھی ۔ وہ اسے بتانے لگی ۔

"رات میں سو رہی تھی کہ گوریلا میرے بستر میں گھس آیا ۔ میں تو چیخیں مارتی بھاگ گئی ۔ حرامی ہے وہ "

وحید نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ۔

" سب حرامی ہیں ، سب گوریلے ہیں جنگل ختم ہو گئے ہیں اور جانور رہ گئے ہیں ۔ باقی سب گوریاں بھاگ گئی ہیں اور گوریلے رہ گئے ہیں ۔ سب گوریلے ہیں ۔ میں بھی گوریلا ہوں ۔ تم بھی گوریلا تمھارا باپ بھی گوریلا ہے اور گوریلا بھی گوریلا ہے ۔"

اور جوں جوں رات گہری ہوتی گئی ۔ آنکھوں میں سلگتے ہوئے خمار کے سائے بھی گہرے ہو گئے ۔ اور پھر کھڑکی کے پردے خنک ہوا کے جھونکوں میں لہرانے لگے اور وائیلٹ کا جسم ٹوٹ اور وحید کا بدن جیسے کسی نے دہکتی ہوئی بھٹی میں ڈال دیا اور پھر کمرے کی بتی ایک دم بجھ گئی گوریلا بھاگ کر وائیلٹ کے بستر میں گھس گیا اور وائیلٹ نے چیخیں مارنے کی بجائے اسے ساتھ لگا لیا اور اس سے لپٹ گئی اور گوریلا ساری رات اینگلو انڈین جنگلوں میں گھومتا رہا

وحید نے وائیلٹ کی تصویر پرے ہٹا کر ایک اور تصویر اٹھائی اور پھر ایک اور ، اور ۔ ان میں گوالن کی کوئی تصویر نہ تھی ۔ ریشم کی کوئی تصویر نہ تھی ۔ وحید نے سوچا کہ وہ قصبے سے جاتے ہوئے گوالن کی بھی ایک تصویر اتار لے گا ۔ اس نے اپنے ذہن میں اس کا ایک پوز بھی سوچ لیا ۔ وہ چھڑی ہاتھ میں لیے پتھروں پر بیٹھی ہے اور اس کے اوپر سیب کی جھکی پھلدار ٹہنیاں ہیں اور سامنے بکری چر رہی ہے ۔ یہ تصویر بڑی خوبصورت ہوگی ۔ اس تصو نیچے وہ اپنے ہاتھ سے ریشم کا نام لکھے گا اور پشت پر اس کا انگوٹھا لگوا لے گا ۔ اس کے کو ان لڑکیوں کا خیال آیا جن کی وہ تصویریں نہ لے سکا تھا ۔ مثلاً وہ دیہاتن جو رات کو ا نمبر پلیٹ فارم پر ملی تھی ۔ جسے صبح چار بجے والی گاڑی میں لائل پور جانا تھا اور جو رات ایک بجے پلیٹ فارم کے بنچ پر بیٹھی اونگھ رہی تھی ۔ وہ بھی اس کے آس پاس ہی ٹہل

رہا تھا ۔ فلم دیکھنے کے بعد یونہی سٹیشن کا ایک چکر کاٹنے اندر آ گیا تھا ، برسات کے دن تھے ۔ آسمان پہ بادل جھکے ہوئے تھے ۔ بارش شروع ہو گئی تو وہ ایک کھمبے سے لگ کر کھڑا ہو گیا ، وہ دیہاتی عورت بنچ پر سے اٹھی اور چادر سنبھالتی سامنے کھڑی گاڑی کے ایک خالی ڈبے میں گھس گئی ۔ وحید نے محسوس کیا کہ وہ بالکل نوجوان ہے ۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی اس ڈبے میں گھس گیا ۔ اندھیرے میں لیٹی ہوئی عورت کے پاس جا کر بیٹھ گیا ۔ وہ غریب ڈر گئی اور اٹھ کر بیٹھنے لگی

" لیٹی رہو ، لیٹی رہو ۔ کہاں جاؤ گی ؟"

عورت نے سہمی ہوئی آواز میں کہا " لائل پور "

" شام کی گاڑی کیوں نہیں گئیں ؟"

" وہ چھوٹ گئی تھی ۔"

" کوئی بات نہیں ۔ میں بھی اسی گاڑی میں جا رہا ہوں ۔"

عورت خاموشی سے اکٹھی ہو کر لیٹ گئی ۔ وحید ٹیک لگا کر اور ٹانگیں سامنے والی سیٹ پر پھیلا کر بیٹھ گیا ۔ بارش تیز ہو گئی اور بجلی رہ رہ کر کوندنے لگی ۔ ڈیڑھ گھنٹہ بعد وحید اس دیہاتی عورت کے لیے کچھ کھانے کو لینے باہر نکلا ۔ کیونکہ عورت نے اسے بتایا تھا کہ وہ دوپہر سے بھوکی ہے سٹیشن سے باہر آ کر اس نے زور سے تھوکا اور اپنے گھر کی راہ لی ۔

پھر وہ پھولے پھولے کپّا سے گالوں والی سعیدہ ․․․․ جو اس کے ماموں کی شادی پہ آئی ہوئی تھی اور اپنی دوسری سہیلیوں کے ساتھ ڈھولک پہ منہ پھیلا کے گا رہی تھی ۔

وے میں کھلے دی پا ئی آں دھار

لے لے ناں تیرا ، ہلے ناں تیرا

اور جب وہ میز پوش اور چائے دانی لینے اس کے کمرے میں آئی تھی تو اس نے اسے بھوکے بلے کی طرح وہیں دبوچ لیا تھا اور تھوڑی دیر بعد باہر بھاگ گیا تھا ۔

اور مسز شیخ ․․․ شیخ علی احمد لیدر مرچنٹ کی بیوی ․․․ جس کا گھران کے پلے مکان کے ساتھ ہی تھا ، جو ہر وقت زیور میں لدی رہتی تھی اور کھڑکی میں کھڑی ہو کر بازار کی سیر دیکھا کرتی تھی جو وحید کو چھپ چھپ کر ملا کرتی تھی اور آدھی آدھی رات کو اس کی گود میں سیڑھیوں میں بیٹھ کر اپنے

خاوند کی محبت کے گُن گایا کرتی تھی۔

"وہ بہت اچھے ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ خدا انھیں ہمیشہ زندہ رکھے۔ میں ان کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی۔ مجھے ان سے بڑی محبت ہے، اتنی محبت میں نے کبھی کسی سے نہیں کی"

اور پھر بڑے پیار سے وحید کا مُنہ چوم لیا کرتی تھی۔

وحید ان سب عجیب و غریب لڑکیوں، عورتوں کو یاد کر کے دل ہی دل میں ہنس دیا۔ تصویریں اکٹھی کر کے لفافے میں ڈالیں۔ لفافے کو سوٹ کیس میں سنبھال کر رکھا اور کوٹ پہن کر رات کا کھانا کھانے ہوٹل میں آ گیا۔

دوپہر ایک بجے وحید دفتر سے آیا اور کھانا کھا کر سو گیا۔

چار بجے کے قریب وہ اٹھا۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور چائے پی کر چمبہ گلی کی طرف چل پڑا۔ دو اڑھائی میل کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ بڑے نالے کے پُل پر پہنچ کر بیٹھ گیا اور ثوان کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ قصبے سے واپس آ رہی ہوگی اور یہاں سے مل کر وہ باؤلی تک کا باقی رستہ پیدل طے کریں گے۔ وحید کتنی ہی دیر وہاں بیٹھا رہا مگر ثوان کی خچر کہیں دکھائی نہ دی۔ شہر سے آنے والے لوگوں کے دو تین قافلے ٹٹوؤں پر سوار پُل پر سے گزرے۔ ٹٹوؤں اور خچروں پر بیٹھے ہوئے مردوں، عورتوں اور بچوں نے بڑی دلچسپی سے وحید کو پُل کے پتھر پر بیٹھے دیکھا کیونکہ اب انھیں یقین ہو گیا تھا کہ قصبہ پنج ناگ قریب ہی ہے۔ دیکھتے دیکھتے آسمان گدلے بھورے بادلوں میں چھپ گیا اور وادیوں پر لطیف دُھند سی تن گئی۔ لوگوں کے گزر جانے پر وہاں پھر خاموشی چھا گئی۔ اور نالے میں پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر بہنے والے پانی کا دھیما دھیما شور صاف سنائی دینے لگا۔ دور پہاڑیوں کے اوپر بجلی کی چمک اور ہلکی سی گرج سنائی دی۔ وحید وہاں سے اٹھا اور چمبہ گلی.... ریشم کے گاؤں کی طرف چلنے لگا۔ جس وقت وہ باؤلی پر پہنچا، بادل آہستہ سے گرجا اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ وحید نے کوٹ کے کالر اوپر چڑھا لیے اور پریشان سا ہو کر اخروٹ کے گنجان درخت تلے بیٹھ گیا، اس نے وقت دیکھا۔ شام کے سوا پانچ بج رہے تھے۔ اور باغ میں شام کے اولیں مرطوب سائے اترنے لگے تھے۔ آدھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ جب وہ بالکل ناامید ہو کر واپس مڑنے لگا تو کہیں قریب ہی پتوں پر کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دی اور ساتھ ہی کسی کے

کڑے کھنکھنائے۔ وحید نے کان کھڑے کر کے گھور کر درختوں میں دیکھا اور تھوڑی ہی دیر بعد اس کے سامنے ریشم چلی آ رہی تھی۔ وہ قدرے بدحواس تھی۔ قریب آ کر وہ خوفزدہ ہرنی کی طرح سمٹ کر کھڑی ہو گئی اور سانس درست کرتے ہوئے بولی۔

"بڑی مشکل سے آئی ہوں۔ آج باپو خود دودھ لے کر چلا گیا اور ماں مجھے آنے ہی نہ دیتی تھی۔ اس نے مجھے کام میں لگا دیا۔ بڑی مشکل سے سارو سے ملنے کا بہانہ بنا کر آئی ہوں۔"

"اور اگر تمھاری ماں سارو کے گھر چلی گئی تو؟"

"میں نے سارو کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ کہتی تھی تم جاؤ میں سب ٹھیک کر لوں گی۔"

"تم نے اسے کیا بتا دیا ہے گوالن؟"

"یہی کہ۔ ہیں۔"

اور ریشم کی آواز رک گئی اور وہ جلدی سے بات پلٹ کر بولی۔

"آج تو مینہ برسنے لگا ہے۔ تم کب سے کھڑے ہو، ابھی آئے ہو گے۔ ہیں؟"

وحید نے مسکرا کر ریشم کو دیکھا۔ سیاہ کپڑوں میں اس کا سانولا سا تیکھا چہرہ، کالے پانیوں تیرنے والے پھول کی طرح تھا۔ کھنچے ہوئے سیاہ بال سر کے ساتھ لگے تھے۔ اور ان میں کہیں کہیں پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ آج گوالن نے آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا اور ہونٹ اخروٹ کا داتن کرنے سے گہرے براؤن ہو رہے تھے۔ ریشم نے اپنے سیاہ دوپٹے پر سے پانی کے قطرے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"آج وہاں بیٹھتے ہیں۔"

"کہاں؟"

"وہاں، ندی کی پرلی طرف، جہاں موتیا لگا ہے۔"

جہاں موتیا لگا تھا وہاں گلاب کے جھاڑ اور چنبیلی کی بیل بھی تھی۔ یہ بیل کاہُو کے موٹے سے لپٹی ہوئی تھی۔ اور اس پر بیشمار سفید کلیاں مہک رہی تھیں۔ نیچے زمین پر بھی گری ہوئی پتیوں کا فرش سا بچھ رہا تھا۔ وہ دونوں پھولوں کی اسی سیج پر بیٹھ گئے۔ ان کے اوپر کاہُو کی گھنی شا کی لمبی چوڑی چھت پھیلی تھی۔ جہاں چوڑے چوڑے پتوں میں بارش کی بوندوں کے گرنے کی آواز

ی دیتی تھی مگر وہ ان تک نہ پہنچتی تھیں۔ پاس ہی گلاب اور موتیے کی جھاڑیوں میں کوئی جھینگر لتا تھا۔ وحید نے پوچھا "پھر بتاؤ نا گوالن۔"

"کیا"، ریشم نے بڑے بھول پن سے کہا۔

"یہی کہ تم نے سارو سے کیا کہا؟"

"ہائے کتنی چھوٹی سی بات پر اڑ گئے ہو۔ کہہ تو دیا کہ میں نے کہا تھا سارو! میں ذرا باؤلی جا رہی ہوں تم خیال رکھنا۔"

"غلط، بالکل غلط ... تم نے یہ نہیں کہا۔"

وحید بیچ میں ہی بول اٹھا اور ریشم منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ وحید نے اس کے دونوں اپنے ہاتھوں میں تھام کر پوچھا "ریشم! سچی سچی بات کیوں نہیں بتاتیں؟"

ریشم نے شرم سے تمتمایا ہوا چہرہ اٹھا کر کہا "بھئی اور کیا بتاؤں، بتا تو دیا ہے جو کہا تھا" اور وہ اپنے ہاتھ کھینچنے لگی۔ وحید نے انھیں اور مضبوطی سے تھام لیا۔

"اب یہ ہاتھ کبھی جدا نہ ہوں گے ریشم! انھیں ریشم کی ڈوری سے باندھ دیا گیا ہے۔"

"مگر۔ مگر تم تو چلے جاؤ گے پردیسی"، ریشم نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"میں پردیسی نہیں ہوں گوالن۔ میرے لیے کوئی دیس پرایا نہیں، سب دیس میرے ہیں۔ ہر جگہ رہ سکتا ہوں۔ میں یہاں بھی رہوں گا اور تمھارے پاس رہوں گا اور پھر کہیں نہ جاؤں گا۔"

"سچ؟"، ریشم نے بیتابی سے پوچھا۔

"بالکل سچ"

گوالن کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ اور وحید نے اسے بڑی نرمی سے اپنے ساتھ لگا لیا۔ م ایک دم اکٹھی ہو گئی۔ اور وحید کی آغوش میں ریشم کی گٹھڑی سی بن کر رہ گئی۔

"مجھ سے ڈرو نہیں گوالن۔ مجھے تمھاری عزت اپنی عزت سے زیادہ عزیز ہے۔ میں اس کی ے دم تک حفاظت کروں گا۔"

ریشم اسی طرح سمٹی رہی، اس کا سر وحید کے بازو سے لگا تھا۔ اس نے زمین پر بکھری ہوئی سپید پتیوں پر نظریں جما کر خشک آواز میں کہا۔

"نہ جانے مجھے کیوں ڈر سا لگتا ہے۔ میں اس روز بھی ڈر رہی تھی جب میں نے تمھیں پہلی باؤلی پر پانی پیتے دیکھا تھا اور آج بھی ڈر رہی ہوں۔"

وحید، گوالن کا کھردرا ہاتھ چوم کر بولا "تم یونہی ڈرتی ہو۔ میرا پیار چمبہ کلی کی طرح ہے گو جو صرف اس وقت مہکتی ہے جب شرمیلی دلہن کے گلے میں حمائل ہوتی ہے۔"

"سارو سے میں نے تمھارا ذکر کیا تو وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ریشی! پردیسیوں سے پیار نہ بڑھانا چاہیئے۔ وہ ایک نہ ایک دن روتا چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ لیکن میں نے اس کی بات اعتبار نہیں کیا۔ میں نے کہا "نہیں سارو! تو نہیں جانتی، وحید ایسا نہیں ہے۔ وہ مجھے رو چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

ریشم نے اپنا بھولا بھالا سانولا چہرہ اوپر اٹھا کر وحید کو دیکھا۔ وحید نے دیکھا کہ ریشم کے گہرے براؤن ہونٹ خزاں نصیب چنار کے پتے کی طرح جذبات کی آنچ میں کپکپا رہے ہیں۔ اور اس کی آنکھوں میں پہلے پیار کے ان چھوٹے شگوفے کھل رہے تھے اور ان سنے گیت بید ہو رہے تھے۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا گوالن! میں تمھیں کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ کبھی نہیں۔ یہ چمبہ کلی کے پھول اور موتیے کی کلیاں اور گلاب کے شگوفے، سیب کے درخت اور کاہو کی شاخیں اور ترنا کی بیلیں اور باؤلی کے پتھر... یہ سب میری محبت کے گواہ رہیں گے۔ جب تمھیں چھوڑنے خیال پیدا ہوگا تو میں بھاگ کر تمھارے پاس آجاؤں گا اور تم مجھے اپنے بازوؤں میں چھپا لینا اور مجھ پر اپنے بالوں کا سایہ ڈال دینا اور مجھے اپنے ساتھ لگا لینا۔ زندگی بڑی ظالم ہے گوالن بڑی تیز ہے۔ بروک بانڈ چائے سے بھی زیادہ تیز۔"

ریشم نے وحید کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا "ہاں! میں تمھیں اپنے دل میں اتار لوں گی اپنے بازوؤں میں چھپا لوں گی مسافر! اور کبھی آنچ نہ آنے دوں گی۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔"

وحید نے ریشم کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اپنے ہونٹ اس کے پکے ہوئے شہد بھرے گہرے براؤن ہونٹوں پر رکھ دیے۔ وہ دونوں پہلی بار ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے تھے وحید پہلی بار زمین سے دس ہزار فیٹ کی بلندی پر پلی ہوئی گوالن کے ہونٹ چوم رہا تھا اور ر

زندگی میں پہلی بار کسی مرد کے جسم کی حرارت اپنے بدن پر محسوس کر رہی تھی۔ وحید کی آغوش میں وہ ٹہنی پر لگے ہوئے اکیلے پتے کی طرح کانپنے لگی۔ جس نے پہلی دفعہ بہار کی ہوا کا جھونکا محسوس کیا۔ اس کا جسم پہلے ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا اور پھر دھیمے دھیمے سلگنے لگا۔ اور ایک نامعلوم لذت کے بوجھ سے دب سا گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اور سانس پھول گیا۔ وحید نے اس سے پیشتر پہاڑی شہد کبھی نہ چکھا تھا۔ اس شہد میں پکے ہوئے سیب کی طرح خوشبودار مٹھاس بھی تھی اور بے معلوم سی ترشی کا احساس بھی تھا۔ بخارا اور سمرقند سے آئے ہوئے سرخ و سپید بوڑھوں کے ساتھ ٹسٹ روم میں بیٹھ کر اس نے ترکی قہوہ خانوں میں پڑی ہوئی قسم قسم کی چائے کے مرکبات چکھے تھے لیکن جو ذائقہ، جو مہک اور جو فلیور گوالن کے ان چھوٹے ہونٹوں میں تھی۔ وہ دنیا کی کسی چائے، چائے کے کسی مرکب اور کسی شہد میں نہ تھی... دور... سمندر کی نچلی تہوں سے کہیں ریشم کی آواز سنائی دی تھی۔

"ہائے میرا دم گھٹ رہا ہے وحید!"

وحید نے آہستہ سے اپنے ہونٹ الگ کر لیے۔ ریشم کی آنکھیں بند تھیں اور سانس پھول رہا تھا اس نے اپنا سر وحید کی چھاتی سے لگا دیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کاہو کی گنجان شاخوں میں بونداباندی کا شور رک گیا تھا اور اب گل دمیں چہچہا رہی تھیں۔ کسی وقت بڑی دور سے بادل کے دھیمے دھیمے گرجنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ اندھیرا بتدریج بڑھ رہا تھا اور موتیے اور گلاب کی جھاڑیوں میں بے شمار جھینگر بولنا شروع ہو گئے تھے۔ چمبہ گلی گاؤں کی طرف سے کسی پیڑ کے ممیانے اور لکڑی کے مڈھ پر کلہاڑا چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"اب میں جاتی ہوں وحید"

"نہیں گوالن! ابھی نہ جاؤ۔"

"بابو قصبے سے آ گیا ہوگا۔ وہ پھر بگڑ جائے گا۔"

"پانچ منٹ اور رک جاؤ۔"

ریشم شرما گئی اور ہنستے ہنستے رہ گئی اور اس نے گردن جھکا لی۔

"جب تم ہنستی ہو تو تمھارے گالوں میں گڑھے بڑے خوبصورت لگتے ہیں ریشم! میں ابھی

گڑھوں میں کہیں گر پڑا ہوں اور اب ساری عمر نہیں اٹھ سکتا۔"

ریشم نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اس کے رخسار ہولے سے تھرتھرائے اور وحید نے جھک کر انھیں چوم لیا۔ گوالن دیوانوں کی طرح وحید کو تکنے لگی۔ اور وحید نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے اور کتنی ہی دیر وہاں مخموری خاموشی طاری رہی۔ جھینگر اور گلدم بھی جیسے رک کر اس مقدس خاموشی میں ڈوبے ہوئے الہامی سُروں کو سننے کی کوشش کرنے لگیں۔ وحید نے گوالن کی گردن کو بار بار چومتے ہوئے کہا۔

"ریشم! میں پاگل سا ہو رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے اپنی قمیص کے اندر چھپا لو۔ ورنہ میں اتنی خوشی برداشت نہ کرسکوں گا۔ مجھے تم سے دیوانہ وار محبت ہے۔ میں نے کبھی کسی سے اتنی محبت نہیں کی، نہ اپنے دوستوں سے، نہ اپنے بہن بھائیوں سے اور نہ اپنے آپ سے۔ میں تمھارا زرخرید غلام ہوں۔ مجھے کہو تو کہیں کوہِ سلیمان کا جگر چیر کر تمھارے قدموں پر لعل کا ڈھیر لگا دوں۔"

گوالن نے بے اختیار ہو کر اپنا ہاتھ وحید کے ہونٹوں پہ رکھ دیا۔

"ایسا نہ کہو پردیسی! میں تمھاری کنیز ہوں۔ تمھاری داسی ہوں۔ تم میرے سر کے تاج میرے جوڑے کے پھول ہو اور میرے ہار کے موتی ہو۔ تم میرے سب کچھ ہو۔ سب کچھ۔"

وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور ان کے اوپر بادل مدھم آواز میں دیر تک گرجتا رہا اور جھینگر اور گلدموں نے چہک چہک کر شور مچانا شروع کر دیا اور گاؤں کی طرف آنے والی بھیڑ کی آواز زیادہ تیز ہو گئی۔ اور ہلکی ہلکی بوندا باندی پھر شروع ہو گئی۔ اب سردی بڑھ گئی تھی اور باغ میں شام کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ گوالن نے وحید سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔

"میں جاتی ہوں پردیسی!"

"پھر کب آؤ گی ریشم؟"

"کب آؤں؟"

"کل صبح!"

"کس وقت؟"

"جب دودھ لے کر جاتی ہو۔ ذرا پہلے آجانا۔"

"اچھا۔"

وحید نے آگے بڑھ کر ریشم کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ریشم نے مخمور پلکیں اٹھا کر وحید کو دیکھا۔ اندھیرے میں چمکتی ہوئی دو آنکھیں دکھائی دیں۔ وحید اسے چھوڑنے باغ کے کنارے تک گیا۔ مینہ کی دھیمی دھیمی پھوار پڑ رہی تھی اور سردی زیادہ ہو رہی تھی۔

"تم کیسے گھر جاؤ گے؟ تمھیں سردی تو نہیں لگے گی؟ میرا دوپٹہ گلے میں لپیٹ لو۔"

وحید ہنس پڑا۔ "تم میری فکر نہ کرو ریشم۔"

ریشم باغ کی مینڈھ اتر کر ذرا پرے، نشیب میں نظر آنے والے مکانوں کے دھندلے خاکوں کی جانب روانہ ہو گئی۔ چند قدم چلنے کے بعد اسے درختوں اور سایوں نے وحید کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ وحید نے سگریٹ سلگا کر کالر اچھی طرح اوپر کیے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا قصبے کی طرف ہو لیا۔

ریشم کی ماں چھپر تلے دیے کی روشنی میں بیٹھی سوت کات رہی تھی۔ ریشم جاتے ہی چھوٹے موٹے کام دھندوں میں لگ گئی۔ اسے ڈر تھا کہ اس کی ماں اس پر ضرور برسے گی لیکن وہ زیادہ ناراض نہ ہوئی۔ اس نے قدرے ترش روئی سے صرف اتنا کہا کہ آئندہ سارو کے ہاں اگر اس نے اتنی دیر کر دی تو پھر کبھی شام کو گھر سے باہر نکلنے نہ دیا جائے گا۔ ریشم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی ماں کہیں سارو کے گھر نہیں چلی گئی تھی۔ پھر نہ جانے بیچاری سارو کو کیا کیا نہ جتن کرنے پڑتے۔ اس کی یہ سہیلی کتنی اچھی ہے اور اس کے لیے کیا کچھ کرنے کو تیار نہیں ہو جاتی۔ ریشم کا باپ گڑگڑی پیتا بیلوں کی جانب سے آنگن میں نمودار ہوا اور کھانستے ہوئے بولا

"بڑی دیر لگا دی تھی بٹیا نے؟"

"ہاں بابو۔ سارو کی ماں بھٹے ابال رہی تھی۔ پھر میں بھی بیٹھ گئی، وہ تو مجھے کتنے سارے بھٹے دے رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ماسی سویرے آ کے لے جاؤں گی۔"

"بھٹے کیا کرنے ہیں ہمیں۔ اپنے ہی ختم نہیں ہوتے۔"

بوڑھا گڑگڑی پیتا چھپر کھٹ تلے جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔
"بادل سر پہ کھڑا ہے۔ کھُل کے برسا تو جوار میٹھی ہو جائے گی۔ ہو ہو ہو۔ پالا ہو رہا۔
ریشم کی ماں سوت کا ٹوٹا ہوا دھاگہ جوڑتے ہوئے بولی۔
"اندر جا کر سو کیوں نہیں جاتے؟"
"ہو ہو۔ جیون جو گیے! اب تو ٹھنڈا ہی سونا ہے۔"
ریشم نے سارے برتن مانجھے۔ پھلدار پودوں پر بھوس کے غلاف ڈالے باپو اور ماں کے بستروں کو دوبارہ جھاڑ کر ٹھیک کیا۔ اپنے بستر کو درست کیا۔ جب کوئی کام نہ رہا تو پوچھا

"باپو! چلم بھر دوں؟"
باپو کسی سوچ میں محو تھا، چونک کر بولا "نہیں بیٹا! ابھی تو بھری ہے۔"
اتنے میں بکری کے ممیانے کی آواز آئی۔

"اسے سردی لگ رہی ہے مائے۔"
اتنا کہہ کر ریشم بھاگ کر باڑے میں پہنچی۔ بکری اسے آتا دیکھ کر سر مار مار کر اگلے کھر جھاڑنے لگی۔
"کیوں ری! تجھے نیند نہیں آتی؟"
اور پھر اس نے سنا جیسے بکری کہہ رہی تھی
"ریشم! ریشم! ریشی! آج مجھے نیند نہیں آئے گی، آج میں رات بھر جاگتی رہوں گی۔ میری آنکھوں میں خوابوں کے رنگ ہیں اور بہاروں کے گیت ہیں۔ آج میں انھیں ایک لمحے بند نہ ہونے دوں گی۔ لیکن ریشم! یہ تمھارے گال کیوں دہک رہے ہیں۔ یہ تیرے ہونٹوں سی کیا لگ رہی ہے؟

ریشم! ریشم! ریشی!!"
ریشم نے جلدی سے ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر کچھ سوچ کر شرما گئی۔ واقعی آج آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ وہ باڑے کے جنگلے سے لگ کر اندھیرے میں کھڑی ہو گئی۔ قصبہ پنج ناگ کے ٹیلوں پر مکانوں میں جلتی ہوئی روشنیوں کے جگنوؤں کو دیکھنے لگی۔ اُدھر مکئی کے کھیت میں ہریاول ہوا میں لہرا رہی تھی اور کسی وقت مینہ کی پھوار گرد کی مانند

بھرے پر اُڑسی جاتی تھی۔ وہ اپنے جسم کے ذرّے ذرّے میں پہلی محبت کی لذیذ تھکن محسوس کر رہی تھی، اس کا انگ انگ کچھ بول رہا تھا، کچھ کہہ رہا تھا۔ بکری ممیائی۔
ریشم بکری کے گلے میں باہیں ڈال کر بیٹھ گئی۔
"میری منو آج اتنی خوش کیوں ہے؟ تُو سو کیوں نہیں رہی؟"
بکری اپنی گرم گرم تھوتھنی ریشم کے گال پر رگڑنے لگی۔
"اوئی اللہ"
ریشم نے جلدی سے گال پرے ہٹا لیا اور اسے وحید کا خیال آ گیا جب پہلی بار اس نے ریشم کے رخساروں کو چوما تھا۔ ریشم نے بکری کو اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر گانے لگی:

چھمکاں نے بوڑدیاں
اَدھ وچ نہ چھوڑیں، اساں لائیاں توڑ دیاں

ابھی پو بھی نہیں پھٹی تھی کہ وحید باؤلی پر پہنچ گیا۔

اس نے لمبا سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا جس کے کالر اوپر اٹھے ہوئے تھے، پہاڑوں کی ٹھنڈی کا طلسم آہستہ آہستہ ٹوٹ رہا تھا اور وہ ستاروں کی سیج پر سے یوں گزر رہی تھی جس طرح بدمست رقاصہ رات بھر ناچنے کے بعد ٹوٹے ہوئے ہاروں کے پھول سنبھالے، قالین پر نرمی پاؤں دھرتی خوابگاہ کی طرف جا رہی ہو۔ آسمان پر اخروٹ اور خوبانی کے بلند درختوں کے او چاند وادیوں، ٹیلوں اور خاموش چراگاہوں میں اپنی ملول چاندنی کا غبار پھیلا رہا تھا۔ جھاڑیو خنک، خوشبودار سایوں میں شبنمی پھول اور کلیاں پتوں میں منہ چھپائے سو رہی تھیں: بار اوس گر رہی تھی اور پچھلے پہر کی تازہ ہوا میں کئی قسم کی خوشبوئیں رچی ہوئی تھیں۔ ہر طرف گ سکوت طاری تھا۔ اتنی سنگین خاموشی کا احساس وحید کو شہروں میں کبھی نہ ہوا تھا، شہ پوری طرح خاموش نہیں ہوتے۔ وہاں جب خاموشی کی کوئی گھڑی آتی ہے تو کہیں نہ کہیں تانگہ اپنی بے ہنگم کلپ کلوپ سے یا کوئی موٹر اپنے انجن کی گڑگڑاہٹ سے سناٹے کے چکنا چور کر دیتی ہے۔ وہاں ہر شے بولتی ہے، ہر چیز شور مچاتی ہے۔ صبح سے شام تک ا سے پھر صبح تک شور مچاتی ہے۔ ہر آدمی اونچا بولتا اور اونچا سنتا اور اونچا اڑتا ہے، شہ زمین لوگوں کے پاؤں تلے سے کھسک گئی ہے اور زمین کے ساتھ لوگوں کا جو قدیمی رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ اب کوئی کسی کا رشتے دار نہیں۔ سب ایک دوسرے کے دوست ہیں ا کو نہیں جانتا۔ پہاڑوں پر آ کر وحید نے پہلی بار اپنے پاؤں تلے زمین کی سختی، نرمی، گرمی

محسوس کی تھی، اسے پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ زمین میانی صاحب کا قبرستان ہی نہیں، سیب کا باغ بھی ہے۔ مصری شاہ میں بہنے والا گندہ نالہ ہی نہیں ہے، باؤلی کا ٹھنڈا پانی بھی ہے اور کارخانوں کی سیٹیوں کا شور ہی نہیں، نالے کی رل ترل بھی ہے۔

رل ترل... رل ترل....

قریب ہی نالے کا شفاف سرد پانی باؤلی میں جل ترنگ بجاتا گر رہا تھا۔

وحید باؤلی کے بڑے سے چورس پتھر پر بیٹھ گیا اور ریشم کا انتظار کرنے لگا۔ زرد چاندنی کا نور گھنیری شاخوں سے چھن چھن کر بھیگی ہوئی گھاس پر چمک رہا تھا۔ ہوا کا کوئی جھونکا گزرتا تو سائے کانپنے لگتے۔ اور درختوں میں میٹھی میٹھی سرگوشیاں سی ہونے لگتیں۔ پکے ہوئے لال لال سیب، درختوں پر سے توڑ لیے گئے تھے۔ رات گئے تک بارش ہوتی اور پھر بادلوں کے ایک دم چھٹ جانے سے وادیوں کے درخت دھند میں ڈوبے ہوئے تھے اور سیب کے بھیگے ہوئے پتوں میں سے تازہ تازہ کچی مہک اٹھ رہی تھی۔ بھیگے ہوئے پتوں پر سے شبنم کی بوندیں باؤلی کی سطح پر ترپ ترپ کی آواز میں گر رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد وحید کو باغ میں خچر کے چلنے کی آواز سنائی دی وہ پتھر پر سے اٹھا اور جدھر سے آواز آ رہی تھی اس طرف قدم اٹھا کر چلنے لگا۔ سامنے درختوں کے بیچوں بیچ پتلی سی پگڈنڈی پر ریشم خچر کی باگ تھامے چلی آ رہی تھی۔ ہلکی ہوا اور بھیگی چاندنی میں اس کے آنچل کا کنارا لہرا رہا تھا۔ کمر کے گرد اس نے رسی باندھ رکھی تھی اور کندھوں پر کمبل ڈال رکھا تھا۔

پاس آ کر اس نے مسکراتے ہونٹوں اور مسرت سے چمکتی آنکھوں سے وحید کو دیکھا اور وحید نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ ریشم نے اپنا رخسار وحید کے کندھے پر رکھ دیا۔

"تم نے بہت دیر کر دی گوالن!"

"نہیں تو... بلکہ ابھی تم قصبے جانے کا وقت بھی نہیں ہوا!"

ریشم نے قدرے کانپتی آواز میں کہا۔ وحید نے کمبل اچھی طرح اوڑھا کر کہا۔

"آج سردی ہے!"

"ہاں! بارش جو ہوئی تھی"

ریشم کے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ وحید انھیں دبانے لگا۔

"لاؤ انھیں گرم کر دوں"

"مگر تمھارے بھی تو ٹھنڈے ہیں"

"دونوں کے گرم ہو جائیں گے"

دونوں نے عجیب نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے۔

"آؤ ریشم! کل والی جگہ پر بیٹھتے ہیں"

"چلو"

اس کے ساتھ ہی گو ان کے دل میں کسی نامعلوم خطرے کا احساس لحظہ بھر کے لیے جاگا پھر سو گیا۔ وحید نے خچر کو ایک درخت سے باندھ کر ریشم کو آہستہ سے بازوؤں میں اٹھایا اس درخت کے نیچے لے آیا جس کے تنے پر چنبہ کلی کی بیل چڑھی ہوئی تھی اور جس کے پھولوں سے دلہنوں کو سجایا جاتا ہے اور ان کے لیے گجرے تیار ہوتے ہیں اور سہرے گوندھے جاتے۔ وحید کی گود میں سمٹی ہوئی گو ان خچر کے آگے سے گزری تو بے زبان جانور نے آنکھیں اٹھا کر بار اپنی مالکن کو رحم بھری نگاہوں سے دیکھا اور سیب کی ٹہنیوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر گو ان کو روکنے کی کوشش کی۔ ریشم! ریشم! ریشی! کہاں جا رہی ہو؟ کدھر جا رہی ہو؟ واپس آ جاؤ۔ شہر کے لوگ پہلے بازوؤں میں اٹھاتے ہیں اور پھر پتھروں پر پھینک دیتے ہیں اور تمھارا جسم زخمی ہو جائے گا اور خون بہنے لگے گا۔ ریشم! تم بہت نازک ہو۔ تم دودھ اور مکھن سے بنائی گئی ہو۔ شہر والے دودھ میں پانی ملا دیتے ہیں۔ ریشی! ریشی! آج اس طرف نہ جاؤ۔ واپس آ جاؤ۔ واپس آ جاؤ! مگر ریشم تک ان کی آوازیں نہ پہنچ سکیں۔ ریشم ان سے بہت دور جا چکی تھی۔ اس کے کان بند تھے اور ان پر وحید کے بوسوں کے تالے پڑے تھے اور آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنا چہرہ، شگوفوں ایسا چہرہ، مسافر کے مضبوط بازوؤں میں چھپائے کوہِ سلیمان کی بلندیوں پر اڑ رہی تھی۔ اور جموں کے مرغزاروں میں سو رہی تھی۔ اور آرزو کی مہکتی بیلوں میں الجھ گئی تھی۔ آج کوئی ریشی واپس نہیں آئے گی۔ آج تک کبھی کوئی ریشی واپس آئی۔ کبھی واپس نہیں آئی۔

کاؤ کے درخت تلے پہنچ کر وحید نے آہستہ سے ریشم کو گھاس پر بٹھا دیا اور خود اس کے ساتھ درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"شڑاخ شڑاخ"

کوئی جانور گلاب کی جھاڑیوں میں پھڑپھڑایا اور اڑ کر اوپر درختوں میں گم ہو گیا۔ ریشم ڈر کر ایک دم اکٹھی ہو گئی اور وحید کے ساتھ لگ گئی۔

"کوئی نہیں... جانور تھا"

آدھی رات کو جنگلوں میں جانور ہی ہوتے ہیں۔ وہاں مہذب انسان کا کیا کام؛ اور اگر کوئی انسان پہنچ جائے تو وہ بھی حیوان بن جاتا ہے۔ جانور بننے میں بہت فائدے ہیں۔ انسان جہاں چاہے اڑ کر جا سکتا ہے۔ ابھی کاؤ کی شاخ پر ہے تو ابھی سیب کی ٹہنی پر جھول رہا ہے ابھی چشمے پر پانی پی رہا ہے تو ابھی وادیوں پر اڑا جا رہا ہے اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ چمبہ جا سکتا ہے۔ جموں، کشمیر، تبت، سمرقند اور بخارا جا سکتا ہے اور کوئی اس سے پرمٹ نہیں مانگے گا اور کوئی کسٹم آفیسر اسے تنگ نہیں کرے گا۔ آدمی جانور سے زیادہ تیز اڑتا ہے لیکن وہ کہیں اڑ کر نہیں جا سکتا۔ اس کے پاؤں میں زنجیر ہے، گلے میں زنجیر ہے، دماغ میں زنجیر ہے۔ وہ ایک مسلسل زنجیر ہے جو آسٹریلیا سے آئس لینڈ اور جاپان سے واشنگٹن تک پھیلی ہوئی ہے۔

"تمھاری محبت نے مجھے زنجیر ڈال دی ہے ریشم!" وحید نے کہا

"وہ کیسے بھلا؟" ریشم نے کمبل کھول کر اپنے اور وحید کے کندھوں پر پھیلاتے ہوئے پوچھا

"بس۔ یہاں سے جانے کو دل ہی نہیں چاہتا"

ریشم نے بے اختیار ہو کر وحید کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم کبھی نہ جانا پردیسی نہیں تو..." وہ چپ ہو گئی۔ وحید نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

"نہیں تو کیا...؟"

اور ریشم نے کانپتی آواز میں آہستہ سے کہا "نہیں تو میں باؤلی میں کود کر جان دے دوں گی"

"پاگل"

وحید نے ہنستے ہوئے ریشم کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

"بھلا میں تمھیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ تم.... جو میرے جسم کا پھول اور میری روح کی مہک ہو
جس کی محبت نے میرے دل میں مسرتوں کے چراغ روشن کیے ہیں۔ تمھیں میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں
تم ریشم نہیں، ابریشم ہو۔ ابریشم کی اَٹی ہو۔ اور یہ وہی اَٹی ہے جس کے عوض حضرت یوسفؑ
خریدا گیا تھا۔"

تمھیں چھوڑ کر چلے جانا، نخلستانوں کو چھوڑ کر تپتے صحراؤں میں بھٹکنے کے برابر ہے۔ میں بڑ
مدت کی آوارہ گردی کے بعد چشمے پر پہنچا ہوں۔ اب یہاں سے کبھی واپس نہ جاؤں گا۔"

ریشم، وحید کے ساتھ لپٹ کر رونے لگی۔

"کبھی نہ جانا۔ کبھی نہ جانا وحید...."

وحید اسے پیار سے تھپتھپانے لگا۔

"کبھی نہیں... کبھی نہیں جاؤں گا ریشی! میری ریشی!"

اور اس نے ریشی کو.... اپنی ریشی کو اٹھا کر گود میں بٹھا لیا اور اس کے اوپر کمبل ڈال
اور وہاں ایک دم اندھیرا ہوگیا۔ چاندنی غائب ہوگئی۔ کاؤ، اخروٹ اور سیب کے درخت
میں چھپ گئے اور بادل کی گرل نرل کہیں ڈوب گئی اور گہری تاریکی اور خاموشی میں مسافر نے
گوالن کے ہونٹوں، رخساروں، کانوں، گردن اور گردن کی دھڑکتی ہوئی گرم رگوں کو چوم
مکمل تنہائی اور اندھیرے میں وہ ایک دوسرے کے اور قریب... اور بھی قریب آگئے اور دو
ہاتھ بلقیس کی پنڈلیوں، سعیدہ کے بازوؤں اور وائیلیٹ کے سینے پر پھرنے لگا اور ان کے
پھول گئے اور حلق خشک پڑنے لگے اور مسافر نے گوالن کی کمر کے گرد بندھی ہوئی رسی کھول
اور گوالن کے بدن میں کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی۔ گوالن کچھ نہ بولی۔ ریشم نے کچھ نہ کہا۔ عورت
کچھ نہ کہا اور پھر تمام بندھی ہوئی چھوٹی رسیاں کھل گئیں اور گوالن کے ہونٹ بند رہے۔ و
رہی۔ اس نے کوئی حرکت نہ کی اور اندھیرا بڑھتا گیا۔ تاریکی گہری ہوتی گئی۔ اور چاند پتوں کی
چھپ گیا اور منہ اندھیرے کی ہوا میں جھولتی ٹہنیاں گوالن کو پکارتی رہیں۔ "ریشم! ریشم
چلی گئی ہو؟ کہاں جا رہی ہو؟ واپس آجاؤ، واپس آجاؤ۔" لیکن کوئی گوالن واپس نہ آئی کہ
مُڑ کر نہ دیکھا اور صبح ہوگئی اور مشرقی آسمان پر سحر کا نور مسکرانے لگا۔ اور سورج کی پہلی

ریشم کو قصبہ پنج ناگ کے بازار میں دودھ بیچ کر گھر کی طرف لوٹتے دیکھا۔ آج اس کے چہرے
پر اداسی اور انوکھی مسرت تھی۔ آج اس کے چہرے پر پھول اور آنسو تھے۔ آج اس کے جسم کا ہر خم
کوئی کہانی کہہ رہا تھا اور وہ خاموش تھی۔ آج وہ ہر کسی سے کچھ نہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر آج اس نے
کسی سے کوئی بات نہ کی تھی، آج اسے اپنے کنوار پنے کا شدید احساس تھا اور اس کی آنکھیں حیا کے
بوجھ سے جھکی جھکی، دبی دبی سی تھیں۔ خچر پتھریلی سڑک پر سر نیہوڑائے حسب معمول قدم قدم چل رہا
تھا۔ اور ریشم اس پر طلسمی سپنوں کے ان موتیوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو اس کے گلے سے ٹوٹ کر تھنوں
پر بکھر گئے تھے۔ اسے اپنے شانوں پر کسی کے بازوؤں کا لطیف جھکاؤ محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ
سیب کی پھلدار ٹہنیاں اپنے کندھوں پر رکھے گھر لیے جا رہی ہو۔ وہ خچر پر بیٹھی تھی لیکن وہ خچر کے
آگے بتی خمدار پہاڑی سڑک پر ناچتی گاتی اچھلتی کودتی جا رہی تھی۔ اس کے کپکپاتے ہونٹوں پر
شرمیلی مسکراہٹوں کی تھرکن تھی اور آنکھوں میں ندامت کے چمکیلے موتی... وہ آج جی بھر کر ہنسنا
چاہتی تھی اور آج جی بھر کر رونا چاہتی تھی۔ صبح کی تصویر رہ رہ کر اس کی آنکھوں میں ابھر رہی تھی۔
اور وہ اپنے آپ سے لجا رہی تھی، شرما رہی تھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہوا ہو۔ اتنی
اچھی، اتنی بُری بات کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی رسی کبھی زہریلا ناگ بن کر پھنکارنے
لگتی اور کبھی چنبیلی کی بیل میں تبدیل ہو جاتی.... جو کاؤ کے درخت پر چڑھی تھی اور جس پر
سپید سپید پھول چٹک رہے تھے جو صبح کی خوشگوار ہوا میں جھوم رہی تھی اور جس کی چھاؤں میں وہ
وحید کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی اور درختوں کی الجھی ہوئی شاخوں میں سے جھانکتے ہوئے نورانی
تاروں کو دیکھ رہی تھی۔

گھر پہنچ کر ریشم کو ہر چیز اپنی طرف گھورتی محسوس ہوئی جیسے وہ کوئی اجنبی ہو اور بغیر اطلاع
گھر میں داخل ہوگئی ہو۔ ریشم ہر شے سے آنکھیں چرا رہی تھی۔ ہر شے سے اپنا آپ چھپا رہی تھی۔
باڑے میں خچر باندھتے ہوئے دُم کٹی بھینس نے بڑے بڑے ڈیلے اٹھا کر اسے دیکھا اور منہ پھیر کر
جگالی کرنے لگی۔ بکری ذرا سی ممیا کر خاموش ہوگئی۔ ریشم آنگن میں چلتے ہوئے سہم رہی تھی۔ نہ جانے
کیوں اس بات کا اسے یقین سا ہو رہا تھا کہ اگر وہ ماں کے سامنے گئی تو وہ اس کے منہ پر تھوک
دے گی اور دھکے مار کر گھر سے باہر نکال دے گی۔ باڑے میں کھم کے ساتھ لگی وہ دیر تک سوچتی رہی

اور سوچ سوچ کر فیصلے کرتی رہی۔ ایکا ایکی آنگن سے اس کی ماں کی آواز آئی۔

"ریشی! مینا کو باندھ کر کہاں مر گئی ہو۔؟"

ریشم کا دل دھڑکنے لگا۔

"آئی مائے!"

اور وہ بھاگ کر آنگن میں آ گئی۔ اس کی ماں بھٹے ابال رہی تھی اور آگ پر رکھے ہوئے مٹی کے دیگچے میں سے بھاپ لہرا لہرا کر نکل رہی تھی۔

"ذرا سارو کے ہاں سے ہر نولی کا تیل تو لانا۔"

ریشم کی ماں نے دیگچے میں لکڑی ہلاتے ہوئے کہا۔

"ابھی لائی ماں!"

اتنا کہہ کر ریشم سیڑھیوں پر سے اچھلتی سارو کے گھر کی طرف بھاگ گئی اسے خوشی ہوئی تھی کہ اس کی ماں کو کسی بات کا علم نہ تھا اور وہ اسی طرح تھی جس طرح روز ہوتی ہے۔ سارو گھر پر نہیں تھی وہ ڈھور لے کر جنگل گئی ہوئی تھی۔ ریشم نے اس کی ماں سے تھوڑا سا تیل مٹی کی پیالی میں ڈلوایا اور اپنی ماں کو لا کر دے دیا۔ اس کے بعد وہ بھی بھینسوں کی رسیاں کھول انھیں آگے آگے ہنکاتی جنگل میں لے آئی۔ سارو ٹنگ کے پیڑ تلے اکیلی بیٹھی پھٹے ہوئے کمبل کی مرمت کر رہی تھی۔ ریشم دوڑ کر اس کے پاس گئی اور اس سے لپٹ گئی۔

"ہائے تو گھر پر کیوں نہیں تھی۔ میں تمھارے گھر سے آ رہی ہوں۔"

سارو مسکراتے ہوئے بولی "گھر پر سوائے ماں کے اور کوئی نہ تھا۔ تمھارا ابھی کہیں پتہ نہ چلا بس میں جانور لے کر یہاں آ گئی۔"

"میں بازار گئی ہوئی تھی، ابھی آئی ہوں۔"

ریشم، سارو کے پاس پاؤں پھیلا کر گھاس پر بیٹھ گئی۔ دن بڑا چمکیلا اور صاف ستھرا تھا دو دن کی لگاتار بوندا باندی کے بعد سبزہ نکھر گیا تھا اور دھوپ میں چمک رہا تھا۔ ریشم سارو کو بہت کچھ بتانا چاہتی تھی لیکن ہر بار کچھ کہتے کہتے رک جاتی تھی۔ کوئی بات ... کوئی بڑی دلچسپ بات اور پُراسرار بات اس کی زبان تک آتے آتے رہ جاتی تھی۔ اچانک سارو نے پو

"مسافر کا سناؤ، پھر ملا؟"

ریشم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے سارو کو ہر بات کا پتہ چل گیا ہے اور وہ یونہی اس سے بھید چھپا رہی ہے۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیر کر کہا۔

"بس کل ہی ملا تھا۔ سڑک پر تھوڑی دیر کے لیے۔"

سارو خاموش ہو گئی اور کمبل الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

"اور تم سناؤ فیروز کا کوئی خط آیا؟"

سارو نے ایک جگہ کمبل میں سوئی چبھوتے ہوئے کہا۔

"اس کا خط مجھے کیوں آنے لگا؟ میں تو اس کی بیرن ہوں نا۔ اپنی ماں کو لکھتا

ریشم اپنی شلوار کا پائنچہ ذرا سا اوپر کر کے اپنی نرم نرم پنڈلی کھجلانے لگی۔

"مگر سارو! مرد ایسے کیوں ہوتے ہیں؟ کیا سبھی مرد ایسے ہوتے ہیں؟"

وہ پوچھنا چاہتی تھی کیا مسافر بھی ایسا ہی نکلے گا؟ کیا وہ بھی ایک دن شہر چلا جائے گا اور خط نہ لکھے گا۔ اور اس کی خبر تک نہ لے گا اور اسے بھول جائے گا۔ چمبہ گلی اور سیب کے باغ اور بادل... اور اس کے چمکیلے پھولوں کو بھول جائے گا۔

"ہاں ریشی! یہ مرد سبھی ایسے ہوتے ہیں۔ یہ بھونروں کی طرح ہر کلی پر منڈلاتے ہیں، اس کا رس پیتے ہیں اور جب سیر ہو جاتے ہیں تو اڑ کر دوسری کلی پر جا بیٹھتے ہیں۔ یہ روپ اور رنگ کے لوبھی ہیں اور جب تک تمھارے گالوں پر رنگ اور ہونٹوں میں رس ہے، یہ تمھیں اپنی محبت کا یقین دلاتے رہیں گے اور جونہی تمھارے گالوں کا رس اڑا، یہ بھی اڑ جائیں گے۔"

"مگر سارو... سبھی تو ایسے نہیں ہو سکتے۔ میرا مطلب ہے اگر سبھی مرد ایک ایسے ہیں تو پھر ہمارے باپ دوسری شادیاں کیوں نہیں کرتے؟"

سارو ہنسنے لگی۔

"کیا پتہ ہمارے باپ کتنی شادیاں کر چکے ہیں؟"

ریشم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کتنی شادیاں؟ اری آج تو کیسی باتیں کر رہی ہے۔ پھر ہمارے باپ اپنے پہلے بچے کہاں

چھوڑ آئے ہیں؟"

سارو دانتوں سے دھاگہ کاٹ کر بولی۔

"یہ تمھیں کس نے کہا ہے کہ شادی ہو تو بچہ بھی ضرور ہوتا ہے۔"

"پگلی۔ اولاد کے لیے تو آدمی شادی کرتا ہے اگر اولاد نہ ہو تو پھر شادیاں کیوں ہوں؟"

سارو مسکرائی۔

"تم نری بدھو ہو رشو! جن شادیوں کا میں ذکر کر رہی ہوں یہ چھپ چھپا کر ہوتی ہیں اور یہ بچے پیدا کرنے کے لیے نہیں ہوتی، بلکہ اگر بچہ پیدا ہو جائے تو قیامت آجاتی ہے۔"

ریشم بت سی بن کر سارو کو تکنے لگی۔ اسے اپنی شادی کا خیال آگیا۔ اس کے کانوں میں کسی نومولود بچے کے رونے کی آواز آئی۔ وہ کانپ گئی۔

"لیکن سارو! کیا بچہ ضرور ہو جاتا ہے؟"

"ضرور تو نہیں... اگر ذرا خیال رکھا جائے تو کبھی نہیں ہوتا۔"

خیال.... ریشم سوچنے لگی۔ اس نے تو کوئی خیال نہیں رکھا تھا بلکہ اسے تو کوئی خیال ہی نہ تھا، شاید وحید نے خیال رکھا ہو۔ وحید نے ضرور خیال رکھا ہوگا۔ اسے ریشم کا بہت خیال ہے اس پر جان دیتا ہے۔ بھلا وہ یہ کیونکر برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی رشی پر کوئی مصیبت نازل ہو جائے۔ اس نے ضرور کچھ نہ کچھ خیال رکھا ہوگا اور ریشم پر کبھی کوئی مصیبت نہیں آئے گی، وہ آپ کو ایکا ایکی بڑا ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ گویا کسی نے اس کا بوجھ اتار کر زمین پر رکھ دیا۔ وہ جی ہی جی میں خوش ہونے لگی کہ اس نے سارو کو صبح کے حادثے کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ اگر وہ بتا دیتی تو کس قدر شرمسار ہوتی اور پھر اس میں بتانے والی بات ہی کیا تھی۔ یہی نا کہ وہ وحید سے محبت کرتی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور انھوں نے ایک دوسرے کو وہ کچھ دیا ہے جس کے وہ حقدار تھے اور اس میں کوئی بری بات نہ تھی۔ کوئی بری بات نہیں۔ ریشم کا چہرہ محبت میں سب کچھ لٹا دینے کے بلند جذبے سے تمتمانے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ ہر شے سے لپٹ کر اس پر محبت کا راز فاش کر دے۔ اس نے سارو کو شانوں سے پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا۔ سارو کھلکھلائی اور اس کے کانوں کا ایک بندہ گھاس پر گر پڑا۔

"اری رشی! کیا ہو گیا ہے؟"

ریشم نے بندہ اٹھایا اور بلند آواز میں گاتی ہوئی بھاگ گئی۔

"اِک کُڑی دی چیز گواچی، بھلکے چیتا آوے گا"

دوپہر کو باؤلی پر اپنی دوسری سہیلیوں کے ساتھ کپڑے دھوتے ہوئے ریشم بار بار نظریں چرا کر دور نالے کے پاس کاؤ کے موٹے تنے کو دیکھ لیتی تھی۔ جو اوپر تک چنبیلی کی بیل میں چھپا ہوا تھا۔ اور اس کا چہرہ بار بار سرخ ہو رہا تھا۔ شام کے وقت قصبے سے واپس آتے ہوئے اس نے باؤلی سے ذرا ہٹ کر مسافر کا انتظار کیا لیکن وہ نہ آیا۔ ریشم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ گھر کی طرف چلنے لگی۔ گھر کے آنگن میں داخل ہو کر اس نے بچھڑے کو باڑے میں باندھا اور اپنی بکری کے گلے میں باہیں ڈال کر اپنے آپ ہنس دی۔

ساری رات ریشم نے بستر پر کروٹیں بدلتے گزار دی۔

اسے شام کو وحید سے نہ ملنے کا رنج بھی تھا اور پریشانی بھی۔ اسے اپنے آپ وہم سا ہو رہا تھا کہ مسافر اب اسے کبھی نہیں ملے گا۔ اس نے قصبہ پنج ناگ کے پہاڑوں اور گھاٹیوں کی جی بھر کر سیر کر لی ہے۔ اور اب واپس اپنے شہر چلا جائے گا۔ کسی وقت اسے اپنے بوڑھے ماں باپ کے بے داغ انجان پنے کا خیال آتا اور اسے محسوس ہوتا جیسے وہ بچھی ہوئی سفید چادر پر کیچڑ بھرے پاؤں لے کر چل رہی ہو۔ اور اسے اپنے تئیں باؤلی کنارے گری ہوئی گلی سڑی خوبانی کا گمان ہوتا اور اس کا دماغ نفرت اور گناہ کی آگ میں جھلسنے لگتا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ کبھی کا خیال مسافر... وحید کی نشہ آور میٹھی میٹھی باتوں کی طرف چلا جاتا اور وہ اس کی پُرمحبت آواز بالکل اپنے قریب سنتی اور اس کا گرم سانس اپنے چہرے پر محسوس کرتی۔ پھر چاند کا رُخ چھتناروں سے جھانکتا اور گلاب کی جھاڑیوں میں بولتے والے جھینگروں کی آوازیں، باؤلی کی رل ترل میں ڈوب جاتیں اور ریشم کے چہرے پر ابھرتے سورج کی سحر طراز سرخی جھلکنے لگتی۔ رات بھر وہ متضاد خیالات کی ڈوبتی ابھرتی لہروں پر ڈولتی رہی۔ کسی وقت کوئی ناگ اپنا پھن پھیلائے پانی پر تیرتے ہوئے اسے سُرخ سُرخ خوفناک آنکھوں سے دیکھتا گزر جاتا۔ اور کبھی کوئی نازک کنول اس کا منہ چوم کر لہروں کے سینے پر آگے نکل جاتا۔ کبھی اس کا دل ڈوب کر اسے چارپائی پر برف کی ٹھنڈی سِل کی طرح چھوڑ جاتا اور کبھی وہ کمسن بچے کی طرح خود بخود ہنسنے لگتی اور شرما کر دانتوں سے کمبل کے کنارے کاٹنے لگتی۔

صبح ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی پہاڑوں پر صحت مند اور چمکیلے دن کا آغاز ہوا۔ ریشم کو رات پچھلے پہر کہیں نیند آئی تھی۔ چنانچہ وہ باپو کے کئی بار ہلانے جُلانے پر اٹھی۔ منہ ہاتھ دھو کر حسبِ معمول دودھ بھرے ولٹوہے خچر پر لادے اور قصبے کی جانب روانہ ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ مسافر ضرور اس کا انتظار کر رہا ہو گا۔ مگر باؤلی پر سوائے صبح کی اداس ہواؤں اور درختوں کی سہمی ہوئی سرگوشیوں کے اور کچھ نہ تھا۔ دور تک اخروٹ کے درخت تلے سائے گہرے تھے اور وہاں کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ریشم افسردگی سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے وہاں سے چل دی۔ واپسی پر بھی اسے وحید نہ ملا۔ سارا دن اس نے بڑی بے چینی سے کاٹا۔ وہ دن میں کئی بار باؤلی پر گئی اور ناامید ہو کر واپس آئی۔ شام کو جب وہ قصبے سے واپس آتے ہوئے سیب کے باغ ہی سے گزری تو اس نے سامنے سے وحید کو آتے دیکھا۔ وحید اس کے قریب آ کر رک گیا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ریشم کو یوں لگا گویا وہ اسے ایک طویل مدت بعد دیکھ رہی ہو۔ وہ خچر سے کُود ی، اور بھاگ کر وحید سے لپٹ گئی۔

"تم نہیں گئے نا مسافر، تم نہیں ہو نا؟ تم کبھی نہ جانا وحید۔ کبھی نہ جانا۔"

اور اس کی آنکھوں میں آنسو اُبل پڑے۔ وحید اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے دلاسہ دینے لگا۔

"ریشی! تم خواہ مخواہ رونے لگتی ہو۔ سچ میں کبھی نہ جاؤں گا۔"

ریشم منہ بنا کر پرے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ "تو پھر اتنے دن کہاں رہے؟"

"اتنے دن؟ ارے میں تو ابھی کل تمھیں ملا ہوں۔"

"کل صبح ملے تھے نا، دوپہر کو کیوں نہیں آئے اور پھر شام کو بھی نہیں آئے اور آج بھی غائب رہے... جاؤ! میں تم سے نہیں بولوں گی۔"

وحید نے ہنستے ہوئے ریشم کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

"مگر تم میری بھی تو سنو۔"

"کیا سنوں؟" ریشم نے منہ پھلا کر پوچھا

"میں تمھیں اس وقت بھوپ کلیان کا خیال بھی سنا سکتا ہوں مگر نہیں سناؤں گا اور یہی

کہوں گا کہ ریشم! ریشی! ریشے! سنہری ریشے! میں کام میں بڑا مصروف ہوں۔ بس اسی لیے نہیں آسکا۔"

"تو چائے بیچنا بھی کوئی کام ہے؟"

"اور دودھ بیچنا تو بہت بڑا کام ہوگا۔"

"کیوں نہیں۔ تمھیں اگر منہ اندھیرے اٹھ کر دودھ دوہنا پڑے اور دن میں دو بار قریبی سڑک کا چکر کاٹنا پڑے تو نانی اماں یاد آجائے۔"

وحید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن مجھے تو سڑک کے چکر کاٹے بغیر ہی نانی اماں بہت یاد آتی ہے۔ ریشم ہنسنے لگی اور اس کا سارا غصہ رفو چکر ہوگیا۔ وحید نے اس کے شانے پر آہستہ ہاتھ رکھا اور اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے بعد وہ دونوں قدم قدم چلتے گاؤں کے گھنے درخت کے آکر گھاس پر بیٹھ گئے۔ رات کی سرگوشیاں کرتے آویں پُراسرار اندھیروں میں وحید نے ریشم کو میں دیے سے جلتے دیکھے۔ اسے ریشم کا چہرہ پہلے بلقیس، پھر وائیلیٹ اور پھر سعیدہ کے میں ڈھلتا دکھائی دیا۔ وہ ریشم سے لپٹ گیا اور اس نے بلقیس کے ہونٹ چوم لیے اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

اس شام سیب کی جھکی ہوئی شاخوں نے ریشم کو پھر آوازیں دیں، اسے اپنے پاس بلایا ریشم تک ان کی ایک بھی آواز نہ پہنچی۔ اس نے کچھ بھی نہ سنا۔ وہ صرف ایک آواز سن وہ صرف ایک گیت کی لَے پر ناچ رہی تھی اور صرف ایک خدا کے حضور میں سجدہ ریز تھی جب نے سر اٹھایا تو شام گہری ہوگئی تھی اور درختوں پر پرندوں کا شور مدھم پڑ گیا تھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا

"سانجھ ہوگئی ... میں جاتی ہوں۔"

اس کے بعد ہر روز سانجھ ہوتی۔ درختوں پر پرندوں کا شور مدھم ہوجاتا۔ سیب کی شاخیں ریشم کو آوازیں دیتے تھک کر سو جاتیں اور ریشم جلدی جلدی مسافر سے جدا ہو کر گھر چلی جاتی بستر پر بیٹھے لیٹے ہر رات کبھی اپنے آپ ہی شرما کر مسکرانے لگتی۔ اور کبھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ذہن کی اس دھوپ چھاؤں کے متعلق اس نے سارو سے کوئی بات نہ کی تھی۔ اس کے

دو عورتیں ایک دوسری سے جھگڑ رہی تھیں۔ ایک وہ جو اسے وحید کی ہر بات ماننے پر اکساتی، اسے وحید کی بھرپور محبت کا احساس دلاتی اور وحید کی ہر پھیکی بات میں شوخ اور گہرا رنگ بھر دیتی اور دوسری وہ عورت تھی جسے ریشم کا ہی نہیں بلکہ اس کے بوڑھے ماں باپ کا بھی خیال تھا۔ جو وحید سے، ریشم سے اور اس کے گھر کی ہر شے سے برابر کی محبت کرتی تھی۔ جو اسے وحید کی تصویر کے ساتھ ہی ایک بوڑھی عورت کی تصویر بھی دکھاتی جو آنگن میں خوبانی کے درخت تلے بیٹھی آٹا پیس رہی ہوتی۔ جس کے اکثر بال سفید ہوتے اور ماتھے پر پسینہ آیا ہوتا۔ ریشم یہ تصویر دیکھ کر کانپ سی جاتی اور اس کے سارے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی۔ دوسرے ہی لمحے وحید کی تصویر پھیل کر بوڑھی عورت کی تصویر پر چھا جاتی اور ریشم جیسے اطمینان کا گہرا سانس لیتی۔ ریشم کے بستر پر لیٹتے ہی ہر رات یہ دونوں عورتیں اس کے سرہانے ایک دوسری کے مقابل کھڑی ہوجاتیں اور ریشم کو اپنی طرف بلانے لگتیں۔ ہر رات ریشم دوسری عورت کی آغوش میں آنکھیں بند کرتی اور پہلی عورت کی باہوں میں آنکھیں کھولتی۔ سونے سے پہلے وہ پختہ فیصلہ کرتی کہ صبح وحید کے ساتھ گاؤں کے درخت تلے بیٹھ کر باتیں نہیں کرے گی۔ اور ہر صبح جب وحید اس کے شانوں پر اپنا گرم ہاتھ رکھ کر آہستہ سے دباتا تو ریشم کے ارادوں پر چڑھا ہوا ملمع دیکھتے دیکھتے پگھل جاتا۔ اور وہ لکڑی کی پتلی کی مانند اپنے مالک کے اشاروں پر ناچنے لگتی۔ اس کے باوجود اس کے دل میں اپنے مجرم اور گنہگار ہونے کا احساس گہرا ہوتا جارہا تھا اور وہ گھر میں اپنی ماں، اپنے بوڑھے باپ اور اپنی سہیلیوں سے آنکھیں چار کرتے گھبرانے لگی تھی جیسے وہ اپنی جیبوں میں چوری کا مال چھپائے پھر رہی ہو۔

دو ماہ گذر گئے۔ تیسرا مہینہ ختم ہو رہا تھا کہ ایک دن ریشم پریشانی کی حالت میں بستر پر سے اٹھی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور وہ ہر کام خود فراموشی کے عالم میں کر رہی تھی۔ وہ کئی دنوں سے اس رات کا، اس دن کا انتظار کر رہی تھی جب اسے کچھ ہونا چاہیئے تھا، جو مہینے میں ایک آدھ بار ہر عورت کو ہوتا ہے، جس کے ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مگر جس کے نہ ہونے سے بہت کچھ ہوتا ہے۔ ریشم کو کچھ نہیں ہوا تھا اور اس کا رنگ اڑ گیا تھا اور چہرہ آنے والے کسی بھیانک حادثے کے خوف سے ایک دم زرد پڑ گیا تھا۔ دو دن سے وہ وحید کو بھی نہیں مل سکی تھی۔ وحید پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا تھا۔ ریشم اپنے آپ کو اکیلا اکیلا تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کرنے لگی

جیسے وہ قافلے سے بچھڑ کر سنسان جنگل میں اکیلی رہ گئی ہو۔ رات ہو گئی ہو، اور جنگل میں رہ کر درندوں کی کپکپی طاری کر دینے والی دھاڑیں گونجنے لگی ہوں۔ اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟ یہ ایک سوال تھا جو سرخ بتی کی طرح اس کے ذہن میں بھڑک رہا تھا اور جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ یہ سوال ریشم کو کئی ایک خوفناک تصویریں دکھاتا اور وہ سہم کر اکٹھی ہو جاتی۔ وہ اس سوال کا جواب وحید اور صرف وحید سے چاہتی تھی۔ وہ صرف اسی کو اپنے دل کا راز کہہ سکتی تھی۔ اس کے سوا ریشم کو ہر آدمی ہر عورت اپنی جانب تیز تیز نگاہوں سے گھورتی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بڑی بیتابی سے دن نکلنے کا انتظار کرنے لگی۔ خچر پر دودھ لاد کر وہ باؤلی پر جا کر اتر پڑی اور سیب کے باغ میں وحید کو پاگلوں کی طرح تلاش کرنے لگی۔ مگر وحید وہاں نہیں تھا۔ ریشم نا امید ہو کر قصبے کی طرف چل دی۔ قصبے کے بازاروں میں بھی اس نے ہر آدمی کو غور سے دیکھا۔ لیکن وحید اسے کہیں دکھائی نہ دیا۔ سارا دن اس نے بڑی بے چینی اور خوف سے گذارا۔ شام ہوئی۔ ریشم دوسری مرتبہ دودھ لے کر اوپر چلی۔ بڑے نالے کے پل پر اس نے وحید کو جنگلے پر جھکے پانی کی لہروں کا نظارہ کرتے دیکھا۔ وہ لپک کر اس کی طرف گئی۔ وحید اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور انگلیوں میں دبا یا ہوا سگریٹ جھاڑ رہا تھا۔

"میں باؤلی پر جا رہا تھا۔"

ریشم کچھ نہ بولی۔ وہ وحید کی طرف ہرنی کے اس بچے کی طرح دیکھتی رہی جو راستہ بھول کر کئی دنوں کی دربدری کے بعد اپنی ماں کی آغوش میں پہنچ گیا ہو۔

"چلو ریشی! وہاں سائے میں چلتے ہیں۔"

اس نے ریشی کے خچر کی لگام تھامی اور ریشم کو ساتھ لے کر ایک چھوٹی سی چٹان کی اوٹ میں چیڑ کے ایک پر سکون جھنڈ تلے آ گیا۔

"آج کتنا دودھ بکا ہے؟ کتنا پانی ڈالا تھا؟"

ریشم بدستور چپ تھی اور وحید کے بازو سے لگی غمزدہ آنکھوں سے زمین پر اُگی ہوئی ہری گھاس کو تک رہی تھی۔

"آج تمھیں کیا ہو گیا ہے گوالن؟"

وحید نے ریشم کا چہرہ اوپر اٹھا کر کہا۔ ریشم کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

"ارے۔ رونے کیوں لگیں؟ میں نے کوئی بری بات تو نہیں کر دی گوالن!"

اور گوالن اپنا چہرہ وحید کے بازوؤں میں چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ وحید اس کے کانپتے ہوئے شانوں پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

"مگر مجھے بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟ باپو نے کچھ کہا ہے؟ کہیں جا رہی ہو؟"

ریشم دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی "کہیں نہیں جا رہی وحید!"

"تو پھر یہ آنسو کیوں؟"

"یہ آنسو یونہی آ گئے ہیں، یونہی آ گئے تھے۔"

وحید نے ریشم کا اداس چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ ریشم کے آنسو اور اس کا زرد چہرہ دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا تھا اور اس کے دل میں کئی ایک شبہات بیدار ہو رہے تھے۔

"ریشی! تمھیں میری قسم ہے۔ سچ سچ بتاؤ۔ بات کیا ہے؟ یقین کرو تمھارے لیے اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔"

ریشم پھٹی پھٹی آنکھوں سے وحید کو تک رہی تھی۔ اسے یوں لگا گویا وہ ایک آدمی کی پناہ میں آ گئی ہے جو آدھی دنیا کا مالک ہے اور جو اس کے لیے پہاڑوں سے نہریں کھود کر لا سکتا ہے۔ وہ کہنے لگی، بہت کچھ کہنے لگی اور کہتے کہتے رک گئی۔ اور اس کا حلق ایک دم خشک ہو گیا۔ اور الفاظ کہیں ریت میں جذب ہو کر رہ گئے۔

"بولو۔۔ بولو ریشی۔۔۔ ڈرو نہیں۔"

ریشم بے اختیار ہو کر وحید سے لپٹ گئی۔ اور اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور اترا ہوا پژمردہ چہرہ وحید کے کندھے پر رکھ کر بولی۔

"اگر مجھے کچھ ہو گیا تو۔۔۔ تو مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے مسافر؟"

"کبھی نہیں۔۔۔ کبھی نہیں گوالن۔"

"تو۔۔۔ تو مجھے کچھ ہو گیا ہے وحید۔"

"کیا ہو گیا ہے؟" وحید نے ذرا چونک کر پوچھا۔

"بہت کچھ"

"بہت کچھ کیا؟"

"وہی۔۔۔ جس کے ہونے سے کبھی شادیانے بجتے ہیں اور کبھی لڑکیوں کو زہر دیدیا جاتا

"تو کیا؟"

"ہاں" ریشم نے آہستہ سے کہہ کر آنکھیں بند کرلیں۔ وحید کی پیشانی سکڑ گئی اور ا لمحے کے لیے اس کا ذہن یوں خالی سا ہو گیا جیسے ہوا میں معلق ہو۔ لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گ ریشم کو آہستہ سے دباتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"پھر کیا ہوا ریشی! میں جو تمھارے پاس ہوں، تمھارے ساتھ ہوں۔ میں تمھیں چھوڑ کر تھو جا رہا ہوں۔ میں نے تم سے ہمیشہ ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا اور اس وعدے پر ہمیشہ ق رہوں گا۔ میں جانتا تھا کہ نتیجہ یہی نکلے گا اور میرا خیال تھا کہ تم بھی جانتی ہو گی۔ لیکن خیر ابھی نہیں بگڑا۔ ابھی نتیجہ پوری طرح نہیں نکلا اور اس سے پیشتر کہ نتیجہ مرتب ہو ہمیں اسے کر دینا چاہیئے۔"

"ضائع؟" ریشم نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں ضائع کر دینا چاہیئے۔ وہ اس لیے کہ یہی اس کا علاج ہے۔ اسی طرح ہر بات ہو سکتی ہے۔ ذاتی طور پر میں اس چیز کے خلاف ہوں۔ ایک ایسی شے کو مار ڈالنا جو اب میں نہیں آئی، بڑی ظالمانہ حرکت ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو اس میں کسی کا نقصان بھی نہیں۔ شے کا اور نہ اس دنیا کا۔"

"مگر وحید کسی کو خبر ہو گئی تو میں اپنا گلا دبا لوں گی۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ اس کی خبر تمھیں بھی نہ ہو گی۔ میں کل ہی شہر جاتا ہوں تاکہ ان کا بندوبست کر سکوں جو یہاں نہیں مل سکتیں۔"

ریشم وحید سے لپٹ گئی۔

"نہیں نہیں۔ تم نہ جاؤ مسافر، تم نہ جاؤ۔ میں یہاں اکیلی رہ جاؤں گی۔ یہ لوگ مجھے آ کھڈ میں گرا دیں گے۔ مجھے ہلاک کر دیں گے۔"

وحید پیار سے ریشم کے سیاہ بال سہلانے لگا۔

"پاگل نہ بنو ریشی! یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں۔ تمھیں ہمت سے کام لینا پڑے گا۔ اگر تم ذرا گھبرا گئیں تو بنا بنایا کھیل بگڑ کر رہ جائے گا اور تمھارے ساتھ میں بھی دنیا کو منہ دکھانے کے قابل دوں گا۔"

"لیکن وحید اگر تم واپس نہ آسکے تو۔۔۔ تو پھر کیا ہوگا؟"

وحید ہنس پڑا۔

"ارے! میں واپس کیوں نہ آؤں گا؟ کیا مجھے اپنی گوالن سے محبت نہیں؟ کیا مجھے اس کا خیال ہے! میں تو چٹکی بجاتے میں واپس آجاؤں گا۔ کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔ پرسوں صبح لاہور کر ایک دن میں دوائیاں خرید کر اسی شام واپس آجاؤں گا۔"

ریشم، وحید کے سینے پر سر رکھ کر سوچنے لگی۔ بہت کچھ سوچنے لگی۔ وحید نے چٹان سے لگاتے ہوئے پاؤں پھیلا دیے۔ ایک پتھر اس کے پاؤں سے ٹکرا کر لڑھکتا ہوا پرلی جانب میں گر پڑا۔ نیچے وہ دو تین پتھروں سے ٹکرایا اور پھر کوئی آواز نہ آئی۔ ریشم کا دل ڈوب سا اسے یوں لگا جیسے اس پتھر کی طرح ایک دن وہ بھی کسی کی پاؤں کی ٹھوکر سے لڑھکتی گہرے کھڈ میں جا گرے گی۔ اور دو تین المناک چیخوں کے بعد ہر شے خاموش اور چپ جائے گی گویا وہاں صدیوں سے کچھ نہیں ہوا۔ جہاں وہ بیٹھے تھے وہ جگہ چٹان کے سائے میں اور درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور آسمان پر بادل کے آخری ٹکڑوں کا رنگ زرد، گلابی اور سرخ ہو کر سرمئی ہو رہا تھا۔ وحید نے ریشم کو اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کمر کے گرد بندھی ہوئی رسی ٹٹولتے ہوئے بولا۔

"ریشی! یہ رسی اتنی کس کر مت باندھا کرو۔"

ریشم شرما گئی اور اس نے وحید کے گرم ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ پھر شام ہو گئی اور چیڑھ کے جنگلوں تلے اندھیرا زیادہ گہرا ہو گیا اور چٹان کے اوپر بیٹھا ہوا پرندہ پر تول کر اوپر اڑا، اور آسمان کے سرمئی دھندلکوں میں گم ہو گیا۔

دوسرے دن وحید نے اپنا سامان خچر پر لادا اور وہاں سے چل دیا۔

ریشم کا خیال تھا کہ وہ اسے منزل کر جائے گا۔ صبح صبح وہ باؤلی پر کتنی دیر بیٹھی وحید کا انتظار کرتی رہی لیکن وہاں سے کوئی نہ گزرا۔ جب گاؤں کے دوسرے گوالے اور گوالنیں خچروں پر دودھ لادے پگڈنڈی پر سے گزرنے لگیں تو ریشم نا امید ہو کر اٹھی۔ خچر پر بیٹھی اور قصبے کی طرف چل پڑی شاید وحید منہ اندھیرے ہی چلا گیا تھا۔ وہ بڑی جلدی شہر پہنچنا چاہتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ وہ یہ سب کچھ اس کے لیے کر رہا ہے، ریشم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے تصور میں اپنا سر وحید کے سینے پر رکھ دیا اور سسکیاں بھرتے ہوئے کہنے لگی۔

"مجھے معاف کر دو وحید! میں تمہاری کنیز ہوں۔ میں تمہارے لائق نہیں۔ تم میرے لیے کتنی تکلیف اٹھا رہے ہو۔ میں تو کچھ بھی نہیں..... کچھ بھی نہیں"۔

جس روز وحید کو آنا تھا، ریشم نے بالوں میں چنبے کی کلیاں سجائیں اور باؤلی پر جا کر بیٹھ گئی جب وہ تھک گئی تو سڑک پر آ کر مسافر کی راہ تکنے لگی۔ پتلی بل کھاتی پہاڑی سڑک تھوڑی دور جا کر ایک ٹیلے کے عقب میں گھوم گئی تھی۔ شام کی سیاہی پھیلنے لگی۔ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں آ گئے اور چرواہے ڈھور ڈنگر لیے گھروں کو لوٹنے لگے۔ لیکن وحید نہ آیا۔ ریشم افسردہ چہرہ لیے واپس روانہ ہو گئی۔ سیب کے باغ میں سے گزرتے ہوئے جوڑے کی کلیاں ایک بڑھی ہوئی جھاڑی سے الجھ کر گر پڑیں۔

ریشم انہیں اٹھانے کے لیے جھکی تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

ایک ہفتہ گزر گیا لیکن وحید واپس نہ آیا۔

ریشم ہر روز صبح شام باؤلی پر اس کا انتظار کرتی۔ سڑک کنارے ٹیلے پر کھڑے ہو کر بہت دیر ویران پتھریلی سڑک اور دور شہروں کی طرف پھیلی ہوئی مٹیالی دھند کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہتی۔ کسی وحید کا مسکراتا ہوا چہرہ اور لہراتا ہوا گلوبند سڑک کے موڑ پر نمودار نہ ہوتا۔ کوئی مسافر ریشم۔ میری ریشی کہتا ہوا لپک کر اسے گلے نہ لگاتا۔

اس کا دل ہر وقت اداس رہنے لگا۔ جوں جوں دن گزر رہے تھے اس کی تشویش بڑھ رہی تھی اور ذہنی پریشانیوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پندرہ بیس دن گزر گئے مگر مسافر شہر سے واپس نہ آیا۔ ریشم نے کبھی نہ سوچا تھا کہ وحید شہر جا کر اسے بھلا دے گا۔ وہ اب بھی ایسا نہیں سوچ

یقین تھا کہ وحید کو کوئی ضروری کام آ پڑا ہے۔ جونہی کام ختم ہوا، وہ دوائیاں لے کر ہوا کے نی پر سوار ہو کر چنبہ گلی پہنچ جائے گا۔ ہر روز گھر کے گرد رسی باندھتے ہوئے اسے خواہ مخواہ یوں محسوس ا جیسے رسی چھوٹی ہوتی جا رہی ہو اور وہ کانپ کانپ جاتی۔ اس کا چہرہ زرد ہو جاتا اور ہونٹ ٹک ہو جاتے۔ خاموشی و تنہائی کے ان لمحات میں جب چنبہ گلی کے سب مکان نیند میں ڈوبے تے اور تاروں کی مدھم روشنی میں پرسکون چراگاہوں میں اوس سی گر رہی ہوتی۔ ریشم کے دل ایک چھپا ہوا سہما ہوا خیال رینگنے لگتا۔

"اگر مسافر نہ آیا تو.....؟"

وہ اپنے جسم کی پوری طاقت لگا کر اس بھیانک خیال کو اپنے دل سے باہر پھینک دینا چاہتی تھی۔ ن وہ ہر بار ناکام رہتی۔ وحید کے نہ آنے کا احساس اسے زیادہ سے زیادہ پریشان رکھنے لگا۔

دوپہر کو باؤلی پر کپڑے دھوتے ہوئے وہ بوڑھی عورتوں کے سامنے آتے ہوئے گھبراتی، ر اپنی سہیلیوں سے آنکھ چرا کر بات کرتی۔ گھر میں اپنی ماں سے کوئی بات کرتے ہوئے اسے پسینہ آتا اور اسے یوں لگتا جیسے اس کی ماں کی نگاہیں اس کے جسم میں کسی شے کو ٹٹول رہی ہیں، ڈھونڈ رہی ں کسی ایسی شے کو جو بڑی خوفناک ہے اور جس کے ظاہر ہو جانے سے باؤلی کا پانی سوکھ جائے گا بہ گلی کی بیل مرجھا کر سمٹ جائے گی اور ان کے گھر میں آگ لگ جائے گی آگ..... جس کے شعلے کی نیلی اور اس کی ماں کے آنچل اور اس کے بوڑھے باپ کی پگڑی اور آنگن والے خوبانی کے درخت آن کی آن میں بھسم کر دیں گے۔ وہ بے سمجھ تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ گویا س نے کسی مقدس خانقاہ کے تعویذ میں جڑا ہوا لعل چرا کر نگل لیا تھا۔ وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی ی، اور وہ اسے ہضم بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اور اس کا زہر آہستہ آہستہ اس کے جسم میں سرایت کر تا تھا۔ صرف ایک دوست، ایک درخت ایسا تھا جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر وہ اپنے جسم کے ارے پھول سارے داغ گن سکتی تھی، اپنی روح کے سارے نوحے پڑھ سکتی تھی۔ لیکن وہ درخت نی چھاؤں سمیٹ چکا تھا، اپنے سارے پتے جھاڑ چکا تھا۔ وہ دوست اسے باؤلی کے پتھر دل ور پہاڑوں کی سنسان گھاٹیوں میں اکیلی چھوڑ کر اپنے دیس چلا گیا تھا۔ اور شاید اسے کبھی چنبہ گلی واپس نہیں آنا تھا۔

پھر کیا ہوگا؟ پھر وہ کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی؟

ریشم! ریشم! اگر وحید نہ آیا تو کیا ہوگا؟ تو کہاں جائے گی؟ پھر تیرا سارا ریشم میلے اور کھرد سوت میں تبدیل ہو جائیگا۔ تیرا سورج گہن میں چلا جائے گا اور تیری وادیوں میں پھیلی ہوئی سنہ دھوپ دھواں بن جائے گی اور تجھ پہ گاؤں کے سب دروازے بند ہو جائیں گے اور تو کہیں نہ جا گی، کسی سے بات نہ کر سکے گی۔ تیری سہیلیاں تجھ سے کنی کترائیں گی۔ تیری ماں تجھ سے ہمکلام ہوتے شرمائے گی۔ تیری ننھی بکری نیلی بھی تجھے دیکھ کر منہ موڑ لیا کرے گی۔ تو باؤلی پر جب کپڑے جائے گی تو وہاں بیٹھی ہوئی عورتیں تجھے دیکھ کر وہاں سے اٹھ جایا کریں گی اور یوں تیرا ریشمی خارش زدہ بلی کا جسم بن جائے گا جسے کوئی بھی اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دے گا۔ جس سے ہر دور بھاگنے کی کوشش کرے گا۔

ریشم راتوں کو چونک چونک اٹھتی۔

پھر اسے نیند نہ آتی۔ وہ پہروں ایسی باتیں سوچا کرتی اور خوف سے اس کا حلق خشک اور ہونٹ کپکپانے لگتے۔ اسے محسوس ہوتا کہ اس کے دماغ میں بھیانک شکلوں والے بھوت نا ہیں۔ اور اگر وہ کچھ دیر اور سوچتی رہی تو اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر دبا لیتی اور تکیے کے نیچے سر دے کر آنکھیں بند کر لیتی۔ لیکن نیند کہاں تھی؟ شاید وہ بھی وحید ساتھ ہی شہر چلی گئی تھی۔

ایک دن باؤلی پر سارو کو اکیلا دیکھ کر ریشم کو ایکا ایکی یوں محسوس ہوا کہ دنیا میں صرف یہ لڑکی بچی ہے جو اس کی غمخوار ہے اور اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتی ہے اور اگر اس نے سار اپنا بھید، دردناک بھید بتا دیا تو اس کا دماغ پھٹنے سے بچ جائے گا، اس کا سارا بوجھ ز گر پڑے گا اور وہ سکھ کا سانس، گہرا اور لمبا سانس لے سکے گی۔

وہ بھاگ کر دیوانوں کی طرح سارو سے . . . . اپنی سہیلی سے لپٹ گئی اور روتے سسکیاں بھرتے ہوئے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو وہ سوائے وحید کے اور کسی کو نہ بتا تھی۔ سارو نے بڑے ٹھنڈے دل سے سب کچھ سنا اور ریشم کو اپنے سینے سے لگا کر اسے تس دیتے ہوئے خود بھی رونے لگ پڑی۔

دوسرے دن وہ ریشم کو ساتھ لے کر قصبے کے بڑے بازار میں پہنچی اور وہاں سے پتا پوچھتی چائے کمپنی کے دفتر میں آگئی۔ جب انھوں نے سٹول پر بیٹھے ہوئے پہاڑی چپڑاسی سے پوچھا کہ اس کمپنی کا مالک کہاں ہے؟ تو چپڑاسی نے بیڑی بجھا کر پرے پھینک دی اور ریشم اور سارو کو باری باری سر سے لے کر پاؤں تک گھورنے لگا۔

"مالک تو ولایت میں ہیں"

سارو نے بڑے تعجب سے ریشم کو دیکھا اور چپڑاسی سے بولی۔

"لیکن وہ تو تھوڑے دن ہوئے یہیں تھے"

چپڑاسی ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "لیکن وہ تو ولایت سے کبھی باہر نہیں نکلے"

"مگر وہ کون تھے؟"

"وہ کون؟"

"وہی جو یہاں آئے ہوئے تھے اور تھوڑے دن ہوئے واپس گئے ہیں"

چپڑاسی کلاہ کے نیچے اپنا سر کھجلانے لگا اور ہنس پڑا۔

"تو تم لوگ وحید بابو کو ڈھونڈ رہے ہو؟"

ریشم جلدی سے بولی "ہاں ہاں . . . انھی کو . . . وحید بابو کو"

اور اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا اور سارو کی اوٹ میں ہو گئی اور انگلیاں چٹخانے لگی۔

"وہ شہر چلے گئے اور وہ مالک نہیں سیلز مین ہیں"

"وہ کب آئیں گے؟"

"اب تو برف شروع ہونے والی ہے۔ اب کہاں آئیں گے"

ریشم کو جیسے دھکا سا لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چپڑاسی کے پاؤں پکڑ لے اور گڑگڑا کر کہے۔ خدا کے لیے ایسا نہ کہو۔ کہو کہ وہ بہت جلد آجائیں گے۔ بہت جلد آجائیں گے۔ انھیں اب تک آجانا چاہیے تھا۔ شاید آج شام آجائیں . . . مگر چپڑاسی بڑے آرام سے سٹول پر بیٹھا اور ریشم

کی طرف سر منہ لگی بھوکی آنکھوں سے تک رہا تھا۔ ریشم کا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا۔ کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ اس نے ایک دم پوچھا۔

"شہر کا دفتر کہاں ہے؟"

چپڑاسی زرد دانت نکال کر ہنس پڑا۔

"لاہور والا دفتر؟"

"ہاں ہاں . . ."

وہ ٹھنڈی سڑک پر ہے . . . بڑی مال روڈ پر ہے، لیکن تم وہاں جا کر کیا کرو گی؟"

ریشم نے سارو کا ہاتھ پکڑا اور اسے باہر لے آئی۔

وہ دونوں اپنے اپنے خچروں پر بیٹھی گاؤں واپس آ رہی تھیں۔ اردگرد جھاڑیوں اور گھنے باغوں میں اندھیرا سا پھیل رہا تھا اور شام کی خنکی آ رہی تھی۔

"اس کا پتا لے کر کیا کرو گی۔ وہ تمہیں کہیں نہ مل سکے گا۔ اس نے تمہیں فریب دیا ہے۔ سبھی مرد فریبی ہوتے ہیں۔ وہ بھونروں کی طرح کلیوں کا رس چوستے ہیں اور رس چوس کر اڑ جاتے ہیں۔"

خچر قدم قدم چل رہے تھے اور ان کے کھر سڑک پر بجری سے ٹکرا کر کلوپ کلپ، کلوپ کلپ کی آواز پیدا کر رہے تھے۔ شام کی سرخی میں آسمان پر پرندوں کی قطاریں اپنے اپنے رین بسیروں کو اڑی جا رہی تھیں۔ ریشم بڑی اداس تھی۔ اس کا ہر وقت شگفتہ رہنے والا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ اس پرندے کی مانند تھی جسے شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں اپنا گھر نہ مل رہا ہو اور جو سرمئی دھندلکوں میں ادھر ادھر بھٹک رہا ہو۔ سارو کی باتیں اسے جیسے بڑی دور سے سنائی دے رہی تھیں۔ جب اس نے کہا کہ وحید نے اسے فریب دیا ہے اور وہ اسے کہیں نہ مل سکے گا تو اس کا دل سمٹ سا گیا اور وہ سارو کی طرف منہ پھیر کر بڑے اداس لہجے میں بولی۔

"ایسا نہ کہو سارو۔ تم وحید کو نہیں جانتیں۔ وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ مجھے بہت چاہتا ہے۔ وہ مجھے کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ کبھی نہیں۔"

سارو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے سوچتی رہی۔ ریشم بھی خاموش ہو گئی اور خچر سڑک کی پتھریلی ڈھلان پر اپنا راستہ طے کرتے گئے۔ ریشم اپنے آپ کو منوانا چاہتی کہ وحید ضرور واپس آئے گا۔ وہ اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر کبھی نہیں جا سکتا۔ لیکن جانے کیا بات تھی کہ ریشم کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ وحید اس کی خبر لینے پھر واپس آئے گا۔ مگر وہ سارو سے کہتے ہوئے گھبراتی تھی۔ اس میں صرف اس کی ہی نہیں۔ اس کی محبت کی بھی توہین تھی۔ وہ کسی کو یہ نہ بتا سکتی تھی کہ اس کے کانوں میں سجے ہوئے بُندے نقلی ہیں اور ان کے سارے نگینے جھوٹے ہیں۔ وہ کیسے کہہ سکتی تھی کہ ان کے آنگن میں جو پیڑ ہے اس پر لگے ہوئے رنگین پھولوں میں کوئی خوشبو نہیں، کوئی مہک نہیں۔ اسے تو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ پھول بھی بن مہک کے ہو سکتے ہیں جن کی پتیوں پر اس کی محبت کے نشان ہوں اور جن کی ٹہنیوں میں اس کے گرم سانس کا لمس ہو۔ خچر بجری کے چھوٹے چھوٹے پتھروں پر قدم اٹھاتے چلے جا رہے تھے۔ پہاڑی نالے کا چھوٹا سا پل عبور کرتے ہوئے ریشم نے گہرا سانس بھرا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا

"اب کیا ہو گا؟"

سارو نے کہا "جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

ریشم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"نہیں میری سہیلی! وہ مجھ سے نہ دیکھا جائے گا۔ وہ کسی سے نہ دیکھا جائے گا۔ اس سے پہلے کہ جو ہونا ہو وہ ہو۔ میں نالے میں کود کر جان دے دوں گی۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ کہیں بہت دور . . . اتنی دور کہ میری موت میرے باپو اور میری ماں کی زندگیوں کو آلودہ نہ کر سکے گی۔"

ایک چمگادڑ چیختا ہوا ان کے اوپر سے گزر گیا۔ ریشم سہم گئی اور اسے وحید کا خیال آ گیا اور شام کے اندھیرے میں وہ گھٹ گھٹ کر روتی گئی . . . روتی چلی گئی۔

وہ رات اس کے آخری فیصلے کی رات تھی۔ اسے یقین سا ہو چلا تھا کہ وحید دوائیاں لے کر کبھی نہ آئے گا اور اگر وحید نہیں آئے گا، اگر دوائیاں نہیں آئیں گی تو پھر ریشم اس گاؤں

میں کیسے رہ سکے گی؟ پھر تو اس کی ماں زہر کھا لے گی اور بوڑھا باپ نالے میں کود کر جان دے دے گا۔ ریشم کا بے داغ دیہاتی ذہن زندگی میں پہلی بار ایسی باتیں سوچنے لگا، جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہ سوچی تھیں۔ یہ نئے خیالات سیاہ ماتمی لبادوں میں ملبوس تھے اور قطار اندر قطار خاموش کھڑے تھے۔ ریشم ان چہروں کو پہلی بار دیکھ رہی تھی اور ان کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ پہاڑی رات کی دل گداز خاموشی میں وہ گردن تک کمبل میں گھسی، آنکھیں کھولے چھت کو تک رہی تھی اور دور . . . اوپر قصبے کی جانب کسی کتے کے بھونکنے کی ہلکی ہلکی آوازیں سن رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کتا نہیں بلکہ قصبہ پنج ناگ ہے، جو ریشم سے کہہ رہا ہے۔ بھاگ جا . . . بھاگ جا . . . بھاگ جا . . . نہیں تو میں تجھے کھا جاؤں گا . . . تیرے بابا، تیری بکری نیلی اور تیرے خوبانی کے پیڑ کو کھا جاؤں گا . . . بھاگ جا! بھاگ جا!!

تمام رات ریشم نے ایک عجیب عالم میں بسر کی۔

کبھی وہ کمبل پرے پھینک کر چارپائی پر گھٹنے جوڑ کر بیٹھ جاتی اور آنگن کے پار گہرے نیلے کھلے آسمان پر چمکنے والے ستاروں کو تکنے لگتی اور کبھی کمبل میں گٹھڑی سی بن کر لیٹ جاتی اور منہ میں کپڑا لے کر ہولے ہولے سسکیاں بھرنے لگتی۔ آنگن والے چھپر کھٹ تلے وہ بالکل تنہا تھی۔ دو بار اس نے اٹھ کر گھڑے میں سے ٹھنڈا پانی پیا، مگر اس کا گرم گرم ذہن پھر بھی کھول رہا تھا۔ قریب ہی کسی گھر سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ یہ آواز بند کوٹھڑی میں سے نکل رہی تھی۔ ریشم ایک دم چونک اٹھی۔ اسے یوں معلوم ہوا گویا یہ آواز اس کے اندر سے آ رہی ہو، جیسے وہ کوئی بہت بڑا پہاڑ ہو اور اس کی کھوہ میں کوئی نومولود بچہ رو رہا ہو۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ کسی غیر معمولی طاقت کے زیر اثر کمبل پرے پھینک کر اٹھی۔ کلائیوں والے موٹے کڑے اور گلے کی ہنسلی اتار کر کونے والی لکڑی کے صندوق میں بند کی اور الگنی پر لٹکی ہوئی سیاہ چادر اوڑھی۔ کمبل تہ کر کے بغل میں دبایا۔ ایک ہاتھ میں جوتے تھامے، دوسرے ہاتھ سے شلوار کے پائنچے اٹھائے، سنبھل سنبھل کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی، گھر کے پچھواڑے بیلے میں آ گئی۔ اندھیرے میں اسے ہر

شے صاف صاف دکھائی دے رہی تھی۔ بھینسیں لکڑی کے جنگلے کے ساتھ لگی جگالی کر رہی تھیں۔ اس کی پیاری بکری نیلی اپنے تھنوں میں تھوتھنی چھپائے سو رہی تھی۔ خچر کھڑی تھی اور جیسے کسی سوچ میں گم تھی۔ ریشم کو احاطے میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک بھینس نے گردن گھما کر اسے دیکھا اور پھر دوسری بھینس کے پیٹ پر سر رکھ کر جگالی میں مشغول ہو گئی۔ نیلی بڑی گہری نیند میں تھی۔ اسے ریشم کے آنے کی بالکل خبر نہ ہوئی۔ ریشم نے جھک کر اس کے ملائم جسم پر ہاتھ پھیرا اور اس کا سر آہستہ سے چوم لیا۔ پھر اس نے خچر پر اپنا کمبل اچھی طرح کسا اور اس کی لگام ہاتھ میں لے کر بڑی احتیاط سے قدم قدم چلتی مکان کی دوسری طرف سے کھیتوں کھیتوں ہو کر شہر جانے والی سڑک پر آ گئی۔

سڑک پر کوئی نہ تھا۔ وہ سنسان اور ویران تھی۔ چیڑھ کے درخت ڈھلان پر قطاروں میں چپ چاپ کھڑے تھے اور پچھلے پہر کی نیند بھری ہوا کے نرم جھونکوں میں ان کے نوکیلے جھوم دھیرے دھیرے سرسرا رہے تھے۔ دور اوپر قصبہ پنج ناگ کے ٹیلوں پر کہیں الاؤ روشن تھا جس کے شعلے نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ صرف درختوں میں روشنی کا غبار سا چمک رہا تھا۔ سڑک کنارے کھڑے ہو کر ریشم نے اپنے نیچی نیچی چھت والے مکان کو دیکھا جو تاروں کی نیلگوں روشنی میں بجھا بجھا سا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے اس گھر کے تمام باسی پردیس جا چکے ہوں اور اس کے دروازوں پر تالے پڑے ہوں اور تالوں پر مکڑیوں نے جالے بُن دیے ہوں۔ ریشم کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ابھی ابھی اس مکان سے نکل کر آ رہی ہے اور وہ اس مکان کی ایک اندھیری کوٹھڑی میں رہتی ہے اور اب کبھی وہاں نہ جائے گی۔ پھیکے پھیکے اندھیرے میں صحن میں اُگا ہوا خوبانی کا پیڑ اسے اپنی طرف بانہیں پھیلائے نظر آیا۔ جیسے اسے واپس بلا رہا ہو۔ پھر اس نے ایک بوڑھے کی آواز سنی جو کسی سوئی ہوئی لڑکی کو اٹھا رہا تھا۔

"اٹھو بیٹا ریشم! بھور ہو گئی۔"

پھر اس نے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو دیکھا جو خچر پر دودھ کے ولٹوہے لاد رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

"ریشی! اری او ریشی! اب اٹھ بھی چکو۔"

اور سب سے آخر میں اسے بکری کی مے مے سنائی دی اور ریشم کی آنکھوں میں آنسو اُبل پڑے اور وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر پھوٹ پڑی۔

"میرے باپو! ... میری ملٹے ... میری نیلی! آج اوپر دودھ کون لے جائے گا؟ کون لے جائے گا؟"

ریشم کا جی ڈوبنے لگا۔ اسے اپنی ماں، اپنا باپو، اپنی نیلی، سارو، ریشماں، چمبہ کلی کی کلیاں گلیوں کے جھکے جھکے اک منزلہ مکان، آنگن کے درخت، درختوں پر بیٹھ کر گانے والے پرندے اور پرندوں کی ٹولیاں اور سیب کے درخت اور باؤلی کا ٹھنڈا پانی... سب کچھ یاد آ گیا۔ اسے اپنے پاؤں منوں بھاری محسوس ہونے لگے۔ معاً اسے خیال آ گیا کہ کیا کر رہی ہے۔ اگر وہ شہر چلی گئی تو قصبے میں روزانہ دودھ کون لے جایا کرے گا۔ باؤ... پر ماں اور بابا کے میلے کپڑے کون دھوئے گا؟ ڈھور ڈنگروں اور نیلی کو ہرے بھرے پوڑے کون ڈالے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دینو حلوائی سے دودھ کی رقم کون وصول کرے گا؟ اس نے شب برات کی پہلی کا وعدہ کیا ہے۔ ریشم جیسے گہری نیند سے چونک اٹھی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ سات ستاروں کی ٹولی... سات بہنوں کا جھو... مشرقی کناروں سے اوپر اٹھتا ہوا آسمان کے وسط میں آ کر صبح کے اڑتے گھلتے غبار... ٹمٹما رہا تھا اور پھیکا پڑ رہا تھا۔

ایکا ایکی اسے قریب ہی کسی نومولود بچے کے رونے اور پھر قصبے کے تمام کتوں کے بھونکنے کی منحوس چیخیں سنائی دیں اور وہ ڈر گئی اور اس کا رنگ زرد ہو گیا اور نچلا ہونٹ کپکپانے لگا۔ اس نے جلدی سے چادر سنبھالی۔ اسے اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹا۔ کمر کے گرد کسی ہوئی رسی درست کی اور خچر پر سوار ہو گئی۔ خچر گردن نیہوڑائے ڈھلان کے چھوٹے بڑے پتھروں پر رک رک کر چلنے لگا۔ باؤلی کے پاس سے گذرتے ہوئے سیب کی بے رنگ ننگی ٹہنیوں نے ریشم کی چادر آہستہ سے کھینچ کر کہا۔

او روٹھ کر جانے والی!

بہار میں لگی ہوئی پریت کا ناطہ پت جھڑ میں نہ توڑ!

ہم تو صرف پیار کی اک نگاہ کے بھوکے ہیں۔ ہم سے کیوں روٹھ رہی ہو؟

کیا اس لیے کہ ہمارے پتے جھڑ گئے ہیں؟

باؤلی میں سے چمکیلے پتھروں پر گرنے والے پانی کی دھیمی دھیمی رل ترل رل ترل ... راگنی سنائی دے رہی تھی۔ اس اداس راگنی میں چشمے کی پکار تھی۔

او بچھڑ کے جانے والی گوالن!
میری سطح پر پتوں کی سیج بچھی ہے
اب برف گرنے والی ہے
اس رت میں پردیس نہ جا سکھی!
جب میری جھولی میں سیب کے پھول گریں گے۔
پھر میں وہ پھول کسے دکھاؤں گا؟
کیسے دکھاؤں گا او اداس دلہن!

کاؤ کے گنجان درخت سے چمبہ کلی کی کنواری بیل لپٹی سو رہی تھی اور اس کی خوشبودار بانہوں میں وحید... سنگدل پردیسی کہہ رہا تھا،

"میرا پیار چمبہ کلی کی طرح ہے گوالن جو صرف اس وقت مہکتی ہے، جب شرمیلی دلہن کے گلے میں حائل ہوتی ہے... میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ کبھی نہیں... یہ چمبہ کلی کے پھول اور موتیے کی کلیاں اور گلاب کے شگوفے، سیب کے درخت اور کاؤ کی شاخیں اور زناری کی بیلیں اور باؤلی کے پتھر... یہ سب میری محبت کے گواہ رہیں گے۔ جب تمہیں چھوڑنے کا خیال پیدا ہو گا تو میں بھاگ کر تمہارے پاس آ جاؤں گا اور تم مجھے اپنے بازوؤں میں چھپا لینا اور مجھ پر اپنے بالوں کا سایہ ڈال دینا اور مجھے اپنے ساتھ لگا لینا اور..."

اور دور گہرے سمندر کی نچلی تہوں سے کہیں ریشم کی آواز سنائی دی۔

"ہائے وحید! میرا دم گھٹ رہا ہے وحید... وحید!"

اور کاڈ کی شاخوں میں بارش کی بوندا باندی کا شور رُک گیا تھا اور اب دو تین گلدم
چہچہا رہی تھیں اور موتیے اور گلاب کی جھاڑیوں میں جھینگر بولنا شروع ہو گئے تھے اور
کا شفاف پانی گا رہا تھا۔ رل ترل ۔ ۔ ۔ ۔ رل ترل ۔ ۔ ۔ ۔ رل ترل!
کلپ کلوپ ۔ ۔ ۔ ۔ کلپ کلوپ ۔ ۔ ۔ ۔
خچر شہر جانے والی سڑک پر چلتا رہا اور صبح کے بڑھتے پھیلتے اجالے میں ستاروں
چمکیلے پھول مدھم پڑ گئے اور رات کا رنگ زرد ہو گیا۔
اور زرد ہو گیا۔

بے زبان خچر غیر ہموار پتھریلی سڑک پر سارا دن چلتا رہا۔
اپنی پشت پر گھر چھوڑ کر پردیس جانے والی گوالن کو بٹھائے اس نے کئی چھوٹے
وٹے ٹیلوں کے چکر کاٹے، ان گنت درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں سے گزرا اور
ن دیہاتی مردوں اور عورتوں کو مکئی کے گٹھے یا کھنگوں کے بورے اٹھائے اپنے اپنے
ردں کو جاتے دیکھا۔ اس دوران میں اس نے صرف دو مرتبہ چشمے کا پانی پیا اور ہری ہری
اس کھائی۔ ریشم نے صرف پانی پیا اور کچھ نہ کھایا۔ راستے میں ایک ڈاک بنگلہ بھی آیا جس
ے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا اور برآمدے میں چوکیدار سو رہا تھا۔ ریشم جلدی جلدی آگے
ل گئی۔ وہ راستے میں کسی سے نہ ملنا چاہتی تھی۔ کسی کو نہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا، کوئی
ے پہچان نہ لے اور پکڑ کر اسے اس گھر میں نہ لے جائے، جہاں وہ اب کبھی داخل نہیں ہو
لتی۔ جس کے دروازے اس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے بند ہو گئے ہیں اور جس کی دہلیز پر کنڈلی
رکر بیٹھا ہوا سیاہ ناگ اس کا انتظار کر رہا ہے۔
راستے میں ہی شام ہو گئی۔ سورج ہزارہ کی بنجر پہاڑیوں کے عقب میں چھپ گیا اور آسمان
ر سرخ سرخ روشنی گہری ہوتی گئی۔ جنگل کی طرف پرندوں کا شور تھم گیا اور ہوا پہلے سے زیادہ
نک ہو گئی۔ ریشم کو بڑی بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے دن بھر کچھ نہ کھایا تھا۔ صرف سڑک
نارے اِدھر اُدھر پتھروں میں چھپ چھپ کر بہتے والے چشموں کا پانی ہی پیا تھا۔ جوں جوں
رات آ رہی تھی اسے رات بسر کرنے کا خیال پریشان کر رہا تھا۔ صبح سے شام تک اس

نے گیارہ کوس کی مسافت طے کی تھی اور ابھی قاضی پور تک پہنچنے کے لیے بارہ کوس باقی
چیڑھ کے کٹے ہوئے تنوں سے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے پل پر سے گزر کر جب ر
کا خچر سڑک پر جھکی ہوئی ایک بڑی سی چٹان کا موڑ گھوما تو سامنے پہاڑ کی ترائی میں گھا
کے تلے پر ریشم کو درختوں کے درمیان الاؤ کی روشنی دکھائی دی۔ وہ خچر پر سے اتر پڑی ا
اس کی لگام تھامے ان درختوں کی طرف بڑھی۔ ابھی الاؤ سے کچھ دور ہی تھی کہ کہیں سے کتے
زور سے خرخر کرنے کی ڈراؤنی آواز سنائی دی۔ ریشم سہم کر خچر کے ساتھ لگ گئی۔ ساتھ
ایک محبت بھری آواز ابھری ۔

''بس بیٹا بس۔ کوئی نہیں، کوئی نہیں۔''

ریشم ذرا رک کر پھر آگے بڑھی اور اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹے سے چھپر تلے ایک
ہوئی کمر والا بوڑھا کسان گاڑی میں جتے ہوئے بیلوں کو کھول کر کھونٹی کے ساتھ باند
تھا۔ کتا زور سے بھونکا اور لپک کر ریشم کی طرف دوڑا۔ ریشم چیخ مار کر خچر سے چمٹ گ
پاس آکر کتا جیسے بھونچکا سا رہ گیا اور کان کھڑے کر کے سہمی ہوئی گوالن کو تکنے لگا
پھر بڑے لاڈ سے دم ہلا ہلا کر اس کے پاؤں چاٹنے لگا۔ اب بوڑھا بھی بیلوں کو
کر ریشم کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے کتے کو دھتکار کر پرے ہٹایا اور جھک کر ر

''آؤ ۔ ۔ ۔ آؤ بیٹا۔ بیٹھو۔ خچر مجھے پکڑا دو۔ وہاں بیٹھ جاؤ۔ عبداللہ کی ماں ش
ہوئی ہے اور بچے بھی ساتھ ہی گئے ہیں۔ کل آئیں گے۔ لیکن تم بیٹھو ۔ ۔ ۔ کچھ کھاؤ گ

اچار کے ساتھ باجرے کی روٹی کھانے کے بعد ریشم کا تھکا ماندہ جسم پھر سے تازہ د
سرد رات کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی۔ وہ سیاہ چادر اوڑھے گھاس پر آگ کے پاس
اس کا میزبان ۔ ۔ ۔ بوڑھا کسان بھی پاس ہی بیٹھا تھا اور آگ کی روشنی میں کسی بیل کا
پٹہ مرمت کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا اور الاؤ کی ملگجی چمک میں تا
مانند دہک رہا تھا۔ سر پہ گرم اونی ٹوپی تھی جس میں سے کچھ سفید بال کانوں پر ج
تھے۔ ریشم نے اسے بتایا کہ وہ قاضی پور اپنی بڑی بہن کے گھر جا رہی ہے اور اس کے با
کہا تھا کہ راستے میں اسے لینے آئے گا، لیکن نہ جانے وہ کیوں نہیں آیا اور اب وہ اکیلی

ن سر پہ آ گئی تھی اور وہ بہت گھبرا رہی تھی۔ بوڑھے نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

''مجھے بھی اپنا بابا سمجھو بیٹا ۔ ۔ ۔ یہ بھی تمہارا گھر ہے اور پھر تمہاری ایسی میری تین بیٹیاں
۔ ایک دو تین۔ ہو ہو ہو ۔ ۔ ۔ آج بڑا پالا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے بھی اپنا بابا سمجھو بیٹا ۔ ۔ ۔ ۔''

م کو جیسے ایک دھکا سا لگا اور اس نے دیکھا کہ اس کا بابا کوٹھری میں چھپا اپنی پگڑی ہاتھوں
دبائے رو رہا ہے اور اس کی ماں پڑوس کی بڑی بوڑھی عورتوں کی باتیں سن رہی ہے اور
ش ہے۔ زمین کی طرح ۔ ۔ ۔ دھرتی ماتا کی طرح، جو اپنے سینے پر کدال چلانے والوں کے
پاؤں چومتی ہے اور پھولوں کے بیج بکھیرنے والوں کے بھی۔

ریشم سوچنے لگی۔ صبح ان کے گھر میں کہرام مچ جائے گا۔ جب وہ رات کو بھی گھر نہ آئے گی
ن کا بابا اس کی تلاش میں اوپر قصبے میں ضرور جائے گا۔ وہ ہر دکاندار سے کچھ پوچھنا چاہے
لن نہیں پوچھ سکے گا۔

''دینو میری ریشی کو تو نہیں دیکھا؟''

اور دینو کہے گا۔

''نہیں تو ۔ ۔ ۔ مگر خیر تو ہے۔''

''ہاں بھائی خیر ہے۔ سب خیر ہے۔''

مگر سب خیر کہاں ہے؟ ریشم گھر سے بھاگ گئی ہے۔ وہ اپنی بوڑھی ماں اور بے ضرر
ت کرنے والے بابا کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئی ہے۔ اس نے خاندان کی عزت کا گلا دبا دیا
اور اب میں اس کا گلا دبانا چاہتا ہوں، بولو وہ کہاں ہے؟ کدھر ہے؟ ریشم! ریشی!
ا ۔ ۔ ۔ رے ۔ ۔ ۔ ریشی! ریشم کو دور پہاڑوں میں اپنے باپ کی دردانگیز آوازیں سنائی
ں۔ ان آوازوں میں محبت بھی تھی اور نفرت بھی۔ دودھ کی دھاریں بھی تھیں اور زہر کا
ک بھی۔ یہ بڑی درد بھری آوازیں تھیں ۔ ۔ ۔ رے ۔ ۔ ۔ شی ۔ ۔ ۔ رے ۔ ۔ ۔ شی ی ی ی۔ ۔

ریشم کا بدن کانپ گیا اور قریب ہی کتا زور سے بھونکا۔

''بس بیٹا بس ۔ ۔ ۔ اب سو جاؤ ۔ ۔ ۔ چلو ۔ ۔ ۔ جلدی آرام کرو ۔ ۔ ۔ ہو ہو ہو۔ بڑا بے زبان
در ہے۔''

رات گہری ہو رہی تھی۔ درختوں کے اوپر نیلے آسمان پر لاکھوں چھوٹے بڑے ننھے
ستارے پلکیں جھپکانے لگے تھے۔ رات کی ٹھنڈی ہوا پیڑ پودوں کی مہک لیے درختوں
سرگوشیاں کرتی گزر رہی تھی۔ بڈھے مرمت کر کے بوڑھے نے درخت کے تنے سے ٹیک
کر ٹانگیں گھاس پر پھیلا دیں اور حقہ پینے لگا۔ درخت پر سے کبھی کوئی خشک پتا خامو
سے جلک کھا کر الاؤ میں گرتا اور شعلوں کی تیز زبانیں اسے فوراً نگل لیتیں۔ ریشم گھاس پھو
کے گٹھے پر سر رکھ کر وہیں کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی اور درختوں کی ٹہنیوں میں سے نظر آنے
آسمان کو تکنے لگی۔

بوڑھا کھانسا اور پھر خشک سی آواز میں گنگنانے لگا۔

کھیڈ کھیڈیندیاں شاماں پیاں
وسّر گیا گھر بار نی مائے
وَت نہیں آوناں دس پیارے
کھیلتے کھیلتے شام ہو گئی ہے پیاری ماں!
مجھے گھر کا راستہ بھول گیا ہے اب میں کیسے گھر پہنچوں،

بوڑھے کی آواز گیت سے زیادہ دردناک تھی۔ اس آواز میں کوئی جوش کوئی لپک تازگی نہ تھی۔ وہ کمزور، اداس اور بجھی تھی، جیسے کوئی لیمپ کی دھیمی دھیمی روشنی میں کوئی بڑا ہی پرانا گرد آلود محبت بھرا خط کھول رہا ہو، جیسے کوئی بجھی ہوئی راکھ کے ڈھیر رقص کرنے والی چنگاریاں تلاش کر رہا ہو۔ ریشم نے اپنا ایک بازو آنکھوں پر رکھ لیا
بوڑھے کسان نے گنگنانا بند کر دیا۔ اب ہر طرف گہری خاموشی تھی اور صرف الا
جلنے والی جھانکڑیوں کے چٹخنے کی آواز آ رہی تھی۔ بوڑھا آہستہ سے کھانسا اور
کش لگا کر بولا۔

"سو گئی بیٹی؟"

"نہیں بابا"

بوڑھا کچھ دیر چپ رہا۔ پھر آہستہ آہستہ بولنے لگا۔

"آج بڑی ٹھنڈ ہے۔ پہلے کبھی اسوج میں اتنی ٹھنڈ نہ پڑی تھی۔ اب بہت سی باتیں
ایسی نہیں ہیں۔ پھر بھی جو دم گزر جائے۔ وہ اچھا ہوتا ہے۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔
ی اپنا میٹھ چھوڑنے کو ہے۔ شاید اگلے اسوج کی فصل نہ دیکھ سکوں، اللہ میاں میرے
ہ معاف کرے۔ میرے گناہوں کی گٹھڑی بڑی بوجھل ہے۔ . . . اب تو صرف گز بھر
ین کی تمنا ہے جہاں یہ بوڑھی ہڈیاں آرام کر سکیں۔ اللہ کی ذات نے بڑا آرام دیا ہے بیٹے
ں۔ بیٹیاں ہیں۔ پوتے ہیں، پوتیاں ہیں۔ تھوڑی بہت زمین بھی ہے۔ جانوروں کی جوڑی
ے اور ایک یہ جھونپڑی ہے مجھے اور کیا چاہیے تھا؟ . . . بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔ بہت
نہیں بھی دیکھا۔ پھر کیا ہوا۔ غم بھی دیکھے ہیں۔ خوشیاں بھی دیکھی ہیں۔ اولاد نے دکھ
ی دیا ہے اور سکھ بھی پہنچایا ہے۔ یہی دکھ سکھ تو زندگی ہے۔ انھی پہاڑیوں میں پیدا
ا تھا۔ انھی پہاڑیوں میں دفن ہو جاؤں گا۔ خدا میرے گناہ معاف کرے . . . اب سو
اغافل بندے! . . . تو بھی سو جا بیٹا . . . آج ٹھنڈ ہے۔ بڑا پالا ہے۔ پہلے کبھی . . . "

ریشم کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی گئیں اور مہربان بوڑھے کی غمناک آواز کہیں
دور . . . بہت دور چلی گئی۔ جیسے کوئی کسی تاریک گھاٹی میں گر پڑے، خشک پتوں
پہ آہستہ آہستہ چل رہا ہو۔

چلتے چلتے شام ہو گئی ہے
کھیلتے کھیلتے شام ہو گئی ہے
پیاری ماں!
مجھے گھر کا راستہ بھول گیا ہے
اب میں کیسے گھر پہنچوں؟

ریشم کی آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں اور وہ سو گئی۔ گہری نیند سو گئی۔

پچھلے پہر اس نے ایک خواب دیکھا۔ بڑا ہی ریشمی خواب . . . . اس نے دیکھا کہ وہ
باؤلی کے پتھر پر مسافر کے پاس . . . وحید کے پاس بیٹھی ہے اور ران پہ چڑھ کے جھومر
کا سایہ ہے اور باؤلی کا پانی خلخال بجاتا نیلے نیلے پتھروں میں سے گزر رہا ہے۔ مسافر

آہستہ سے اپنے گرم ہونٹوں سے اس کے دمکتے ہوئے گال چومتا ہے اور اس کے اُلجھے ہوئے سیاہ بالوں میں ترناری کا نیلا پھول لگا کر بڑی محبت سے کہتا ہے،

"اٹھو بیٹا! نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ پو پھٹ گئی ۔ ۔ ۔ ۔"

نیک دل بوڑھا کسان رشیم کو جگا رہا تھا۔

رشیم نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور پلکیں بھینچ لیں۔ نہیں نہیں ابھی پو نہیں پھٹی ابھی صبح نہیں ہوئی۔ ابھی کیسے صبح ہو سکتی ہے۔ ابھی تو اس کے بالوں میں ترناری کا پہلا پھو بھی نہ مسکرایا تھا۔ ابھی تو اس کے محبوب کا شہد آگیں لمس اس کے گالوں پر ٹھہر آیا ہی تھ ابھی تو انھوں نے کوئی بات نہ کی تھی۔ ابھی تو وہ کچھ کہنے ہی والا تھا۔ ابھی انھیں بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ ۔ ۔ بہت سی باتیں! پھول سے زیادہ نرم اور بانسری سے زیادہ میٹھی باتیں! ابھی صبح کیوں ہو گئی۔ کیوں ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔

رشیم جب جاگی تو اس کی پلکوں پر آنسوؤں کی نمی تھی اور چہرہ پہلے سے زیادہ اداس تھا۔ وضو کرنے کے بعد اس نے وہیں گھاس پر نماز پڑھی اور ہاتھ اٹھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اے نگاہوں اور دلوں کو پھیرنے والے!

اے رات اور صبح کے خالق! اگنی ان پہاڑی جنگلوں کی ایک بدنصیب گوالن تجھ سے عزت اور محبت کی بھیک مانگتی ہے۔ اے ترناری کی بیلوں کو نیلے پھول اور سیب کی ٹہنیوں کو میٹھے سیب عطا کرنے والے! اے رات کی پیشانی پر سات ستاروں کا جھومر صبح کے ماتھے پر سورج کا ٹیکا لگانے والے! مجھے بھی توفیق عطا کر کہ میں اپنی پیشانی پر لگے ہوئے حیا کے جھومر کی حفاظت کر سکوں۔ آج پہلی بار طلوع ہوتا ہوا سورج مجھے گھر سے باہر دیکھ رہا ہے۔ گھر سے بے گھر دیکھ رہا ہے۔ میری غریب الوطنی کی لاج رکھنا۔ میں نے گ کیا ہے اور اب اس گناہ کی پرورش کر رہی ہوں۔ میں ایسا کرنے پر مجبور کر دی گئی ہوں۔ معاف کر دینا۔ میری خطا بخش دینا۔ تیرے سمندر کا ایک چھینٹا میرے داغدار آنچل کو ہ کے لیے بے داغ کر سکتا ہے، تو پہاڑوں کا سورج ہے اور میں تاریک راتوں کا جگنو ہوں

کشاں کی سیج ہے اور میں کیچڑ میں اگا ہوا کنول ہوں۔ میری برائیوں کو درگزر کرنا اور اچھائیوں مجھے توفیق دینا۔ میرا سر جھکا ہوا ہے اور ہاتھ بلند ہیں۔ میری آنکھیں بند ہیں اور ہتھیلیاں لی ہیں۔

مجھے معافی کی بھیک عطا کر۔ آمین!

رشیم کے ہونٹ چپ تھے لیکن اس کا دل دونوں ہاتھ اٹھائے خدا کے حضور میں یہی ما مانگ رہا تھا۔ یہی بھیک مانگ رہا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے اپنے بوڑھے میزبان ساتھ مل کر رات کی بچی ہوئی روٹی دودھ میں بھگو کر کھائی۔ کمبل لپیٹ کر خچر پر کسا۔ جب وہ بوڑھے بابا سے رخصت مانگنے لگی تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بوڑھے نے بڑی فقت سے اس کے سر پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھ دیا۔

"لوٹتی مرتبہ بھی ملتی جانا بیٹا۔ عبداللہ کی ماں آ گئی ہوگی۔ پھر وہ تمھیں بہت کچھ پکا کر کھلائے ۔ ۔ ۔ ہول اور بھٹے بھی دے گی۔"

"ضرور ملوں گی بابا!"

اور وہ خچر پر سوار ہو کر درختوں کے درمیان مکئی کے کھیت کی مینڈھ پر سے گزرتی ہوئی پہ انے والی سڑک پر آ گئی۔ کیا وہ لوٹتی مرتبہ بابا سے ملتی جائے گی! لوٹتی مرتبہ کون ملتا ہے اور یا جانے وہ کب لوٹے۔ قطار سے بچھڑی ہوئی کونج جانے پھر کب ملے! جب کھیلتے کھیلتے شام جاتی ہے اور گھر کا راستہ بھول جاتا ہے تو پھر کوئی دروازے پر آ کر دستک نہیں دیتا۔ کوئی ت کے اندھیرے میں آ کر یہ نہیں کہتا۔ ۔ ۔ دروازہ کھولو! میں آ گیا ہوں۔ میں راستہ بھول گیا ا اور تاریک گھاٹیوں میں جا نکلا تھا۔ ۔ ۔!

کلپ کلوپ۔ ۔ ۔ کلپ کلوپ۔ ۔ ۔ کلپ کلوپ۔

بے زبان خچر تھوڑا بہت گھاس کھا کر اور پانی پی کر ساری دوپہر سڑک پر چلتا رہا۔ اب انی اور دو تین میل رہ گیا تھا۔ سڑک کی ڈھلان ختم ہو گئی تھی۔ چیڑھ کے درخت سرسبز پہاڑ اور یب و ناشپاتی کے باغ اور ترناری کے پھول اور چنبہ کلی کی بیلیں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ سم میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔ خنکی باقی نہ رہی تھی اور ذرا سی ہوا رکنے پر دھوپ سے بدن میں

سوئیاں سی چبھنے لگتی تھیں۔ ادھر اُدھر بھورے بنجر ٹیلوں کے غیر ہموار سلسلے پھیلے ہوئے تھے جہاں گرم دھوپ میں کہیں چیلیں منڈلا رہی تھیں اور کہیں بکریوں کے ریوڑ گزر رہے تھے اور گرد سے بادل اٹھ رہے تھے۔ رشیم ایک لمبی مدّت کے بعد پہاڑوں سے نیچے اُتری تھی ا بار بار پسینہ آنے لگا۔ اس نے چادر اتار دی اور اکا دکا درختوں کی چھاؤں میں سے ہو کر گز لگی۔ گرم فضا میں اُتر آنے سے اس کا سانولا رنگ دمک کر کندن کی طرح نکھر گیا تھا۔ دھو ڈھلنا شروع ہوگئی تھی کہ وہ قاضی پور کے بہت بڑے قصبے کے چھوٹی چھوٹی دیہاتی دکانو والے بازار میں آگئی۔ وہ خچر سے اُتر پڑی اور سیدھا ایک سنار کی دکان پر گئی۔ جہاں ا نے پوٹلی میں سنبھال کر رکھی ہوئی سونے کی بالیاں بیچیں اور تئیس روپے کچھ آنے پوٹلی م کر قصبے سے باہر آگئی۔ اب وہ ایک ویران ٹیلے کی اوٹ میں چھوٹی سی ندی کے کنارے تھی اور اس کا خچر اپنی لمبی تھوتھنی ندی میں ڈالے پانی پی رہا تھا۔ رشیم نے اپنی کمر کے لپٹی ہوئی سیاہ رسی اتار کر خچر کے گلے میں لپیٹ دی۔ کمبل تہ کر کے خود پکڑ لیا۔ خچر کی گر میں بازو ڈال کر اسے بڑی محبت سے چوما اور بولی؛

”اب میرا تیرا ساتھ ختم ہوا۔ سیدھے گھر جانا اور ماں سے کہنا۔ رشیم اپنے گناہوں بدلہ چکا کر ضرور واپس آئے گی! سمجھے!... پیدل چلتے وقت تم بہت یاد آؤ گے میرے ویر!“

قاضی پور سے پانچ میل کے فاصلے پر چک حمیر کا ریلوے سٹیشن تھا جہاں سے لاہو لیے پہلی گاڑی صبح سات بجے اور دوسری گاڑی رات آٹھ بجے روانہ ہوتی تھی۔ قاضی پور چک حمیر کے درمیان ملک عجب خان، نجب خان کی ریڑھ میل چوکور بسیں دن میں کئ لگاتی تھیں۔ رشیم بھی ملک نجب خان، عجب خان کی ایک چوکور بس میں سب سے پچھ پر بیٹھ کر چک حمیر پہنچ گئی۔ یہ پانچ میل کا سفر اس نے بڑی مصیبت سے کاٹا۔ گرمی اس کا برا حال ہوگیا۔ سڑک کی مٹی اس کے بالوں اور آنکھوں میں گھس گئی اور پیٹرول ہوئی بو سے اس کا سر چکرانے لگا۔ اس مختصر سے سفر میں ملک عجب خان، نجب چوکور بس دو تین بار خراب ہوئی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس کے انجن میں سے د

دل اٹھنے لگتے۔ ڈرائیور انجن بنانے والی کمپنی کے مالک کو موٹی موٹی گالیاں دیتا موٹر کھڑی کر دیتا اور کلینر ٹین کے ڈبے بھر بھر کر انجن کو غسل دینا شروع کر دیتا۔

چک حمیر کے سٹیشن پر جا کر رشیم نے تھوڑا بہت کھانا کھایا اور لاہور کے تیسرے درجے کا ٹکٹ خرید کر دوسری عورتوں کے ساتھ پلیٹ فارم کے بنچ پر بیٹھ گئی اور گاڑی کا انتظار کرنے لگی۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے سبز رنگ کی خالی گاڑی پلیٹ فارم پر آکر کھڑی ہوگئی۔ مسافروں میں ہلچل سی مچ گئی۔ رشیم بھی کمبل سنبھالتی دوسری عورتوں کے ساتھ اٹھی اور ایک لمبے چوڑے ڈبے میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ سٹیشن پر لیمپ روشن ہوگئے تھے اور فضا میں خنکی سی رچنے لگی تھی۔ پورے آٹھ بجے گاڑی نے ایک ہلکے سے دھچکے کے ساتھ پلیٹ فارم، قاضی پور، چمبہ گلی کی باؤلی اور سیب کے باغ اور رشیم کا گھر، آنگن، آنگن کا پیڑ... سب کچھ پیچھے کھسکنے لگا رشیم کا جی ایک لمحے کے لیے اس قدر گھبرایا کہ وہ چھلانگ لگا کر ڈبے سے باہر کودنے لگی۔ لیکن اسے اپنا آپ اس قدر بوجھل محسوس ہوا کہ وہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہل سکی۔

تمام رات گاڑی ایک بے ہنگم شور کے ساتھ لاہور کی سمت اپنا سفر طے کرتی رہی۔ وہ ہر سٹیشن پر رکتی۔ کچھ مسافر اُتر جاتے۔ کچھ اور چڑھ آتے۔ سست رفتار بھدّا انجن بڑی کاہلی سے وِسل دیتا۔ رت جگوں کا مارا ہوا ادھیڑ عمر گارڈ جھنڈی ہلاتا اور گاڑی اگلے سٹیشن پر رکنے کے لیے آہستہ آہستہ کھسکنے لگتی۔ رات کو اچھی ٹھنڈ ہوگئی تھی اور رشیم کونے والی کھڑکی کے پاس کمبل اوڑھے بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں کھیت، میدان، درخت اور بجلی کے کھمبے پیچھے کی سمت بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ کسی وقت اس کی اونگھ ٹوٹ جاتی اور وہ نیند میں سلگتی ہوئی پلکیں اٹھا کر باہر اندھیرے میں جھانک لیتی۔ جہاں اسے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ ڈبے میں دوسری عورتیں بڑے آرام سے ایک دوسری پر چڑھی سو رہی تھیں۔ ایک عورت کی ٹانگیں دوسری کے زانوؤں پر تھیں اور دوسری عورت کا سر تیسری کے پیٹ پر تھا۔ چھت سے لٹکتی ہوئی بتیاں چلتی گاڑی کی حرکت سے جھوم رہی تھیں۔ ڈبے کی تقریباً سبھی کھڑکیاں بند تھیں۔ صرف رشیم کی کھڑکی اور دونوں دروازوں کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ رشیم کے پاس ہی لیٹی ہوئی ایک بھاری بھرکم دیہاتی عورت بار بار کھڑکی بند

کرنے کو کہہ رہی تھی۔

"کھڑکی چڑھا دے لڑکی! نمونیہ ہو جائے گا۔"

اس عورت کا ایک گھٹنا ریشم کی پسلیوں میں چبھ رہا تھا۔ ریشم کو ٹھنڈی اور تازہ ہوا بڑی بھلی محسوس ہو رہی تھی اور وہ کھڑکی بند نہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس عورت سے تنگ آ کر اس نے کھڑکی کا پٹ چڑھا دیا اور ڈبے میں حبس سا ہونے لگا۔ ریشم نے اپنے آپ کو سمیٹ کر سر کو لکڑی کی دیوار سے لگا دیا اور چلتی گاڑی نے اسے تھپک تھپک کر بہت جلد سُلا دیا۔ خواب میں جیسے اس نے کسی عورت کو کہتے سُنا:

"اٹھو بہن گاماں! لاہور آ گیا۔۔۔ وہ دیکھو اپنا مصری شاہ گزر رہا ہے۔"

"لاہور آ گیا۔ لاہور آ گیا۔"

ریشم کی آنکھ کھُل گئی اور اس نے کھڑکی میں سے جھانک کر باہر دیکھا۔

گاڑی کی رفتار مدہم ہو گئی تھی اور ایک لمبی چوڑی سڑک کے ساتھ ساتھ ذرا بلندی پر سے گزر رہی تھی۔ دن کافی چڑھ آیا تھا اور دھوپ میں سڑک کنارے والے مکانوں کے شیشے چمک رہے تھے۔ سڑک پر سے کاریں، موٹریں، تانگے اور سائیکلیں گزر رہی تھیں۔ دوسری جانب ایک منزلہ، دو منزلہ اور سہ منزلہ مکانوں کے جھنڈ تھے، جو ایک دوسرے میں گھسے ہوئے تھے۔ ایک مکان کی چِق اٹھی تھی اور بالکونی میں بیٹھا ہوا کوئی حجامت بنا رہا تھا۔ ایک مکان کی چھت پر سے ایک عورت لوٹا ہاتھ میں لیے سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔ ایک دکان کے باہر کوئی بھاری بھرکم سا آدمی چھوٹے سے بچے کو کان سے پکڑے گھسیٹے لیے جا رہا تھا۔ بچے کے بغل میں بستہ تھا اور وہ شور و غل مچا رہا تھا۔ ایک مسجد گزری جس کے صحن میں ایک مولوی صاحب صفیں لپیٹ رہے تھے۔ ریل گاڑی لوہے کی چمکتی ہوئی پٹڑیوں کے جال پر رینگتی چلی جا رہی تھی۔ ادھر ایک انجن شنٹ کرتا ہوا گزر جاتا تو دوسری طرف سے دوسرا انجن نل کے نیچے کھڑا پانی لے رہا ہوتا۔ ریشم کو آبادی کے مکانوں میں دو تین چمنیاں دکھائی دیں جن میں سے بھورے رنگ کا دھواں بڑی بیزاری سے اوپر اٹھ رہا تھا۔

بڑی زور دار گرج کے ساتھ گاڑی ایک بڑی اونچی اور وسیع آہنی چھت والے غار میں داخل ہو گئی اور پھر آہستہ آہستہ ایک جگہ کھڑی ہو گئی۔ پلیٹ فارم چمک رہا تھا اور

کافی لمبا چوڑا تھا۔ سرخ وردیوں والے قلی اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ جب ڈبّے میں سے تمام عورتیں نکل گئیں تو ریشم بھی کمبل اٹھائے گاڑی سے باہر پلیٹ فارم پر آگئی۔ وہ پہلے بھی ایک آدھ بار اپنے باپو کے ساتھ لاہور آئی تھی، لیکن تب وہ چھوٹی تھی اور اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اتنے بڑے پلیٹ فارم پر وہ چلتے ہوئے گھبرا سی گئی اور اسے ہر آدمی اپنی طرف گھورتا محسوس ہوا۔ وہ جونہی ایک جگہ سیڑھیاں چڑھ کر باہر نکلنے لگی تو سفید وردی والے بابو نے ٹکٹ مانگا۔ ریشم نے ٹکٹ دکھایا تو وہ اسے واپس کرتے ہوئے بولا:

"دوسرے پُل پر جاؤ۔"

ریشم جلدی سے واپس ہوگئی۔ وہ زیادہ دیر کسی بھی مرد کے سامنے ٹھہرنا نہ چاہتی تھی۔ کیا خبر وہ اسے پہچان لے اور سپاہیوں کے حوالے کر دے۔ دوسرے پُل پر چھوٹے سے درواز میں سے عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم گزر رہا تھا۔ اور کافی دھکّا پیل ہو رہی تھی۔ وہ ایک طرف ہٹ کر جنگلے کے ساتھ کھڑی ہوگئی جب ذرا رش ہلکا ہوا تو وہ آگے بڑھی اور ٹکٹ دے کر پُل کا باقی نصف حصّہ عبور کر کے سیڑھیوں پر سے اترتی سٹیشن کی عمارت سے باہر آگئی۔ باہر ایک نئی دنیا تھی۔ زندگی، روشنی اور چمک دمک کا دریا تھا، جو اچھلتا کودتا موجیں اڑاتا بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ کتنی ہی سڑکیں تھیں جو مختلف سمتوں کو جا رہی تھیں۔ ایک دومنزلہ بس اس کے سامنے سے گزر گئی اور ریشم بڑی دلچسپ حیرانی سے اسے دور تک دیکھتی رہ گئ اس سے پہلے اس نے کبھی اتنی بلند موٹر نہ دیکھی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس میں بیٹھ کر خوب سیر کرے۔ کہیں وہ گر تو نہ پڑے گی؟ دوسری منزل میں لوگ کیسے جاتے ہوں گے، کیسے بیٹھتے ہوں گے۔ ریشم ابھی شہر کی پہلی سیڑھی پر ہی تھی اور وہ بہت ہی چیزیں دیکھ کر، بڑی بڑی چیزیں دیکھ کر مبہوت سی ہو رہی تھی اور اسے اپنا آپ بہت حقیر اور بے جا سا محسوس ہو رہا تھا۔ ذرا فاصلے پر سڑک کے دوسرے کنارے لاؤڈ سپیکروں پر اونچی آواز میں ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔

"تیرے لونگ دا پیا لشکارا . . . . ."

"گھر آیا میرا پردیسی . . . . . ."

"کالی کملی والیا . . . ."

"وے منڈیا سیالکوٹیا . . . ."

"وے میں کچلے دی کا پانی آں دھار . . . ."

ریشم تک ان مختلف گانوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور وہ اپنے دھیان میں کھڑی اِدھر ...ر تک رہی تھی کہ ایک ٹیڑھی پگڑی والا کوچوان سا نٹا بغل میں دبائے چپکے سے اس کے ...ں آکر بولا۔

"چلنا ایں بہن جی!"

ریشم نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے پہلی مرتبہ کسی نے بہن کہہ کر پکارا تھا۔ اسے ...ں لگا گویا وہ اچانک سڑک سے اٹھ کر دومنزلہ بس میں آ کر بیٹھ گئی ہو اور شہر کی سیر ...ہی ہو۔

"ہاں . . . چلنا ہے ویرا[1]۔"

"کہاں بہن جی؟"

"ٹھنڈی سڑک پر . . . چائے کے دفتر میں۔"

"چائے کے دفتر میں؟"

"ہاں! چائے کمپنی کے دفتر میں۔"

"او اب سمجھا۔ تو آؤ بہن تانگے میں بیٹھو۔"

"کتنے پیسے لو گے بھائی؟"

"صبح صبح دوسری بات نہیں کروں گا بہن۔ راستہ بڑا لمبا ہے۔ تم دو روپے دے دینا۔"

"اچھا بھائی . . . مگر جلدی لے چلو۔"

ریشم تانگے میں بیٹھ گئی اور تانگہ سٹیشن کے سامنے سے ہو کر ایک تنگ سی سڑک پر ...ے لگا۔ ایک سڑک ختم ہوتی تو دوسری شروع ہو جاتی اور دوسری سڑک تیسری سڑک پر

---

[1] پنجاب میں جب بہن اپنے بھائی کو بڑی محبت سے مخاطب کرتی ہے تو اسے "ویرا" کہتی ہے۔

چھوڑ دیتی۔ تانگہ کئی بازاروں کے موڑ گھومتا کئی چوکوں میں سے گزرا۔ ہر سڑک، ہر بازار، ہر چوک میں لوگوں کے ہجوم تھے جو آجا رہے تھے۔ دکانیں کھلی تھیں۔ خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ سڑک ا پر الگ دکانیں سجی تھیں۔ پیدل چلنے والوں میں کہیں کوئی عورت تھی، کہیں کوئی مرد، کہیں بوڑھا اور کہیں جوان۔ عورتیں برقعہ پوش بھی تھیں اور بدصورت بھی۔ صحت مند بھی تھیں اور مریل بھی۔ کہیں نئی سڑک بن رہی تھی اور انجن گڑگڑا رہا تھا اور کہیں پرانی سڑک پر لاریا اور موٹریں گرد کے بادل اڑاتی گزر رہی تھیں۔ کہیں مداری لوگوں کو جمع کئے اپنے کرتب دکھلا رہا تھا اور کہیں جلسہ ہو رہا تھا اور کوئی صاحب زور زور سے چیخ رہے تھے۔ کہیں دکانوں پر پھول بک رہے تھے اور کہیں لمبے لمبے بانس فروخت ہو رہے تھے۔ ایک جگہ مج لگا تھا اور ایک مسخرہ چہرے پر سرخی تھوپے بانس کے کٹہرے پر اچھل کود مچا رہا تھا اور لو خوب ہنس رہے تھے۔ ایک طرف گنے کا رس بک رہا تھا اور دوسری طرف گندگی سے بھ ہوا گداگروں کی چال چلتا گزر رہا تھا۔ ایک اور جگہ سینما ہال کے باہر ڈھول پیٹا جا رہا تھا ایک آدمی گھنٹی ہلا ہلا کر چلا رہا تھا۔

”آ گئی آ گئی مس نمی آپ کے شہر میں۔ برسات کا آخری شو دیکھئے ۔ ۔ ۔ مس نمی مورا لال دوپٹہ ہائے ۔ ۔ ۔ اوئی ۔ ۔ ۔ ارے مار ڈالا ظالم ۔ ۔ ۔ ۔“

یہاں کتنی رونق ہے۔ کتنا ہنگامہ ہے اور جیبہ گلی کتنی سنسان جگہ ہے۔ وہاں تو دو کو بھی مرغ اذانیں دیتے ہیں اور کتے بھونکا کرتے ہیں۔ رشیم کا دل اداس ہونے کے با بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا اور وہ ہر چوک میں اتر کر کھیل تماشے دیکھنا چاہتی تھی۔ تا والے نے دو ایک بار پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ کس سے ملنے جا رہی ہے لیکن اس نے ص اتنا ہی کہہ دیا کہ وہاں اس کا بابو کام کرتا ہے۔ اس کے بعد کوچوان نے کوئی سوال کتنی ہی دیر ہو گئی۔ کتنے ہی بازار گزر گئے لیکن ٹھنڈی سڑک ابھی تک نہ آئی تھی۔ رشیم قدرے پریشان ہو کر پوچھا۔

”ابھی ٹھنڈی سڑک نہیں آئی؟“

”بس اب آ گئی بہن جی۔“

تانگہ اب شہر کے اس علاقے میں سے گزر رہا تھا۔ جہاں سڑکیں بڑی کھلی اور ہموار تھیں اور ان کی دونوں جانب جھکے ہوئے سایہ دار درخت تھے۔ اور اونچی اونچی پکی عمارتیں تھیں۔ کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے باغیچے تھے۔ جہاں درختوں میں سے خوبصورت رنگدار مکان دکھائی دے رہے تھے۔ رشیم اس علاقے میں آکر کچھ کھو سی گئی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی ایسے خوبصورت مکان، پختہ سڑکیں اور ان پر بھاگتی ہوئی چمکیلی موٹریں نہ دیکھی تھیں۔ تانگہ ایک جگہ موڑ گھوما اور ایک پہلے سے زیادہ خوبصورت اور شاندار اور بارونق سڑک پر پہنچ کر رک گیا۔

”آ گئی ٹھنڈی سڑک جی۔“

رشیم کمبل سمیٹ کر نیچے اتر کر پوچھنے لگی۔

”وہ دفتر کہاں ہے بھائی؟“

کوچوان نے یونہی ایک خوبصورت سبز بلڈنگ کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”اس مکان میں ہے۔“

اور پیسے لے کر گھوڑا ہانکتا وہاں سے چل دیا۔

رشیم اتنی بڑی اور عظیم الشان سڑک کے کنارے بالکل تنہا رہ گئی۔ سڑک پر کاروں کا تانتا بندھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے ڈر ڈر کر سڑک عبور کی اور کوچوان کی بتائی ہوئی سبز عمارت کے نیچے جا کر کھڑی ہو گئی۔ یہ عمارت بہت ہی بلند تھی اور اس پر ایک بہت بڑا سائن بورڈ لگا تھا۔ جس پر ایک آدمی کوئی دیو ہیکل انجن چلاتا دکھایا گیا تھا۔ نیچے دالانوں میں کئی ایک سائیکلیں کھڑی تھیں۔ درختوں کے نیچے چند ایک موٹریں بھی کھڑی تھیں۔ ایک آدمی کار میں سے پاؤں باہر نکالے ہوئے تھا اور پھٹی ہوئی بنیان والا ایک دبلا سا لڑکا پاؤں کو اپنے زانو پر رکھے بڑی گرمجوشی سے جوتا پالش کر رہا تھا۔ سبز بلڈنگ کی سیڑھیاں پتھر کے ایک چبوترے سے ملی ہوئی تھیں۔ اس چبوترے کی دیوار کے ساتھ ایک پان سگریٹ والا بیٹھا جھک کر کوئی پرانا فلمی پلاٹ پڑھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ ہل بھی رہا تھا۔ رشیم آہستہ سے چل کر اس کے پاس آئی اور بولی۔

"میرے ویر، جاٹے کمپنی کا دفتر کہاں ہے؟"

"میرے ویر،" نے پیلی پیلی آنکھیں اٹھا کر اپنے سامنے ایک دیہاتی عورت کو دیکھا

"کون سی کمپنی کا دفتر ڈھونڈھتی ہے۔ لفٹن جاٹ کا یا بروخ بانڈ کا؟"

ریشم کچھ نہ سمجھ سکی۔ اس نے چادر کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

"پتا نہیں . . . . وہ جاٹے کی کمپنی کا دفتر ہے۔ ان کا ایک دفتر پہاڑ پر . . . پنج ناگ میں بھی ہے۔"

پنواڑی بولا:

"تو لونڈیا، ہی یاں، سے سیدھے چلی جاؤ۔ چوک کے آگے اسی ہاتھ کو ایک لال بلڈ آئے گی، ہو واں سے پتا کر لیو۔"

اتنا کہہ کر وہ پھر فلمی پلاٹ کے مطالعے میں منہمک ہو گیا۔

"اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے
کوئی یہاں گرا کوئی ہو واں گرا . . . ."

ریشم کچھ نہ بولی اور چپ رہی اور دکھے دکھے دل کے ساتھ سڑک کنارے روانہ ہو
کاریں بڑی ہموار خاموشی سے اس کے قریب سے گزر رہی تھیں۔ کسی کے اندر سرخ با
اڑ رہے تھے اور کسی میں اکڑی ہوئی مونچھوں کے درمیان سگار کا دھواں اڑ رہا تھا۔
ریشم نے ایک موٹر کے پیچھے بسنتی رنگ کی چھوٹی سی گڑیا لہراتے دیکھی اور وہ بڑی خو
ہوئی۔ وہ گڑیا آزو بازو گھومتی ہوئی کتنی پیاری لگ رہی تھی۔

"فٹ پاتھ پر چلو کڑیئے"

ایک ٹریفک کانسٹیبل نے اسے سڑک پر چلنے سے روکتے ہوئے کہا۔ وہ جلدی
فٹ پاتھ اور سڑک کے درمیانی گھاس کے قطعوں میں آگئی۔ تھوڑی دور چلنے پر ا
ایک بوڑھے مالی نے ٹوکا۔

"اس پٹڑی پر چلو بیٹی"

"اچھا بابا جی"

اور وہ پتھریلی پٹڑی پر آگئی جو درختوں کی چھدری چھاؤں میں دور تک چلی گئی تھی اور
ہاں کئی دوسرے لوگ بھی چل رہے تھے۔ پنواڑی کی بتلائی ہوئی سرخ بلڈنگ میں پہنچ کر
یشم کو دوسرے چوک والی زرد بلڈنگ میں جانا پڑا۔ اور جب وہ زرد بلڈنگ میں پہنچی تو اسے
پتا چلا کہ وحید نامی سیلزمین لاہور کے دفتر سے تبدیل ہو کر ڈھاکہ یعنی مشرقی پاکستان چلا گیا ہے
یشم کا دل وہیں بیٹھ گیا اور اسے چکر سا آگیا۔

تو کیا وحید نے اسے دھوکا دیا تھا؟ لیکن وہ تو اسے بہت چاہتا تھا۔ وہ تو اس کے
لوں میں چنبہ کلی اور تنزاری کے پھول سجایا کرتا تھا اور وہ اس کے لیے دوائیاں لینے شہر
یا تھا۔ وہ اسے کیسے دھوکا دے سکتا ہے۔ وہ ضرور یہیں ہے۔ یہ لوگ غلط کہہ رہے
یں اور جب ریشم کو پوری طرح معلوم ہو گیا کہ اس کا مسافر . . . اس کا وحید اسے چھوڑ کر چلا
یا ہے تو وہ یوں سیڑھیاں اترنے لگی۔ جیسے نیچے سڑک پر لوگوں کا ہجوم کلہاڑیاں، نیزے
ر تلواریں لیے اس کا انتظار کر رہا ہو۔ سڑک پر آکر زخمی امیدوں کی بلکتی ہوئی نگاہوں
ے گزرتی کاروں کو دیکھا۔ ایک دو منزلہ بس بڑی شان سے گزر گئی۔ ریشم کا اداس چہرہ
ر اداس ہو گیا۔ اب وہ اس میں بیٹھ کر کہاں کی سیر کرے۔ اس نے سوچا تھا جب وہ
حید سے ملے گی تو اسے کہے گی:

"مجھے اس اونچی موٹر کی سیر کراؤ وحید"

لیکن اب سب امیدوں کے دیے بجھ گئے تھے۔ سب دیوں کا تیل ختم ہو گیا تھا۔
یشم ٹھنڈی سڑک کے ساتھ والے گھاس کے تختے میں بیٹھ گئی۔ اس سے پیشتر اسے بڑی
وک لگ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وحید اور وہ دونوں مل کر کچھ نہ کچھ کھائیں گے اور
ب وہ اسے دیکھے گا . . . . شہر کی سب سے عالیشان سڑک پر دیکھے گا تو خوشی سے اس کا
رہ سورج کی مانند دمکنے لگے گا اور وہ اس سے لپٹ جائے گا اور وہ مسرت کے ریشمی ڈھیر
لے دب جائے گی اور کہے گی:

"ہائے میرا دم گھٹ رہا ہے وحید . . . وحید . . . وحید!"

مگر اس کی رنگین سوچ، انگوٹھی پر چڑھا ہوا ملمع تھا۔ جو شہر کی تیز دھوپ لگتے ہی

فوراً اتر گیا تھا اور اب اس کی ایک جانب پتھریلی سڑک تھی اور دوسری جانب سنگین فٹ
اور ان کے درمیان وہ گھاس پر اداس بیٹھی تھی اور پتھروں کے درمیان کھلا ہوا پھول . .
نرگس کا پھول سلگتے انتظار کی تلخ آنچ میں کملا رہا تھا۔ ریشم کی بھوک مر گئی تھی اور وہ سوچ
رہی تھی ۔ وہ اب کہاں جائے ۔ ریشم ! اری او ریشی ! اب کیا ہوگا ۔ تو اپنے گھر واپس نہیں
سکتی ۔ وہاں تجھے اب کون منہ لگائے گا ۔ تو اتنے بڑے شہر میں بھی کہاں رہے گی ۔ یہاں تیر
کون ہے بدنصیب گوالن ! . . . پھر کہاں جائے گی ۔ اس ننھی سی جان کو ساتھ لیے بھو
پیاسی کہاں ماری ماری پھرے گی . . . ریشم ! اری او ریشی !! . . .

ریشم کتنی ہی دیر وہاں بیٹھی رہی ۔ دن ڈھلنے لگا ۔ ساری دوپہر بیت گئی ۔ زرد
دھوپ کے آخری افسردہ نشان بلند عمارتوں کے آخری کناروں تک پہنچ گئے ۔ ان گن
لوگ فٹ پاتھ پر سے ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے ۔ کتنی ہی موٹریں، بسیں، کاریں
تانگے ٹھنڈی سڑک پر سے گزرتے رہے، نظروں سے اوجھل ہو گئے ۔ لیکن ریشم تنہا
کمبل پاس رکھے گھاس پر دم بخود سی ہو کر بیٹھی رہی ۔ اس کے سر پر جھکے ہوئے درخ
کی شاخوں میں چڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا ۔ ریشم نے بچوں کی طرح اپنا اترا ہو
سوگوار چہرہ اٹھا کر اوپر دیکھا اور اسے اپنے گاؤں میں باؤلی پر جھکے ہوئے چناروں
درخت یاد آ گئے ۔ جن کے چوڑے چوڑے پتوں میں چھپ کر شاما چڑیا اور دوسر
پرندے میٹھے گیت گایا کرتے تھے ۔ اس کا جی بھر آیا اور پلکیں گرم ہو کر کانپنے لگیں
بھورے رنگ کا ایک کمزور سا کتا فٹ پاتھ پھلانگ کر باغ میں آیا اور گھاس پ
کود مچاتے ہوئے اپنی آزادی اور بے فکری کا اظہار کرنے لگا ۔ پھر وہ ریشم کے پا
اسے ہانپتی ہوئی زبان باہر لٹکائے گردن ٹیڑھی کر کے یوں تکنے لگا، جیسے پہچاننے کی کوشش
ہو ۔ ریشم نے بڑی محبت سے اپنا ہاتھ اس کی گردن پر پھیرا اور وہ جیسے موم سا ہو گیا
کے پاؤں میں لوٹنے لگا ۔ سڑک کے اس پار سے کسی نے زور سے سیٹی بجائی اور وہ ا
دم اچھلا اور دیکھتے دیکھتے سڑک کے اس پار جا پہنچا ۔ ریشم کو وہ کتا بڑا پیارا لگا ۔
اس لیے کہ اس سڑک پر وہ پہلا جاندار تھا ۔ جس نے ریشم کے پاس آ کر اس کا حال پ

کتے کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی وہ پھر اکیلی رہ گئی اور سوچنے لگی کہ وہاں سے اٹھ کر
بس اپنے جنگلوں کو جائے یا کسی دو منزلہ بس کے آگے لڑھک کر خودکشی کر لے ۔ بھوک سے
ں کا دل گھٹنے لگا تھا ۔ اس نے سوچا کہ وہ کہاں جا کر روٹی کھائے ۔ اتنے بڑے شہر میں کیا
انے اسے روٹی کہاں ملے ۔ پھر خود ہی اسے ریلوے سٹیشن کا خیال آ گیا ۔ ٹھیک ہے اسے
یشن پر جانا چاہیے ۔ جہاں وہ کچھ کھا پی کر دوسری عورتوں کے ساتھ رات بھی گزار سکے
ر اس دوران میں اچھی طرح سوچ لے گی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے ۔ اس نے خواہ مخواہ ٹھنڈی
رک پر بیٹھ کر اپنا وقت گنوایا ۔

اس نئے خیال کے ساتھ ہی وہ اٹھی اور اِدھر اُدھر تانگہ تلاش کرنے لگی ۔ ذرا پرے
بتوں تلے چند ایک خوبصورت تانگے کھڑے تھے ۔ جن کے ساز چمک رہے تھے ۔ ریشم
نے جب ایک کوچوان کو سٹیشن پر چلنے کا پوچھا تو باقی کوچوان بھی اس کے پاس آ گئے ۔ آخر وہ
سیاہ رنگ کے ایک تانگے میں بیٹھ گئی اور تانگہ سٹیشن کی طرف چل پڑا ۔

اسٹیشن پر پہنچ کر اس نے ایک جگہ کھمبے کے پاس بیٹھ کر پانی ایسے شوربے کے ساتھ
پتلے سیاہ آٹے کی روٹی کھائی اور ٹین کے ڈبے میں پانی پیا اور ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گئی
تھوڑی دیر بعد جب سٹیشن کی تمام بتیاں روشن ہو گئیں اور لوگوں کی آمد و رفت کا شور
ہو گیا تو اس نے ایک قلی سے پوچھا ۔ چک ممیر جانے والی عورتیں کہاں بیٹھتی ہیں ۔ قلی
نے اسے ایک آہنی جنگلے کے اندر پہنچا دیا ۔ جہاں لمبے لمبے سیاہ بنچوں پر کچھ دیہاتی عورتیں
بیٹھی تھیں، ایک عورت گود میں پوٹلی کھولے روٹی کھا رہی تھی اور دوسری اپنی قمیص اوپر
اٹھائے سانولے رنگ کے کمزور بچے کو دودھ پلا رہی تھی ۔ ریشم ایک خالی بنچ پر سب سے
الگ ہو کر بیٹھ گئی، جہاں وہ بیٹھی تھی ۔ وہاں اس کے بالکل سامنے پُل کی سیڑھیوں پر سے
مسافر اپنی گٹھڑیاں اور بقچیاں اور صندوق اور چارپائیاں سنبھالے نیچے اتر رہے تھے ۔
ان مسافروں میں ریشم نے سانولے رنگ کی ایک دیہاتی دلہن کو دیکھا جس نے گوٹہ لگے
سرخ کپڑوں کے ساتھ سوسی کی بھاری کامدار چادر اوڑھ رکھی تھی ۔ چادر ٹھیک کرنے کے
لیے اس نے ہاتھ اوپر اٹھایا تو ریشم نے دیکھا کہ اس کی ہتھیلی مہندی کے رنگ سے سیاه

ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان دیہاتی تھا۔ جس کی مونچھیں اوپر اٹھی ہوئی تھیں
گلے میں سونے کا کنٹھا تھا۔

ریشم ان دونوں کو کھلی ہوئی پُرشوق نگاہوں سے سیڑھیاں اترتے دیکھتی رہی۔ یہا
تک کہ وہ سٹیشن کا صحن عبور کر کے سڑک پر لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گئے۔ پلیٹ فا
کسی انجن نے خشک سی آواز میں سیٹی بجائی اور چھک چھک کرتا آگے نکل گیا۔ ریشم کو
لگا جیسے وہ انجن اس کے اوپر سے گزر گیا ہو۔ اسے ویران صحراؤں میں بکرانے والے
کی وحشت ناک سرگوشیاں سنائی دیں اور اس نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا لیا اور
بھر بھر کر رونے لگی۔

"نی مائے ... میرئیے مائے ...."

کسی نے اسے روتے نہ دیکھا۔ کسی نے اس کی سسکیوں کی آواز نہ سُنی۔ کسی
کے آنسو نہ پونچھے۔ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نہ کہا "رؤو نہیں ریشم! یہاں
آنسو کون دیکھے گا۔ یہاں تو سبھی مسافر ہیں سبھی اجنبی ہیں۔ ان موتیوں کو سٹیشن
پتھریلے فرش پر نہ گراؤ۔ انھیں اپنے محبوب کے دامن کے لیئے سنبھال کر رکھو،
کی نیلی دھند کے اس پار تیرے لیے نازک ڈنٹھلوں والے کیسری پھول لینے گیا
مت رو.. مت رو... " ریشم نے خود ہی اپنے آنسو پونچھے اور صبر کر کے بیٹھی ر

ایک بھدی سی ادھیڑ عمر کی عورت لمبا سفید برقعہ اوڑھے، نقاب اٹھا
اس احاطے میں داخل ہوئی اور ریشم کے بنچ پر ذرا ہٹ کر بیٹھ گئی۔ ریشم نے اس
کوئی دھیان نہ دیا اور اپنے خیالوں میں ڈوبی رہی۔ ایک دو لمحے وہ عورت خاموش
تھکن اتارتی رہی۔ پھر اپنا سر ریشم کی طرف پھیر کر بولی:۔

"کہاں جانا ہے بیٹی؟"

ریشم پہلے تو گھبرا گئی۔ لیکن فوراً ہی سنبھل گئی اور اس کے منہ سے خود بخود نکل گیا

"حمیر... چک حمیر"

"حمیر؟ ... مگر حمیر جانے والی گاڑی تو تڑکے جائے گی"

"اچھا؟" ریشم نے جھوٹ موٹ تعجب کا اظہار کیا۔

"ہاں بیٹی ... ابھی تو پوری رات باقی ہے"

وہ عورت خاموش ہو گئی۔ ریشم نے دیکھا کہ اس کا رنگ گہرا سانولا ہے۔ اور ماتھے
داہنی جانب کسی زخم کا لمبا نشان ہے۔ اس کی عمر کافی تھی۔ لیکن چہرے پر ایک بھی جھرجھری
ھی۔ چہرا گول، منہ چوڑا، ناک چپٹا اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ آواز بھاری اور بے ہنگم
تھی۔ جیسی کہ اس عمر میں پہنچ کر بھدی عورتوں کی ہو جاتی ہے۔ دانت پان کھانے کی
سے بڑے گندے ہو رہے تھے اور کنپٹیوں پر کہیں کہیں سفید بال دکھائی دے رہے
ھے۔ اس نے ریشم کو بتایا کہ اس کی بڑی لڑکی کراچی سے آنے والی تھی لیکن پتا نہیں کیوں
ں آسکی اور اب وہ ذرا دم لینے کے لیے وہاں آن بیٹھی ہے۔

"کراچی میں اس کا خاوند دفتر میں ملازم ہے۔ یہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ بیٹے
بس سڑکیں ماپتے ہیں یا دنگل دیکھتے ہیں۔ مجھے تو اپنی بیٹی سے ہی پیار ہے۔ خدا خیر کرے
وہ نہیں آئی۔ شاید صبح کوئی خط آئے"

ریشم کو اس عورت کی باتیں بڑی مانوس لگیں اور وہ ان میں دلچسپی لینے لگی۔

"آپ کی بیٹی کی عمر کتنی ہے؟"

"یہی کوئی پچیس سال۔ اری وہ تو بڑی مضبوط لڑکی ہے۔ تین بچے ہیں اور جب
دھو کر کپڑے پہنتی ہے تو بالکل کنواری معلوم ہوتی ہے۔ اس کا ایک لڑکا تو بڑا ہی
ار ہے۔ اس کا نام الیاس ہے۔ اس ننھے میاں کو سوائے دن بھر چیرتے رہنے کے اور
کوئی کام نہیں۔ میں کہتی ہوں۔ ایسا پلیٹو بچہ میں نے آج تک نہیں دیکھا"

ریشم ہنسنے لگی۔

"بچے ایسے ہی ہوتے ہیں"

"مگر بھئی ایک حد بھی تو ہوتی ہے"

باتوں ہی باتوں میں وہ ایک دوسرے سے گھُل مل سی گئیں۔ وہ عورت کھسک کر ریشم
اور نزدیک آگئی اور پوچھنے لگی۔

"تمہارے کتنے بچے ہیں بیٹی ؟"

ریشم شرما گئی۔ اس کا چہرہ حیا اور ندامت سے لال ہو کر زرد زرد سا ہو گیا۔

"میری ابھی شادی نہیں ہوئی"

اس پر وہ عورت ہنس پڑی اور ریشم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"اللہ بھاگ اچھے کرے بیٹی کے۔ خیر سے دلہن بنے اور سدا سہاگن بن کر رہے۔ بیٹی تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں"

ریشم نے چادر کا پلو ٹھیک کیا۔

"میرا نام ریشم ہے"

وہ عورت اس نام پر کچھ تعجب کا اظہار کرنے لگی۔

"ریشم کیا ہوا بیٹی"

"میرا نام"

"تو پھر ریشماں ہوگا"

"یہی سمجھ لیجئے"

"خوب خوب ... بڑا پیارا نام ہے۔ اگر اب میرے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو میں اس کا نام ریشماں ہی رکھوں گی۔ ادھر شہروں میں آج کل ناموں کا فیشن بڑا بدل گیا ہے سلیما دیکھ کر لڑکیوں نے اپنے نام بھی اسی طرح کے رکھ لیے ہیں۔ نرگس، ششی، گلو، انجنا وغیرہ وغیرہ"

ریشم نے پوچھا۔

"یہ سلیما کیا ہوا ماں جی ؟"

"تم نے کبھی نہیں دیکھا ؟"

"جی نہیں"

"یہ ڈرامہ ہوتا ہے بیٹی۔ ایک چورس پردے پر ہوتا ہے۔ گھوڑے دوڑتے ہیں بندوقیں چلتی ہیں۔ شادیاں ہوتی ہیں۔ گانے ہوتے ہیں ... دو گتّاں کرمیریاں ... پیار و محبت کی باتیں ہوتی ہیں اور سوڈا لیمن، پان، سگریٹ، گنڈیریاں ... سب

نا ہے"

ریشم کو اپنی طرف پُرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے محسوس کر کے وہ عورت پلٹ کر بولی۔

"میں تو کہتی ہوں آج رات میرے گھر آرام کرو اور صبح پہلی گاڑی واپس چلی جانا۔ ہم سلیما ی دیکھیں گے اور سوڈا لیمن بھی پئیں گے"

ریشم شرما کر ہنس پڑی۔

"جی نہیں آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔ میں یہیں پڑی رہوں گی"

"تمہاری مرضی ہے لیکن بیٹی یہ لاہور شہر ہے۔ جوان جہان لڑکی کا گھر سے باہر رہنا یک نہیں اور پھر تیرے ایسی سیدھی سادھی گائے کو کیا خبر کہ زمانہ کتنا نازک ہے۔ میرا یہی خیال ہے کہ میرے ساتھ گھر چلو۔ یہی سامنے والی گلی میں ہے۔ وہاں میری دو بہنیں ران کی بیٹیاں بھی ہیں اور آج تو گیارھویں کا ختم شریف تھا۔ بڑی رونق ہو رہی ہوگی بح تمہیں خود ریل میں چھوڑ جاؤں گی۔ ویسے آگے تمہاری مرضی ہے۔ میرا فرض تمہیں کہنا ہی ھا۔ وہ میں نے پورا کر دیا"

ریشم سوچ میں پڑ گئی۔ وہ سٹیشن پر رات گزارتے ہوئے پہلے ہی کچھ گھبرا رہی تھی۔ اسے ر تھا، کہیں کوئی اس کی پیسوں کی پوٹلی نہ لے اڑے۔ پردیس میں وہ پوٹلی ہی اس کا سرمایہ ھا۔ لیکن وہ اس عورت کے ساتھ جاتے ہوئے بھی ہچکچا رہی تھی۔ وہ کیوں خواہ مخواہ کسی کے گھر جائے۔ کیا خبر اس کی بہنیں اسے بُرا مانیں اور تم سے اچھا سلوک نہ کریں اور پھر اسے یہ بھی ڈر تھا کہ ایک اجنبی گھر میں پہنچ کر اس پر طرح طرح کے سوالات کیے جائیں گے ن کے وہ جواب نہ دے سکے گی۔ یا ان کا وہ جواب دینا نہ چاہتی تھی۔ پھر بھی سٹیشن پر بسر ہونے والی رات کا تصور بڑا ہمت شکن اور کچھ عجیب سا تھا۔ اس نے کبھی کوئی رات ھر سے باہر یوں کس مپرسی کے عالم میں پلیٹ فارموں پر نہ گزاری تھی۔ اسے گھر سے محبت تھی اور گھر نے بھی کبھی اسے اپنے سے جدا نہ کیا تھا۔ پردیس میں آنے والی دوسری رات کے اندھیرے میں جب اس نے ایک مہربان میزبان کو گھر کے کھلے دروازے میں کھڑے مسکراتے ہوئے دیکھا تو وہ چلتے چلتے رک گئی۔

"آپ کی مہربانی ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہیں صبح گاڑی نہ چھوٹ جائے۔"

اس پر وہ عورت بولی،

"اس کا ذمہ میں لیتی ہوں بیٹی میں تو تمہارا ہی فائدہ سوچ رہی ہوں۔ میں کہتی ہوں تو بھولی بھالی ہے اور یہاں کے لوگوں کو نہیں جانتی۔ یونہی کسی سے کوئی نقصان پہنچ گیا تو عمر بھر کا رونا گلے پڑ جائے گا۔"

ریشم نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"اگر۔۔۔ اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو میں چلی چلتی ہوں۔"

وہ عورت ایک دم بڑی خوش ہو گئی اور ریشم نے سوچا شہر میں اپنے گھر میں مہما کو داخل ہوتے دیکھ کر خوش ہونے والے لوگ موجود ہوں۔ وہ کیسے ایک برا شہر ہو ہے جب وہ اس عورت کے ساتھ سٹیشن کی عمارت سے باہر آئی تو اچانک اس کے د میں جیسے خطرے کی ہلکی سی گھنٹی بجی۔ ریشم نے چلتے چلتے ایک لمحے کے لیے اپنی میزبان کو دیکھا، وہ منہ ہی منہ میں کسی آیت کا وِرد کرتے چلی جا رہی تھی اور اس کے گول گو چہرے پر بڑی نرمی اور شرافت تھی۔ ریشم اپنا اس بھیانک خیال پر ہنس پڑی اور ا بڑی ندامت محسوس ہوئی کہ اس نے اپنی میزبان کی نیک دلی پر شک کیا۔

بازاروں میں دکانوں پر لیمپ روشن ہو گئے تھے۔ سڑک پر تانگے والے شو مچا رہے تھے۔ کسی دوکان پر سبز روشنی ہو رہی تھی تو کسی جگہ سرخ۔ بعض دوکانو بڑے زور شور سے لاؤڈ سپیکر فلمی گیت اور قوالیاں گا رہے تھے۔ ایک مسجد کچھ لوگ شام کی نماز پڑھ کر باہر نکل رہے تھے۔ ایک فقیرنی اپنے بچے کو زمین پر بھیک مانگ رہی تھی۔ دو آدمی ہوٹل کے باہر لوہے کی کرسیوں پر بیٹھے کسی با جھگڑ رہے تھے۔ پاس ہی ایک پٹھان چھریاں تیز کرنے والی مشین کے پاس کھڑا جھگڑا بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ دوسری جانب پھلوں والی دوکان کے آگے پہلوان سر کی مالش کرواتے ہوئے لڑکے سے بار بار کہہ رہا تھا۔

"اوئے دماغ پر زور نہ ڈالو۔"

چونگی کے دفتر کے باہر ایک ٹرک کھڑا تھا جو انگور کے ٹوکروں سے بھرا ہوا تھا۔ چونگی کا محرر چھڑی ، ان ٹوکروں کو ٹھوکے دے رہا تھا اور پھر کان دھر کر جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کلینر ریٹ پیتے ہوئے ڈرائیور سے کہہ رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے۔ ان میں انگور نہ ہوں۔ چرس ہو۔ بٹیرے ہوں۔۔۔۔"

پرانے کپڑوں اور پرانے جوتوں کی جھکی جھکی ڈربہ نما دکانوں والے لمبے بازار میں سے زرتے ہوئے ریشم کی میزبان عورت ایک گلی کی ڈھلان اترنے لگی۔ گلی کے سرے پر مپ روشن تھا۔ تھوڑی دور جا کر وہ ایک اور گلی میں گھوم گئیں۔ جہاں اندھیرے میں کچھ لوگ ارپائیوں پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور باتیں کرتے ہوئے گالیاں بھی دے رہے تھے۔

"یہاں بڑا اندھیرا ہے۔" ریشم نے سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹی۔۔۔ لڑکوں نے بلب توڑ دیے ہیں۔"

یہ گلی آگے جا کر چھوٹے سے تاریک غار میں بدل گئی۔ میزبان عورت نے اندھیرے میں ریشم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ریشم ڈر سی گئی۔

"کوئی نہیں بیٹا۔۔۔ ہاتھ پکڑ کر چلو۔ بس اب گھر آ گیا ہے۔"

گھر آنے سے پہلے ایک پرانے طرز کی حویلی کا بڑا سا دروازہ آیا جس کی محراب دار چھت میں چگادڑیں چیخ رہی تھیں۔ حویلی کی ڈیوڑھی میں دو تین گھوڑے بندھے تھے جو دانہ کھاتے ہوئے اپنے کھر زمین پر مار رہے تھے۔ وہاں بڑی بدبو تھی اور گرمی بھی ہو گئی تھی۔ وہ عورت ریشم کو ساتھ لیے حویلی کی ڈیوڑھی میں سے گزر کر اب ایک ایسے تنگ اور اندھیرے راستے میں سے گزر رہی تھی۔ جہاں دونوں جانب بے ڈھنگے ایک منزلہ مکانوں کے پچھواڑے لگتے تھے۔ یہاں جگہ جگہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے تھے اور مکانوں کے پرنالے بہہ رہے تھے۔ ریشم کا جی خراب ہونے لگا۔ اس نے کبھی گندگی اور تاریکی کو اتنی شدت سے ایک جگہ اکٹھے نہ دیکھا تھا اسے افسوس ہونے لگا کہ وہ کیوں اس عورت کے ساتھ ایسی جگہ آ گئی۔ اب وہ عورت ایک دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔

"لو بھئی گھر آ گیا۔ دراصل میرا اپنا مکان وسن پورہ میں بن رہا ہے اور میں کچھ دنوں کے

لیے یہاں آگئی ہوں۔"

مکان کا دروازہ آگے کو جُھکا ہوا تھا اور اس پہ بوریا لٹک رہا تھا۔ بوریا اٹھا کر وہ عورت ریشم کو ساتھ لیے اندر داخل ہوگئی۔ دالان تنگ اور پینگا ٹیڑھا تھا اور چاروں طرف دھواں ہی دھواں ہو رہا تھا۔ ایک چارپائی کے ساتھ بندھی ہوئی بکری چپکی بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔ چولہا روشن تھا اور ایک عجیب سی شکل والا بوڑھا روٹیاں پکا رہا تھا۔ کونے میں دیا جل رہا تھا جس کی پھیکی اور نحیف روشنی میں ہر شے صدیوں کی بیمار لگ رہی تھی۔

"یہ میرا ملازم ہے۔" اس عورت نے ریشم کے کان میں کہا۔

وہ آدمی عورت کے ساتھ ایک لڑکی کو بھی گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔

وہ عورت بولی:

"باقی لوگ کہاں ہیں صمدو؟"

صمدو اوپلوں کو پھونکنے لگا۔

"باہر گئے ہیں۔"

عورت نے برقعہ اتار کر الگنی پہ لٹکا دیا اور ریشم کو دیکھ کر مسکرائی۔

"چارپائی پہ بیٹھ جاؤ بیٹا۔"

ریشم کو اس گھر میں ایک عجیب سا ڈر محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ چارپائی کی پٹی پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔

"کھل کر بیٹھو بیٹی۔ میری بہنیں بس آتی ہی ہوں گی۔ شاید وہ بچی کو گھر تک چھوڑنے گئی ہیں۔ آج صبح ختم شریف تھا ناں ..... صمدو! تم اٹھو میں پکاتی ہوں اور ذرا بھاگ کر ایک آنے کے سادے پان تو لے آ..... سُن ..... جا کر مر نہ رہنا۔"

صمدو دھوتی کے پلو سے آنکھیں پونچھتا ہوا دروازے کا بوریا اٹھا کر

گیا۔ باہر اندھیری گلی میں کسی کتے کے کراہنے کی دردناک آواز آئی جیسے بے خیالی میں کسی نے اس کی زخمی ٹانگ پہ پاؤں رکھ دیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی چارپائی سے بندھی ہوئی بکری ممیا اٹھی اور ریشم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے خوفزدہ نگاہوں سے عورت کو دیکھا جو توے پہ روٹی ڈال رہی تھی۔ دھوئیں میں ٹمٹماتے دیے کی روشنی میں اسے وہ عورت کوئی جادوگرنی دکھائی دی جو آگ کے سامنے بیٹھی عمل پڑھ رہی ہو۔

ریشم دالان میں چارپائی پر سونا چاہتی تھی لیکن اس کی میزبان عورت نے روک دیا

"نا بیٹی! رات کو ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔ کوٹھڑی میں سو رہ۔ میں کھڑکی کھول دیتی ہو

کوٹھڑی دالان سے بھی تنگ تھی اور اس کی جھکی ہوئی چھت میں جھینگر بول رہا تھا جو عورتوں کی آواز سن کر چپ ہو گیا۔ اس عورت نے کھڑکی کھول دی اور کونے والے طاقچے میں دیا جلا دیا۔ ہلکی ہلکی بیدار ہوتی روشنی میں ریشم نے دیکھا کہ دیواروں پر بڑی خوبصورت عورتوں کی نیم عریاں رنگ دار تصویریں لگی ہیں۔ ایک طرف کونے میں د میلے لحاف لٹک رہے ہیں جن کے نیچے مٹی کی ہانڈی اور چند کنستر پڑے ہیں۔ چار پر بڑی میلی کچیلی چادر بچھی ہوئی ہے۔ پائنتی پر کالے رنگ کا کمبل تہ کیے رکھا ہے اور بھو سرہانے پر میل جم رہا ہے۔ فضا میں کچھ حبس اور ایسی بو تھی جیسے ساتھ والے مکا کہیں ہرمل سلگ رہا ہو۔ کھڑکی کے کھل جانے سے کوٹھڑی میں معمولی سی ہوا آ لگی۔ جس میں گھوڑوں کی لید کی بدبو شامل تھی۔

"لے اب لیٹ کر آرام کرو۔"

ریشم ایک عجیب کشمکش کے عالم میں بظاہر مسکراتے ہوئے چادر اتار کر چ پر لیٹ گئی۔ وہ عورت باہر جاتے جاتے رک گئی۔

"تم ضرور تھک گئی ہو گی۔ لاؤ تمہیں مالش کر دوں۔"

ریشم نے لاکھ انکار کیا مگر اس عورت نے ایک نہ چلنے دی۔ بڑے آرام سے چ

چڑھ کر بیٹھ گئی اور ریشم کی پنڈلیوں اور رانوں کو آہستہ آہستہ ملنے لگی۔ ریشم ہتھیار پھینک ی تھی اور یوں پاؤں پھیلائے لیٹی تھی جیسے وہ اس کا اپنا جسم نہ ہو۔ وہ عورت بڑے رے سے ریشم کا بدن مل رہی تھی اور ساتھ ساتھ محلے کی ان لڑکیوں کے فحش قصے بھی نائے جا رہی تھی جو راتوں کو چھپ چھپ کر اندھیری گلی میں اپنے عاشقوں سے ملتی ہیں۔

"پچھلے ماہ یہاں قریب ہی ایک پندرہ سال کی لڑکی کو حمل ہو گیا اور دو لڑکیاں ناجان ر سمجھتے ایک کوچوان کے ساتھ بھاگ نکلیں۔ کیسا زمانہ آگیا ہے۔ . . چلو اچھا ہوا روز وز کی بک بک سے نجات تو ملی۔ اب اپنا عیش کرتی ہوں گی۔ . . ٹانگیں سیدھی کر لو بیٹا۔"

اب اس کا ہاتھ ریشم کی رانوں پر سے ہوتا ہوا پیٹ کی طرف بڑھا۔ ریشم ایک دم سمٹ ئی۔

"کیوں بیٹا خیر تو ہے؟"

"جی کچھ نہیں، اب بس کریں۔" ریشم کو پسینہ سا آگیا۔

مگر وہ عورت باز آنے والی نہ تھی۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں ریشم کے پیٹ پر اتھ پھیر کر اسے بڑی تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر کی مانند ادھر ادھر ٹٹولا اور کچھ سوچ کر چپکی ہو رہی۔

"لو بھئی اب میں چلی۔ اب تم سو جاؤ۔"

"اور آپ کہاں سوئیں گی؟"

"یہیں تمہارے پاس۔ . . . ساتھ والی کوٹھڑی میں۔"

"صبح مجھے جلدی جگا دیں۔"

"ہاں ہاں بیٹی۔ . . . میں تمہیں نماز کے وقت اٹھا دوں گی۔"

اتنا کہہ کر وہ کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ جاتے ہوئے اس نے دروازہ بند کر دیا۔ دالان میں ایک دو بار اس کے سلیپر کے گھسٹنے کی آواز سنائی دی اور پھر خاموشی ھا گئی۔ ریشم چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ وہ کیسے عجیب سے گھر میں آ گئی ہے۔ جہاں سوائے ایک بوڑھی عورت کے اور کوئی نہیں۔ عورت بھی کتنی پُراسرار ہے کیسی باتیں کرتی ہے اور پھر اس نے مالش کیوں شروع کر دی تھی۔ وہ کچھ معلوم تو نہیں کرنا

چاہتی تھی۔ کہیں اسے ساری باتوں کا پتا تو نہیں چل گیا۔ اگر ایسا ہو گیا تو بہت بُرا ہو گا۔ مجھے واپس چلے جانا چاہیے۔ ہاں ریشی! صبح پہلی گاڑی میں سوار ہو کر اپنے گاؤں واپس چلی جا۔۔۔ اور اپنے باپو اور ماں کے پاؤں پر گر کر معافی مانگ لینا۔ پھر وہ بڑی جلدی سے کہیں نہ کہیں تیری شادی کر دیں گے اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔

ریشم کو جیسے تسکین سی ہو گئی اور بڑی مطمئن دکھائی دینے لگی۔ دالان میں بندھی ہوئی بکری ممیائی اور ریشم کو اپنی نیلی کا خیال آ گیا۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ وہ گھر میں اکیلی اداس اداس رہتی ہو گی اور سوچتی ہو گی۔ ریشی ایکا ایکی کہاں چلی گئی؟ اگھرا نہیں نیلی! میں پرسوں تیرے پاس پہنچ جاؤں گی اور پھر تجھے گود میں اٹھا کر بڑا پیار کروں گی اور باؤلی کے ٹھنڈے پانی میں نہلاؤں گی اور ہرا بھرا گھاس کھلاؤں گی۔۔۔ اگھر۔۔ پیارے گھر جانے کی خوشی میں اس کی پلکیں کانپنے لگیں اور خیال ہی خیال میں وہ اپنے آنگن والے پیڑ کے تنے سے لپٹ گئی اور اس کی کھردری سطح پر اپنے لرزتے ہونٹ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اب وہ کبھی کسی پردیسی سے بات نہ کرے گی۔ سارو ٹھیک کہتی تھی۔ سبھی مرد بے وفا اور خود غرض ہوتے ہیں۔ وہ بھونروں کی مانند پھولوں پر صرف رس لینے آتے ہیں۔ اور پھر اڑ جاتے ہیں اور کبھی اپنی شکل نہیں دکھلاتے۔ اب وہ کبھی باؤلی پر کپڑے دھوتے ہوئے یا جانوروں کو پانی پلاتے ہوئے کسی مسافر سے بات نہیں کرے گی۔ اب وہ کبھی شہر نہیں آئے گی۔ یہاں کتنا اندھیرا اور گندگی ہے۔ ہائے یہ لوگ کیسے رہتے ہیں! میں تو دوسرے ہی دن مر جاؤں۔

کھلی کھڑکی میں سے بدبو ابھی تک آ رہی تھی۔

ریشم اسے بند کرنے کے لیے اٹھی۔ کھڑکی میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی تھیں۔ دوسری طرف ایک مکان کی بہت ہی اونچی عقبی دیوار تھی۔ ہوا ٹھنڈی اور نم دار تھی جس میں ہر قسم کی بدبو شامل تھی۔ اندھیرے میں اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ پاس ہی کہیں ایک پرنالہ مسلسل آواز پیدا کرتا بدرو میں گر رہا تھا۔ ایک موٹا سا مچھر بھن بھن کرتا ریشم کے ناک پر بیٹھنے لگا۔ ریشم نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔ دیے کی بتی مدھم کی اور چارپائی پر لیٹ

ونے کی کوشش کرنے لگی۔ نیند اس کی آنکھوں سے بہت دور تھی۔ رات گاڑی میں بھی بے آرام رہی تھی اور دن بھر شہر کی سڑکوں پر چکر لگاتی رہی تھی۔ اس کے باوجود اسے نیند ہی تھی۔ جانے کیوں، اس گھر میں قدم رکھتے ہی اس کا دل دھڑکنے لگا تھا اور ابھی تک ہا تھا۔ اس گھر کی فضا میں، اس گھر کے گھٹے گھٹے دالان اور تنگ سی کوٹھڑی کی فضا سی موہوم سے خطرے کا احساس تھا۔ یہ خطرہ ریشم کو اپنے قریب بھی محسوس ہوتا اور بہت دُور ٹمٹماتے چراغ کی گرد آلود روشنی میں وہ دیوار پر ایک خوبصورت عورت کی رنگ دار تصویر گی جو بالکل ننگی تھی اور ایک ٹانگ اوپر اٹھائے سمندر کنارے ریت پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نے سوچا شہر کی عورتیں کتنی بے شرم ہوتی ہیں۔ کیسی بے حیائی سے ننگی ہو کر لیٹ جاتی ۔ اس تصویر کے ساتھ دوسری تصویر میں ایک عورت صرف جانگیہ اور انگیا پہنے گھوڑے ار تھی۔ وہ ہنس رہی تھی اور اس کے سنہری بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ گھوڑا بڑا طاقتور اور اگلی ٹانگیں اوپر اٹھائے ہنہنا رہا تھا۔ ریشم کو اپنے بے زبان خچر کا خیال آ گیا۔ جس ار ہو کر وہ اپنے گاؤں سے قاضی پور کی نہر تک آئی تھی اور جہاں پہنچ کر اس نے خچر وڑ دیا تھا۔ وہ بیچارہ دل میں کیا سوچتا ہو گا۔ کہتا ہو گا کہ اچھی مالکن ہے میری۔ اتنی سے مجھے ہنکاتی لائی ہے اور اب مجھے پانی پیتا چھوڑ کر جا رہی ہے۔ ریشم اپنے خچر کو یاد ے غمگین سی ہو گئی۔ شاید وہ سیدھا گھر نہ پہنچا ہو اور راستہ بھول گیا ہو اور اس وقت کسی ان کی لکڑیوں کا انبار اپنی پیٹھ پر لادے پہاڑ کی چڑھائی چڑھ رہا ہو۔ اس کا جسم پسینے میں ر ہو۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے ہوں اور کسان اسے بُری طرح پیٹ رہا ہو۔

"ہائے اسے نہ مارو۔ اسے نہ مارو۔ یہ بڑا بے زبان ہے۔ یہ بڑا نیک دل ہے۔۔۔۔"

ہاتھ اٹھا کر بے رحم کسان کو منع کرنے لگی اور اس نے دیکھا کوٹھڑی کا دیا پہلے سے مدھم ہو ہے، اور باہر دالان میں جیسے کوئی کسی سے کھسر پھسر کر رہا تھا۔ وہ ڈر گئی اور اس نے ی سے سیاہ کمبل اوپر کر لیا اور اسے ایک دم پسینہ آ گیا اور وہ ہمہ تن گوش ہو کر سرگوشیاں نے کی کوشش کرنے لگی جو کوٹھڑی کے بند دروازے میں سے اندر آ رہی تھیں۔ اس نے سوچا ہ جلدی سے اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر دے لیکن اس کے بدن کی طاقت جیسے ختم ہو

چکی تھی۔ اب کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے وہ بالکل بے سدھ پڑی رہی اور پھر وہ خود ہی اپنی حالت پر ہنس پڑی۔ وہ بھی کتنی پاگل ہے۔ یہ محض اس کا وہم تھا، بھلا اس گھر میں اسے کوئی کیسے نقصان پہنچا سکتا تھا۔ وہ تو وہاں مہمان بن کر اتری تھی اور پھر وہ عورت اس پر کتنی مہربان تھی۔ ریشم نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور کمبل ایک طرف کر کے ٹانگیں بڑی آزادی سے چارپائی پر پھیلا دیں اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اب اس پر آہستہ آہستہ غنودگی سی طاری ہو رہی تھی اور نیند کی لہروں پر ڈولنے لگی تھی کہ اچانک کسی نہ معلوم خوف کے تحت اس کی آنکھ کھل گئی اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایک عورت اور ایک مرد کوٹھڑی کے بالکل پاس دالان میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ عورت کی آواز ریشم نے فوراً پہچان لی، مرد کی آواز اکھڑی اکھڑی اور خوابی سی تھی۔

"میں کہتا ہوں تو بک بک کیوں کرتی ہے؟ ڈلا ابھی نہیں آیا تو میں نے اس کا ٹھیکہ نہ لے رکھا۔ میں تو ابھی جاؤں گا اور ڈلا آئے تو اسے بھی بھیج دینا۔"

عورت اسے دبی آواز میں منع کر رہی تھی،

"تو سؤروں کا ایک سؤر ہے۔ تو ہمیشہ اپنی کرتا ہے اور کسی کنجر کی نہیں سنتا۔"

مرد زور سے ہنسا اور اس کے ساتھ ہی کوٹھڑی کا دروازہ دھڑاک سے کھل گیا۔

ریشم تیزی سے ایک طرف سمٹ کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھیں خوف سے سفید ہو رہی تھیں اور جسم ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ خطرے کی وہ گھنٹیاں جو پہلے بڑی دور تھیں۔ اب بالکل صاف بج رہی تھیں۔ اس آدمی نے سب سے پہلے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی۔ پھر دیے کی بتی اونچی کی اور ایک طرف کو جھکا جھکا سا ریشم کے قریب آیا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا سر گول، آنکھیں وحشت ناک اور لمبی لمبی مونچھیں بڑی ڈراؤنی لگ رہی تھیں۔ ریشم نے زور سے چیخنا چاہا مگر آواز اس کے خشک حلق میں ہی دب کر رہ گئی۔

"میری جان۔۔۔ ہم سے نہ ڈرو۔ ہم تو تیرے ہمدرد ہیں۔"

"تم۔۔۔ تم کون ہو؟" ریشم نے سہمی ہوئی خشک آواز میں پوچھا۔

"میں۔۔۔ میں تمہارا عاشق ہوں جانی۔"

اس نے ایک انتہائی مکروہ قہقہہ لگایا اور ریشم کو زخمی کبوتری کی طرح اپنی آغوش میں دبوچ لیا۔ وہ اپنے جسم کی پوری قوت سے پھڑپھڑائی لیکن وہ دو لوہے کے لٹھ ایسے بازوؤں کی گرفت میں تھی۔ وہ صرف پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ اس نے اپنے چہرے پر تیز بُو والا گرم گرم سانس محسوس کیا۔ وہ نیم بے ہوش سی ہو گئی۔ اس نیم بے ہوشی کی حالت میں جیسے اسے کوئی نوکیلے پتھروں سے اٹی ہوئی سڑک پر نہ جانے کہاں کہاں گھسیٹتا لیے پھرا اور اس کا سارا بدن زخموں سے چھلنی ہو گیا اور جب اسے ہوش آیا تو وہ بستر پر بالکل برہنہ اوندھے منہ پڑی تھی اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا اور جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ خوفناک مونچھوں والا آدمی اس کے ساتھ لیٹا تھا اور بار بار اس کے گال چوم رہا تھا اور جیسے نشے میں اپنے آپ سے کہے جا رہا تھا۔

"میری کبوتری۔۔۔ میری جانی۔۔۔ میں تجھے اپنے تانگے پر شالامار کی سیر کراؤں گا۔ ہائے میری ملائی برف۔۔۔"

ریشم کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ اس کے ہونٹ بند تھے اور ویران حلقوں میں آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ وہ بڑے آرام سے لیٹی ہوئی تھی کہ اس پر اچانک قیامت آن پڑی تھی اور وہ زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہی تھی۔ اسے اپنے جسم کو ہلاتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کیا خبر وہ مر چکی ہو۔ اگر اس کی موت واقع ہو چکی ہے تو پھر وہ مر جائے گی۔ پھر وہ کہاں جائے گی۔ پھر وہ اپنی ماں اور باپو کے پاس کیسے جائے گی۔ پھر ان کے قدموں میں گر کر اپنے گناہوں کی معافی کون مانگے گا اور پھر نیلی۔۔۔ ننھی نیلی کو گود میں لے کر باؤلی کا ٹھنڈا پانی اور سیب کے باغ میں اُگی ہوئی گھاس کون کھلائے گا۔ نہیں نہیں وہ ابھی نہیں مری۔ وہ ابھی نہیں مر سکتی۔۔۔ مگر وہ زندہ بھی تو نہیں۔۔۔ پھر وہ کیا ہے؟ کہاں ہے؟ اس کے چھوٹے سے دیہاتی دماغ پر خیالات کے ایک بہت بڑے لشکر نے حملہ کر دیا تھا اور وہ کچھ بھی نہ سوچ سکتی تھی۔ اونچے درخت کی ٹہنی پر سے گری ہوئی انجیر کی طرح وہ سوکھے پتوں پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس کا سینہ زخمی ہو گیا تھا اور وہ اس بلند شاخ کو دیکھتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ جہاں سے وہ ٹوٹ کر گری تھی۔ وہ

ایک خواب کے عالم میں تھی اور ایک ایسے تاریک غار سے گزر رہی تھی جہاں ایک طرف ننگی عورتوں کو گرم گرم کھولتے تیل کے کڑاہوں میں پھینکا جا رہا تھا اور دوسری جانب ننھے ننھے معصوم بچوں کی آنکھیں دہکتی ہوئی سلاخوں سے پھوڑی جا رہی تھیں۔ اس غار میں آہ و بکا اور نالہ و شیون کی صدائیں تھیں۔ لمبی لمبی دردانگیز چیخیں تھیں اور کچھ نہ تھا۔ دالان میں بکری بڑے درد بھرے انداز میں ممیائی اور کسی کے قدموں کی بھدی آواز سنائی دی۔

"اندر گامی ہے۔ گامی ہے۔ مَیں کہتی ہوں اندر گامی ہے۔"

"گامی ہو یا کوئی اور مال کا یار ہو۔ ۔ ۔ مجھے کیا۔"

اس عورت کی آواز ایک بار پھر ابھری۔ دبی دبی، پُراسرار، گناہ آمیز!

"لڑکی حاملہ ہے، لالا سیٹھ۔"

"مَیں بھی حاملہ ہوں چاچی سیداں۔"

"تم سب سؤر ہو۔ سب سؤر ہو۔"

ریشم کے پہلو میں لیٹا ہوا گامی آہستہ سے اٹھ بیٹھا۔

"لو میری کبوتری۔ ۔ ۔ ہمارا سیٹھ آیا ہے۔ دُلا سیٹھ آیا ہے۔"

دروازہ زور سے کھلا اور گرجدار آواز سنائی دی۔

"ہینڈز اپ ہو جا اوئے گامیا تیری۔ ۔ ۔"

گامی دھوتی باندھتے ہوئے احمقوں کی طرح ہنس پڑا۔

"آؤ۔ ۔ ۔ آؤ۔ ۔ ۔ دُلا جی! مال تیار ہے جناب۔ گوری کدی تے گینے کدے"

دُلا دروازہ بند کر کے چارپائی پر جھک کر ریشم کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے غور سے دیکھنے لگا۔

"اوئے گامی! یہ چاچی سیداں نے مال بڑا اَبل نمبر مارا ہے۔ مائیں گا! تو تند انار ہیں اور پنڈا دیکھو۔ ۔ ۔ کیا ولائتی ساٹن ہے۔"

گامی گندے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔

"میم ہے میم دُلا جی۔"

"اچھا تو اب باہر بکری کے پاس بیٹھ۔"

"چلتے ہیں بادشاہو۔ ۔ ۔ یا ربّ جی! ہمارے گناہ معاف کر۔"

اب دُلا جی کی باری تھی۔ اب ایک اور انجیر ٹہنی سے ٹوٹنے کو تھی۔ اب ایک بار پھر بے داغ نازک جسم نوکیلے پتھروں پر اس افق سے اس افق تک گھسیٹا جانے والا تھا۔ دُلا چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کا جسم سانڈ کی مانند موٹا بھدا اور بدوضع تھا۔ اس کی ایک آنکھ کانی تھی اور اس میں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اس کی توند آگے کو بڑھی ہوئی اور ٹانگیں پتلی ہوئی تھیں اور اس کے منہ سے کوکین، مدھک اور دیسی شراب کی بُو اٹھ رہی تھی۔

"کیوں جی میم صاحب۔ ۔ ۔ بولو گے یا مار ہی ڈالو گے؟ اسے مَیں نے کہا ملائی دیو ڈیو! انگوراں دیئو گچھیو! ہائے قسم ہے جانی۔

ج۔ اساں دی واری مکھ پھیر نہ توں۔ سینے وچ بلدا بھانبڑ عشق۔ ۔ ۔ ۔

ہائے سوہنیو۔ ۔ ۔ کبھی ہم سے کبھی اوروں سے آشنائی ہے۔

ہائے ظالم پھر تو بھی تو نرا ہرجائی ہے۔ ۔ ۔

اور ایک بار پھر ریشم کو کھولتے ہوئے گرم کڑاہوں کے پاس لایا گیا اور جہنمی آگ کے شعلے اپنی نیلی نیلی زرد زرد زبانیں لہراتے ریشم کے ریشمی بالوں کی سمت بڑھے اور ابلتے تیل میں دہکتے ہوئے بھونڑ اس کی طرف لپکے اور اس کا رنگ زرد ہو کر سپید ہو گیا اور اس نے گردن پیچھے لٹکا دی اور اس کے منہ سے ایک خوفناک مہیب چیخ نکل گئی۔

"چھوڑ دو مجھے۔ ۔ ۔ چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو۔ ۔ ۔"

دُلے نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اور زور سے چیخنے لگی اور دُلے کے ناخن اس کے گالوں میں چبھ گئے اور چمبہ کلی کے نازک جلد والے سیب زخمی ہو گئے۔ ریشم زخمی مچھلی کی مانند تڑپنے لگی۔

"مجھے جانے دو، مجھے چھوڑ دو، مجھے جانے دو۔"

دُلا چارپائی پر اٹھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے ریشم کا گلہ دبانے کی کوشش کرنے لگا۔

ریشم میں نہ جانے کہاں سے طاقت آگئی تھی۔ اس کا جسم چشمے کے پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گیا تھا اور وہ جنگلی بلے کی طرح غرا رہی تھی اور نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ دُتے کا دُ بھول گیا اور ریشم اس کے قابو میں نہ آتی تھی۔ کمبل زمین پر گر پڑا تھا اور بستر کی چادر سمٹ کر چیتھڑا سا بن گئی تھی۔ دُلا ایک دم اچھل کر کونے میں گیا اور دوسرے لمحے وہ تیز دھار وا لمبا چاقو تانے ریشم کی طرف بڑھنے لگا۔

باہر گامی نے دروازے پہ آکر آواز دی۔

"منہ بند کرو اس بہن کی ۔ ۔ ۔ ۔ کا۔ پستول دوں، پستول دوں دُلا سیٹھ؟"

"نہیں" دُلا سیٹھ نے چاقو ریشم کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا "یہی کافی ہے"

ریشم کو چاقو کی تیکھی نوک اپنی چھاتی میں اترتی محسوس ہوئی۔ وہ بے دم ہو کر چار پر گر پڑی اور جیسے بیہوشی میں بڑبڑانے لگی۔

"جانے دو۔ مجھے جانے دو۔ مجھے گھر جانے دو"

دُلا بڑی مکروہ ہنسی ہنسا۔

"پگلی! اب گھر جا کر کیا کرے گی۔ اب تو تیرا یہی گھر ہے۔ ہم ہی تیرے سب کچھ یہاں بھلا تجھے کسی چیز کی کمی ہوگی۔ دُتے سیٹھ کے ساتھ رہ کر تو عیش کرے گی عیش! کیا بھی گھر کا نام لے گی؟"

ریشم آہستہ آہستہ کراہتی رہی۔

"مجھے گھر جانا ہے۔ اپنے گھر جانا ہے۔ جہاں میری ماں ہے۔ سفید بالوں والی ما میرا باپ ہے گاؤں کا رکھوالا باپ ۔ ۔ ۔ اور میری نیلی ہے۔ مجھے گھر جانا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ گ جانا ہے"

دُتے نے چاقو ایک طرف رکھ کر اپنا سانڈ ایسا بھدا، موٹا اور بدوضع جسم چمبہ کلی نازک پتی پر گرا دیا اور گندگی کے اس پہاڑ کے نیچے سے چمبہ کلی کی سوگوار آواز ۔ ۔ ۔ آواز آتی رہی ۔ ۔ ۔ "مجھے گھر جانا ہے۔ جہاں سیب کا باغ ہے اور چشمے کا ٹھنڈا پا اور اپنی پیٹھ پر منوں بوجھ لادے چپ چاپ چلنے والا خچر ہے۔ نیک دل جانور ہے

ماں ہے اور میری سہیلیاں ہیں۔ کاؤ کے درخت میں جھولے ڈال کر گیت گانے والی سہیلیاں یں ۔ ۔ ۔

میری ٹٹ گئی پینگ ہلاریوں :: میں کس دا کراں گھمنڈ۔

میں نے پینگ بڑھائی

اور وہ عین اوپر جا کر ٹوٹ گئی

اب میں کس بات کا گھمنڈ کروں؟

اور جہاں باؤلی کا پانی ہے اور چنار کا درخت ہے اور عشق کی ٹہنیوں میں چڑیاں راگ ا کرتی ہیں۔ مجھے ان کے پاس جانے دو۔ میں اس باؤلی پر اپنی گم شدہ محبتوں کے کتبے پڑھوں اور بیتی بہاروں کا سوگ مناؤں گی اور وہ معصوم آنکھوں والا بوڑھا کسان میرا انتظار کر رہا ا۔ اس نے کہا تھا۔ لوٹتی مرتبہ ضرور ملنا بیٹی، اور میں نے کہا تھا ضرور ملوں گی بابا۔ مجھے ں سے ضرور ملنا ہے۔ ضرور ملنا ہے اور وہ آدمی میرے خچر کو بری طرح پیٹ رہا ہے ہائے گھر کا راستہ بھول گیا تھا اور دیکھو اس پر کتنا بھاری بوجھ لدا ہے اور اس کی ٹانگیں کانپ رہی ، نتھنے پھول گئے ہیں اور اس سے اوپر نہیں چڑھا جاتا اور وہ آدمی اسے کتنی بیدردی سے ٹ رہا ہے۔ ہائے اسے نہ مارو۔ یہ بڑا بے زبان ہے۔ یہ تمہیں کبھی نہ کہے گا کہ اسے اس مار ، تکلیف ہو رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ چھوڑ دو ۔ ۔ ۔ مجھے چھوڑ دو ۔ ۔ ۔ مجھے جانے دو ۔ ۔ ۔ ماں! بابا! نیلا!

میں راستہ بھول گئی ہوں

اب میں گھر کیسے پہنچوں؟

گھر کیسے پہنچوں؟

پہلے ریل میں بیٹھ کر چک جمبر پہنچنا ریشی! پھر وہاں سے لاری میں سوار ہو کر قاضی پور اور میں خچر لے کر تمہیں لینے قاضی پور آؤں گی بیٹا ۔ ۔ ۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ میں تم سے ہو کر کیسے رہ سکتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔

اور سنو بیٹا! قاضی پور سے چمبہ گلی جاتے ہوئے مجھے ضرور ملتی جانا۔ میں اپنے مکان کے ر درختوں کے نیچے الاؤ جلائے تمہارا انتظار کروں گا اور جب تم آؤ گی تو تمہیں بہت سے گرم گرم

مجھے کھلاؤں گا۔ اور بیٹیا اب تو عبد اللہ کی ماں بھی آگئی ہے۔ وہ تمہیں بڑا مزیدار سالن کھلا
گی اور میں وہی گیت سناؤں گا۔ کھیڈن دے دن چار۔۔۔۔ اسنوگی؟

میری مالکن! جب تو قاضی پور پہنچے تو وہاں سے ایک سڑک۔۔۔۔ چھوٹی سی سڑک قبر
کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ تم اس سڑک آجانا۔ پھر ایک ٹیلے کے عقب میں ایک جگہ ٹبے
توڑے جا رہے ہوں گے۔ میں تمہیں یہیں پتھر توڑتا ملوں گا۔ اچھی گوالن! تو مجھے ندی پر ا
کیوں چھوڑ گئی تھی۔ پھر میں راستہ بھول گیا اور اب صبح سے شام تک پتھر ڈھوتا ہوں اور ما
کھاتا ہوں۔ مالکن! جب آئے گی تو میں یہاں سے بھاگ چلوں گا اور تجھے اپنی پیٹھ پر بٹھ
چمبہ گلی لے جاؤں گا۔

میں نیلی ہوں پیاری گوالن! پیاری سہیلی! میں تجھے روز یاد کرتی ہوں۔ تو ہم سے ر
کر کیوں آگئی ہے؟ ہم لوگ تجھے بہت یاد کرتے ہیں، مگر ہم غریب دیہاتی ہیں اور تو
بڑے شہر میں ہے۔ پتا نہیں ہم بھی تجھے یاد آتے ہیں۔ یا نہیں۔۔۔ تو کب آئے گی؟

اور پھر چمبہ کلی کی پتی کی آواز ڈوب گئی۔ پھر سب آوازیں ڈوب گئیں اور ایک لمبی
بلند چیخ بلند ہوئی۔ پہاڑ کی چوٹی سے دہکتے لاوے کے سمندر میں گرتے ہوئے انسان کی آ
چیخ۔ مسلسل اور بھیانک! جس میں روح کا سارا کرب۔ جسم کی مکمل اذیت اور کائنات
سارا زہر چھپا ہوا تھا اور یہ چیخ دھوئیں بھرے آنگن سے نکل کر اندھیری گلیوں، گندگی کے
اور بوسیدہ مکانوں کی ویران منڈیروں پر سے ہوتی ہوئی شہر کے پُرشور مٹیالے گرد آلود آ
میں کہیں گم ہو گئی۔ پھر صبح ہو گئی، شہر کا زرد، اداس اور بیزار سورج طلوع ہوا۔ دور کا
کی لمبی لمبی بدشکل چمنیوں کی اوٹ میں گرد و غبار کی چادر میں سے اس نے اپنا بجھا بجھا
نکالا، جیسے وہ کوئی مل مزدور ہو اور وقت سے پہلے اٹھنے پر بڑی بے دلی سے کار
کے گیٹ میں داخل ہو رہا ہو۔ سارے شہر پہ ایک بے رنگ اور افسردہ سی پھیکی پھیک
پھیل گئی۔ بچے اسکولوں کی جانب، کلرک دفتروں اور دکاندار اپنی دکانوں کی طرف چل د
سٹیشن کے سامنے والے باغ میں سوئے ہوئے بھکاری مالش کرنے والے اور ہوٹلوں
بیڑیاں سلگائے پھٹے ہوئے غلیظ کمبل سنبھالتے اٹھے اور چوک میں کھڑے ہو کر لمبی لمبی

ینے لگے۔ کارخانوں کے بھونپو چیخنا شروع ہو گئے اور بھاری بھرکم ٹرک گرد کے بادل اڑاتے
ڑکوں پر سے گزرنے لگے۔

سٹیشن کے سامنے تنگ و پچکے ہوئے ڈھلوانی بازاروں میں اندر کی جانب دہلی گیٹ تک
پھیلے ہوئے بوسیدہ مکانوں کی ننگی ٹیڑھی اندھیری گلیوں میں بھی صبح ہو گئی۔ بڑے گندے بدرو
ں سورج کا عکس پڑتے ہی اس کی سطح پر تیرتے ہوئے بلبلے پھٹنے لگے اور اونچی لمبی دیوار کے
ونے پر سے پھسل کر ایک ننھی سی کرن عقبی گلی کا مرطوب غار عبور کر کے ایک کوٹھڑی تک
ئی اور بند کھڑکی کی درز میں سے اندر جھانکنے لگی۔

اندر ایک بہت بڑی توند کے پاس ایک ننھی سی چمبہ کلی سو رہی تھی۔ اس کا منہ بچوں
ی طرح کھلا تھا اور آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے تھے۔ جاگو! اب جاگو سوئے ہوئے
نسوؤ! بدرو کے پل پر تمہاری نئی زندگی کا بے رنگ سورج طلوع ہو چکا ہے۔

دن کافی چڑھ آیا تھا۔ لیکن کوٹھڑی میں ابھی تک اندھیرا تھا۔

چھوٹی سی تنگ گلی والی کھڑکی بند تھی اور اس کے درزوں میں سے بیمار بیمار سی مرطوب روشنی اندر آرہی تھی۔ اسی گلی کی جانب سے دور کسی اصطبل میں گھوڑے کی کمزور آواز کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی۔ رشیم چارپائی پر چپ چاپ لیٹی جاگ رہی تھی۔ پتلا سا کمبل اس کی گردن تک پھیلا ہوا تھا اور وہ ٹکٹکی باندھے نیم روشن چھت کو تک رہی تھی۔ رات کے تمام واقعات اسے خواب معلوم ہو رہے تھے۔ وہ بار بار اپنے ذہن میں ایک ناٹک دہراتی۔ وہ سٹیشن کی چھت تلے بنچ پر اکیلی بیٹھی ہے۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت اس کے پاس آکر بیٹھ گئی ہے۔ اس کا چہرہ بھاری ہے اور ماتھے پر زخم کا نشان ہے۔ وہ اسے رات اپنے گھر گزارنے کے لیے کہتی ہے اور رشیم اس کے ساتھ نیچی نیچی دکانوں والے بازاروں اور اندھیری گلیوں میں سے گزر رہی ہے۔ پھر وہ ایک مکان کا بوریا ہٹا کر آنگن میں آجاتے ہیں۔ آنگن میں اپلوں کا کڑوا دھواں پھیلا ہے۔ ایک بکری چارپائی کے ساتھ بندھی ہے۔ ایک دبلا پتلا آدمی چولھے میں آگ جلا رہا ہے اور بار بار آنکھیں مل رہا ہے۔ وہ دالان والی چارپائی پر سونا چاہتی ہے، مگر اس کی میزبان عورت اسے کہتی ہے۔ باہر رات کو ٹھنڈ ہو گی اور وہ کوٹھڑی میں سو گئی ہے۔ وہ عورت اس کے لاکھ انکار پر اس کے بدن کی مالش کرتی ہے اور محلے کی عورتوں کے فحش قصّے سناتی ہے۔ پھر وہ دروازہ بند کر کے چلی جاتی ہے اور رشیم کو نیند نہیں آتی۔ وہ کتنی ہی دیر ڈرے ہوئے دل کے ساتھ ہر آہٹ پر چونکتی

دائیں بائیں دیکھنے لگتی ہے اور جب اسے نیند آرہی ہوتی ہے تو باہر آنگن میں کھسر پھسر
ں سنائی دیتی ہیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اسے پسینہ آجاتا ہے۔
دروازہ ایک دم کھلتا ہے اور خوفناک مونچھوں والا آدمی اس کی جانب بڑھتا ہے اور وہ
ں ہو جاتی ہے۔ دروازہ ایک بار پھر کھلتا ہے اور دوسرا آدمی اندر داخل ہوتا ہے اور
ے کپکپاتے ہونٹوں سے ایک فلک شگاف چیخ نکل جاتی ہے اور وہ خدا کے دربار میں
ے فریاد کرتی ہے اور خدا کا دربار دوسرے دن کے لیے برخاست ہوتا ہے اور وہ
تھروں پر بے ہوش ہو کر گر پڑتی ہے۔ جب اسے ہوش آتا ہے تو وہ بستر پر اکیلی ہوتی
رات کے ہولناک واقعات پر غور کرتی ہے اور اسے یقین نہیں آتا کہ وہ سب
اہو۔

رشیم کا سارا بدن ادھ پکے زخم کی مانند دکھ رہا تھا۔ سر بوجھل تھا اور درد کر رہا تھا۔ کوٹھڑی
کا ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ کونے میں الگنی پر پرانا لحاف لٹکا ہوا تھا ایک جھینگر بڑی دیر سے
تھا۔ دروازہ بند تھا اور آنگن میں ایک مرد اور دو عورتوں کے کبھی کبھی باتیں کرنے، پمپ
ں چلانے اور کبھی کیتلی میں چمچ ہلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے رشیم کو یوں
جیسے وہ اپنے چمبہ گلی والے گھر کی کوٹھڑی میں لیٹی ہے اور باہر اس کی ماں کیتلی میں دودھ
رہی ہے۔ سارو اس کے پاس بیٹھی بھٹے صاف کر رہی ہے اور اس کے باپو سے باتیں کر
ہے، جو بان کی رسیاں بانٹ رہا ہے۔ وہ ابھی اٹھ کر آنکھیں ملتی باہر نکلے گی اور سارو اس
رف دیکھ کر مسکرائے گی۔

"اری اتنی دیر تک سوتی ہے، دیکھ تو کتنا دن چڑھ آیا ہے۔ آج دودھ لے کر
نہیں گئی۔ . . . "

اور منہ پر انگلی رکھ کر سارو کو منع کرے گی کہ وہ ایسی باتیں نہ کرے۔ اس کا باپو غصّے میں
ائے گا۔ پھر وہ ڈھور ڈنگر کو چارہ ڈالے گی۔ نیلی کے آگے ہرے ہرے پٹھے رکھ کر سارو کے
میں ہاتھ ڈال کر ڈھلان پر اگے ہوئے مکّی کے کھیتوں میں نکل جائے گی اور جہاں جہاں سے
رے گی، شبنمی گھاس پر ایک لکیر سی بنتی جائے گی اور اوس کے موتی ٹوٹ ٹوٹ جائیں گے

اور شہتوت اور بکائن کے درختوں پر دھوپ میں چہچہانے والے پرندے چیخ چیخ کر شور مچانے لگے۔ ریشی آگئی۔ ریشی آگئی۔ ریشی آج دیر سے اٹھی ہے۔ ریشی بڑی کاہل ہوگئی ہے . . . . .

ریشم کے ہونٹ کسی انجانی مسرت کے احساس سے کانپنے لگے۔ اس نے اٹھنے کے لیے پہلو بدلا، تو اسے اپنی شلوار زمین پر پڑی ہوئی دکھائی دی۔ وہ شرم سے اکٹھی سی ہوگئی۔ اس نے آہستہ آہستہ، لیٹے لیٹے شلوار اٹھائی اور کمبل کے اندر ہی جلدی جلدی پہن لی۔ اب لمحہ بھر پہلے کی تمام رنگین تصویریں دھندلا گئیں اور ان کی جگہ تاریک دلدلوں کے لمبے لمبے میدان پھیل گئے۔ جن کے اوپر دن کا سورج غروب ہو چکا تھا اور رات کے بھیانک سائے منڈلانے لگے تھے۔ ریشم نے خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور چہرہ کمبل میں چھپا لیا۔

دروازہ کھلا اور ساتھ ہی دو لڑکیاں ہنستی ہنستی اندر داخل ہوئیں۔ ایک کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا اور دوسری بار بار کندھے پر سے پھسلتا ہوا فیروزی دوپٹہ ٹھیک کر رہی تھی۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی اندھیری گلی والی کھڑکی کھول دی۔

"ہائیں مر گئی، اندر کتنا اندھیرا ہے۔"

ریشم نے کمبل ہٹا کر ان دونوں لڑکیوں کو نفرت اور غصے میں سمٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ دودھ کا گلاس صندوق پر رکھ کر کالے دوپٹے والی سانولی سی لڑکی ریشم کے پاس بیٹھ کر اس پر جھک گئی اور دونوں ہاتھوں سے اس کے بال سہلانے لگی۔

"اب اٹھ بیٹھو میری جان . . . . . دودھ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

ریشم نے اس کے منہ پر زور سے تھوک دینے کی خواہش کو دباتے ہوئے اپنا چہرہ پھر کمبل میں ڈھانپنے کی کوشش کی۔

"لو بھئی! یہ تو ہم سے بھی شرماتی ہے۔"

دوسری لڑکی دوپٹہ سنبھالتی قریب آگئی۔

"اری پہلا پہلا دن جو ہے۔"

اس پر وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور ریشم سارا غصہ پی گئی۔ اگر وہ اپنے گھر میں ہوتی تو ان دونوں کا منہ نوچ لیتی لیکن وہ اپنے گھر سے اپنے گاؤں سے ہزاروں، لاکھوں کروڑوں

دور تھی۔ دونوں لڑکیاں ہم عمر تھیں اور نوجوان تھیں۔ ان کے رنگ گندمی اور جسم بوجھل سے
کھڑکی میں سے جو ہلکی ہلکی ٹھنڈی روشنی آرہی تھی اس میں ان کی سرمہ لگی آنکھوں کے گرد
ے دھیمے سیاہ حلقے اجاگر ہو رہے تھے۔ سیاہ دوپٹے والی لڑکی کی ناک میں چھوٹا سا سبز نگ
رہا تھا اور بائیں گال پہ خال کا نیلا نقطہ تھا۔ وہ ریشم کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس
ھک کر ریشم کی آنکھیں چوم لیں۔

"تم کتنی خوبصورت ہو۔ کبھی میری آنکھیں بھی خوبصورت تھیں۔"

اس کا سوجا سوجا سا بوجھل چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور فیروزی دوپٹے والی ٹھٹک کر کھلکھلا
ن پڑی اور ریشم کے گدگدی کرنے لگی۔ ریشم تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔

"مجھے تنگ نہ کرو۔"

کالے دوپٹے والی نے بڑی محبت سے ریشم کا نرم ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

"تنگ کرنے والے لوگ چلے گئے ہیں۔ ہم تو تجھ سے محبت کرنے آئے ہیں، صرف محبت
نے، لو اب دودھ پی لو ریشم بہن۔"

ریشم نے ہاتھ پیچھے کھینچتے ہوئے کہا "مجھے دودھ نہیں چاہیے۔"

"اور کیا چاہیے!"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

فیروزی دوپٹے والی چہرے پر بے وقوفانہ سی مسکراہٹ پھیلائے آنچل ٹھیک
نے لگی۔

"اری اسے تو حلوہ پوڑی چاہیے داراں!"

اور پھر خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

داراں جس کا دوپٹہ سیاہ تھا اور جس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے، ریشم کے اور
ب ہو بیٹھی اور اس کی دلجوئی کرنے لگی۔

"ریشم بہن! میں بھی عورت ہوں اور عورت کے دکھ درد کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں
رے پاس تمہاری ہمدرد بن کر آئی ہوں۔ تم میری باتوں پر اعتبار کرنا۔ تم اگر دودھ نہیں پیو

گی تو یہاں تمھیں کوئی نہ پوچھے گا۔ تم یہاں اپنا مان کیسے دکھاؤ گی؟ اور پھر ہمارے سا… کبھی اداس نہ ہوگی۔ میں آج سے تمھاری پکی سہیلی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ تمھارا بڑا… گی۔ اور سنو۔ تمھیں ایک راز کی بات بتاتی ہوں۔ اگر تم نے ان لوگوں کا کہا مانا تو عیش کر… اگر انکار کیا تو تمھارا گلا دبا کر تمھاری لاش تیزاب میں ڈال دی جائے گی اور کسی کو اس… تک نہ مل سکے گا۔

ریشم خوف سے سہم گئی اور داراں اس کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگی۔ دو… دودھ کا گلاس لیے دوپٹہ سنبھالتی ریشم کی طرف بڑھی۔

"لو میری نواب اسے پی جاؤ اور عیش کرو۔"

ریشم نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس تھاما اور بڑی مشکل سے چند ایک گھونٹ…

"یہ بھی پی لو میری اچھی بہن۔"

"اب نہیں پیا جاتا۔"

داراں نے ریشم کے گال چوم لیے۔

"پی لو نا... تھوڑا سا تو ہے۔"

ریشم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ آنکھیں بند کر کے باقی دودھ بھی پی گئی…

"شاباش۔" داراں نے اپنے دوپٹے کے پلّو سے ریشم کا منہ صاف کرتے ہوئے…

"اب ہم جاتی ہیں اور تھوڑی دیر بعد پھر آئیں گی۔ اتنی دیر تک تم ان تصو… جی بہلاؤ۔"

داراں نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر کچھ تصویریں نکال کر ریشم کو پکڑائیں… سے اس کا منہ چوم کر اپنی بار بار دوپٹہ سنبھالنے والی بیوقوف چہرے والی سہیلی… باہر نکل گئی۔

ریشم نے اطمینان کا سانس لیا اور تصویروں پر نگاہ ڈالی۔ شرم سے اس کا چہرہ… اس نے جلدی سے تصویروں کو اکٹھا کر کے سرہانے کے نیچے رکھ دیا۔ تمام تصویریں… کے عریاں اور انتہائی بے حیا مناظر کی عکس تھیں۔ ریشم کو داراں کی اس حرکت پر بے…

اس کا جی چاہا کہ وہ اس کی آنکھیں پھوڑ ڈالے اور ہمیشہ کے لیے اندھی بنا دے۔

دروازہ ایک دفعہ پھر کھلا اور اب کے وہی سٹیشن والی بھدی اور موٹی میزبان عورت اندر داخل ہوئی اور آتے ہی ریشم سے لپٹ گئی۔

"ہائے میں صدقے، میں واری، میری بیٹی کا کیا حال کر دیا ہے ان ظالموں نے۔"

ریشم کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے بدن سے کوئی بہت بڑی چھپکلی چمٹ گئی ہو اور وہ اسے زور لگا کر الگ کرنے لگی۔

"چھوڑ دو مجھے۔ اب تیرا مکر یہاں نہ چلے گا۔ میں نے ایک بار دھوکا کھا لیا ہے۔ اب کبھی نہیں کھا سکتی۔ مکار بڑھیا..."

وہ عورت آنکھوں پر پلّو ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ہائے میرے بھاگ! میں تو نہ دین کی رہی نہ دنیا کی۔ جدھر جاتی ہوں۔ یہی طعنے ملتے ہیں۔ مجھ بدقسمت کو کیا خبر تھی کہ میں جس کا بھلا چاہوں گی، وہی مجھے گالیاں دے گا۔ میں نے تو تیری بھلائی سوچی تھی میری بیٹی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ جنگلی درندے یہیں کہیں چھپے بیٹھے ہیں اور تجھے مجھ سے چھین کر کھا جائیں گے۔"

ریشم نے غضب ناک ہو کر پوچھا:

"کیا یہی تمھارا گھر ہے؟ یہی وہ جگہ ہے جہاں تم غریب لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر لاتی ہو اور پھر جہنم کی آگ میں دھکیل دیتی ہو؟"

وہ عورت اور زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر اچانک چپ ہو گئی۔ پلّو سے آنکھیں پونچھیں۔ اٹھ کر دروازہ اچھی طرح بند کیا اور ریشم کے پاس آ کر سرگوشی میں بولی۔

"میرا اعتبار کر نا میری بچی! میں تمھیں سچی سچی باتیں کہنے لگی ہوں۔ میں تمھیں کسی بری نیت سے گھر نہیں لائی تھی۔ اگرچہ میرے گھر کے حالات خراب ہیں، مگر میرا خیال تھا کہ تمھیں یہاں آرام ملے گا اور صبح تڑکے ہی اٹھا کر رخصت کر دوں گی۔ لیکن میرے بھاگ کہ وہ لوگ رات کو ہی آ گئے اور پھر میری ایک نہ چل سکی..."

ریشم دروازے کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولی: "یہ لوگ کون ہیں؟"

"بہت بڑے بدمعاش ہیں۔ سارا شہر ان سے ڈرتا ہے۔ چاقو چھری مار دینا ان کے نزدیک بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ شہر بھر میں ان کے خفیہ اڈے ہیں۔ ان کے پاس ہر قسم کے ہتھیار موجود رہتے ہیں۔ ان سے دشمنی مول لینا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہے۔ میری کیا مجال . . . بڑے سے بڑا بھی دُلا سیٹھ سے ٹکر نہیں لے سکتا۔ اس کا سکّہ شہر بھر کے بدمعاشوں میں چلتا ہے۔ سب اس کی مانتے ہیں۔ پھر بھلا میں بیچاری کیا کر سکتی۔ مجھ سے تو صرف یہ گناہ ہوا کہ تمھیں رات سلانے کے لیے یہاں لے آئی۔"

وہ عورت چپ ہو گئی اور آنکھیں پونچھنے لگی۔ ریشم کو اس کی باتوں پر کچھ کچھ اعتبار آچلا تھا اور وہ اپنے آپ کو خونخوار درندوں میں گھری ہوئی محسوس کرنے لگی تھی۔ یہ کوٹھڑی اور اس کا تنگ دالان گنام پہاڑوں کا وہ غار تھا۔ جہاں بات بات پر غرّانے والے اور زرد نوکیلے دانت نکالے سیاہ فام بھوکے چیتے رہتے تھے۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اس گھر میں کسی نہ کسی کو اپنا رازدار بنا لے گی اور پھر کسی روز چپکے سے کھسک جائے گی اور کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ لیکن اس عورت کی باتیں سننے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ وہ پتھر کی دیوار میں گردن تک چُن دی گئی ہے اور ایک جلّاد کلہاڑا لیے ہر وقت اس کے سر پر کھڑا رہتا ہے اور وہ کبھی اس کوٹھڑی سے باہر نہ جا سکے گی۔ کبھی اپنے گاؤں کے چشمے پر جا کر بوڑھے بابا کے میلے کپڑے نہ دھو سکے گی اور کبھی وہ برف نہ دیکھ سکے گی۔ جو سردیوں میں کسی دن اچانک گرنا شروع ہو جاتی ہے اور کتنی کتنی دیر خاموشی سے گرتی رہتی ہے۔
اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور اپنے پاس بیٹھی ہوئی مسکین صورت عورت کو دیکھا۔

"کیا میں یہاں سے کبھی نہ بھاگ سکوں گی؟"

اس عورت نے بھی ٹھنڈا سانس بھرا۔

"کبھی نہیں میری بچی . . . کبھی نہیں۔ یہ وہ گہرا کھڈ ہے جس میں گرنے کے بعد آدمی لاکھ کوشش کے باوجود باہر نہیں نکل پاتا۔ پہلے میں اس گری تھی اور میرے بعد میری دونوں بیٹیاں . . ."

"تو کیا وہ . . . وہ دونوں جو ابھی آئی تھیں . . . ؟"

"ہاں . . . وہ میری بچیاں ہیں۔"

ریشم نے اپنے بال ٹھیک کرنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھایا تو اسے زنجیروں کی کھنکھناہٹ سنائی دی۔ اس نے بڑی بے بسی سے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

"کاش! . . . ایک بار . . . صرف ایک بار میں اپنے گھر جا کر اپنی ماں اور بابا کو اتنا کہہ آتی کہ میں اب کبھی ان کے پاس نہ آؤں گی۔"

اس عورت کو جیسے اچانک کوئی خیال سوجھا۔ وہ چہرے پر بڑا تجسّس پیدا کرتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

"یہاں سے بچ نکلنے کی صرف ایک صورت ہے۔"

"وہ کیا؟" ریشم کو غار کے اندھیرے میں روشنی کا ایک جگمگاتا نقطہ دکھائی دیا۔

"وہ یہ کہ تم ان لوگوں کا کہا مانتی رہو۔ جو یہ کہتے ہیں، وہی کرو اور باقی سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اگر خدا نے چاہا تو کوئی نہ کوئی سبیل پیدا ہو جائے گی۔"

ریشم نے گردن جھکا لی۔ وہ روشنی کا نقطہ ایک ہی دفعہ بھڑک کر بجھ گیا۔

"مگر وہ جو کہتے ہیں، وہ مجھ سے نہ ہوگا۔ میں چھت سے لٹک کر مر جاؤں گی لیکن ایسا بے حیائی کا کام نہ کروں گی۔ اگر میرے ماں باپ کو یا میری سہیلیوں کو پتا لگا تو وہ کیا کہیں گی۔"

"ان کو عمر بھر پتا نہ چلے گا میری بچی۔"

"نہ بھی چلے۔ پھر بھی میں اپنے آپ کو منہ نہ دکھا سکوں گی۔ میں اتنی بے شرم تو نہیں ہوں۔ میرے ماں باپ غریب سہی، لیکن سارا گاؤں ان کی عزت کرتا ہے۔ میں ان کی عزت کی حفاظت کروں گی۔"

"اگر ان کی عزت کا اتنا خیال تھا تو گھر سے قدم نہیں اٹھانا تھا بیٹا۔"

ریشم کو جیسے دھکا سا لگا۔ اس کا چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔

"ہاں . . . ٹھیک ہے۔ مجھے گھر سے باہر قدم نہیں رکھنا چاہیے تھا مگر اب جب کہ میں گھر سے نکل آئی ہوں، اپنے آپ کو اور برباد نہ ہونے دوں گی۔"

وہ عورت اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خدا تمھیں بربادی سے بچائے میری بیٹی . . . لیکن ان درندوں کے جنگل میں بچ کر نکل جانا محال ہے۔ بہر حال میں اور میری بچیاں تمھارے ہر آرام کا خیال رکھیں گی۔ اب میں جاتی ہوں۔ دُلّا سیٹھ بازار سے آنے ہی والا ہے۔ تم اتنی دیر میں نہا دھو لو۔

جب وہ عورت چلی گئی تو ریشم تکیئے میں سر دے کر اس قدر زور زور سے روئی کہ اس کی ہچکی بندھ گئی اور تکیئے کا آدھا غلاف بھیگ گیا۔ باہر سے داراں اور دوسری لڑکی بھاگ کر اندر آئیں اور ریشم کی چُوما چاٹی کرتے ہوئے اسے بار بار دلاسہ دینے لگیں۔ پھر وہ اسے زبردستی اٹھا کر نہلانے لے گئیں۔ نہلانے کے بعد انھوں نے اس کے کچھ بھورے، کچھ بالوں میں چنبیلی کا خوشبودار تیل لگایا۔ گالوں پر نقلی ہیئر لین سنو ملی۔ ہونٹوں پر ریشم کے انکار کے باوجود سرخی کی بھدّی سی تہہ جما دی۔ دیہاتی لباس کی جگہ ساٹن کی شلوار، ہلکی نیلی پھولدار کی قمیص اور انگوری رنگ کا ریشمی دوپٹہ اوڑھایا اور اسے آن کی آن میں دلہن بنا کر بٹھلا دیا۔ نہانے، کپڑے بدلنے اور میک اپ کرنے کے بعد ریشم کا پہاڑی حسن نکھر کر اپنے شباب پر آ گیا۔ اس کا رنگ کندن کی طرح دمکنے لگا۔ کالی کالی آنکھوں میں دھوپ سی چمکنے لگی۔ اس کے چہرے پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ داراں اسے دیکھ کر مسحور سی ہو کر رہ گئی۔ فیروزی دوپٹے والی کا اندر پر اپنا دوپٹہ درست کرنا بھول گئی۔ ان کی ماں جلدی سے اٹھی اور چولہے کی سیاہی لے کر ریشم کے ماتھے پر ہلکا سا نشان لگا دیا۔

"نظر نہ لگ جائے میری دُلہن کو۔"

دروازے پر گرا ہوا بوریہ ایک طرف ہٹا اور دُلّا سیٹھ اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں تھیلا تھا جس کے دو سرخ انار تھے اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں۔ اس کے گول گول جسم پر والا سرخ کرتہ ریشمی تھا اور سپید دھوتی بھی سلکی تھی۔ پاؤں میں کالا پمپ شو تھا اور کندھے پر سرخ ریشمی رومال پڑا تھا۔ ریشم اسے دیکھ کر بے زبان کبوتری کی طرح سہم کر سمٹ گئی۔ دُلّا سیٹھ پہلے تو اسے بالکل نہ پہچان سکا۔ وہ دروازے میں کھڑا گردن جھکائے اسے حیرت اور تعجب سے گھورتا رہا اور جب اسے پتا چلا کہ وہ ریشم ہے تو اس کی کانی آنکھ بتاشے

پھڑکنے لگی اور وہ انار داراں کی جھولی میں ڈال کر ضرورت سے زیادہ سیر ہو چکے سانڈ کی طرح اپنی توند پر ہاتھ پھیرتا، جھولتا جھالتا ریشم کے پاس آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"قدرت مولا کی . . . کیا مشوق نکل آیا ہے چاچی سیداں!"

داراں اور فیروزی دوپٹے والی پھرکیوں کی طرح دُلّے سیٹھ کے آگے پیچھے گھومنے لگیں۔ دُلّا سیٹھ ابھی تک ریشم کو دیکھ رہا تھا اور دیکھ دیکھ کر عش عش کر رہا تھا۔

"توبہ ہے بھئی دُنیا توبہ ہے . . . مائیں کیا اندر سبھا کا دربار لگا ہے۔"

پھر چاچی سیداں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"چاچی سیداں! اب ہمیں بھی ایک ڈرامہ تیار کرنا پڑے گا۔ بس گیتا بالو تو ہمیں گھر بیٹھے بٹھائے ہی مل گئی ہے۔ ماں تم بن جانا اور ہیرو گامی کنجر کو بنالیں گے۔"

بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ گامی بھی مونچھوں کے سرے بٹتا اندر داخل ہوا اور خوش ہو کر بولا۔

"میری بات ہو رہی ہے کیا؟"

دُلّا سیٹھ نے چاچی سیداں کو آنکھ ماری۔

"ہاں بھئی . . . میں کہہ رہا تھا کہ گامی کنجر بڑا اچھا پھرتا ہے۔ اس دفعہ دنگل میں حسّو ٹونڈی سے ایک جوڑ کرا دیں اس بہن کے . . . ."

دُلّے سیٹھ کی موٹی گالی پر گامی بٹیا لے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ اچانک اس کی نظر ریشم پر پڑی اور وہ اس خچر کی مانند ٹھٹھک سا گیا جو مہینوں بھوسہ کھانے کے بعد پہلی بار اپنے سامنے دھان کی ہری بھری بالیوں کا ڈھیر دیکھ رہا ہو۔

"بلّے بلّے کیا پوپٹ مارا ہے۔ اس نے تو کامنی کوشل کو مات کر دیا ہے۔"

دُلّے سیٹھ کا چہرہ فتح مندی کے غرور میں چمکنے لگا اور اس نے اپنا بایاں ہاتھ ریشم کی پشت پر رکھ دیا۔ ریشم پہلے ہی شرم سے دہری ہوئی جا رہی تھی۔ اب جو دُلّے سیٹھ کا بھدّا ہاتھ جسم سے لگا تو وہ اور اکٹھی ہو گئی۔

"دُلّا جی! میرا اس سے بیاہ کر دیں۔"

دُلّا بڑا بے ہنگم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور اس کے پیٹ کے دھچکوں سے ساری چارپائی

ہلنے لگی۔ وہ اتنا ہنسا، اتنا ہنسا کہ اس کی کانی آنکھ سے پانی بہہ نکلا۔

"ارے دمڑی کا کوچوان، راجہ اندر کی پری سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

وہ پھر بے اختیار ہوکر ہنسنے اور چارپائی کو جھٹکے دینے لگا۔ گامی بڑی للچائی ہوئی نظروں سے ریشم کو دیکھ رہا تھا اور ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا۔ چاچی سیداں کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے حقے کا منہ اپنی طرف پھیرتے ہوئے آخری آہ بھری۔

"میرے مولا نے چاہا تو راجہ اندر کی پری سے ہی بیاہ کریں گے۔"

کھانے کے بعد ریشم اور داراں کوٹھڑی میں جاکر ایک ہی چارپائی پر سوگئیں۔ ریشم الگ سونا چاہتی تھی لیکن داراں مُصر تھی کہ وہ دونوں بہنیں مل کر ہی سوئیں گی۔ بستر پر لیٹے لیٹے داراں نے ریشم کو اپنے سارے جنسی تجربوں کا حال بڑی فحش زبان میں من وعن سنا دیا۔ پھر سرہانے کے نیچے سے عریاں تصویریں نکال کر ریشم کو دکھانے لگی۔ ریشم نے نفرت سے پہلو بدل لیا اور داراں ہنسنے لگی۔

"کتنے دن اور پہلو بدلے گی میری بنّو۔"

اور ریشم سے دیوانوں کی طرح لپٹ کر ایسی حرکتیں کرنے لگی۔ جن سے ریشم کا جی گھبرا اور اس کی نیند حرام ہوگئی۔ مگر وہ بے بس تھی۔ کبھی دُتے سیٹھ کے بازوؤں میں اور کبھی دا کے بازوؤں میں!

دُلّا سیٹھ اور گامی باہر چولہے کے پاس چاچی سیداں سے کتنی ہی دیر ریشم کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ چاچی سیداں نے ان دونوں کو ریشم کی طبیعت کا سارا حال کہہ سنا

"لڑکی کسی بڑے عزت والے گھر کی ہے۔ اس کی شرم تو کسی بات سے جاکر اتر

دُلّا سیٹھ سرخ رومال سے کانی آنکھ پونچھتے ہوئے غرّایا۔

"میں اتاروں گا اس کی شرم ۔ ۔ ۔ تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟"

چاچی سیداں نے بڑی مطمئن نگاہوں سے دُلّا سیٹھ کو دیکھا۔

"میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ تم دونوں جانور ہو اور تحمّل سے کام نہ لوگے اور بنا بنا کھیل بگاڑ دوگے۔"

دُتے کو ایک دَم جوش آگیا۔

"کس مائی کے لال میں جرأت ہے کہ ہمارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دے۔ میں انتڑیاں ڈھیر دوں، تو دُلّا سیٹھ نہیں دُلّا چمار کہہ دینا۔ کیوں او ئے گامیا؟"

گامی نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔

"بالکل جی ۔ ۔ ۔ بالکل۔"

"تم ایک گھنٹے بعد ہی تماشا دیکھ لینا چاچی سیداں۔ دُلّا سیٹھ سب گُر جانتا ہے۔ یہ یہاتی عورت ہے۔ تم قسطنطنیہ سے کوئی پکڑ کر لے آؤ۔ اگر تیسرے روز تمہارے سامنے ہوکر مجرا نہ کرے، تو بیشک دُتے سیٹھ کی دوسری آنکھ بھی کانی کر دو۔"

اس گفتگو کے ٹھیک اڑھائی گھنٹے بعد دُلّا سیٹھ، گامی اور اپنے ادھیڑ عمر کے مریل سے م، چاچی سیداں اور فیروزی دوپٹے والی لڑکی کے ساتھ ریشم کی کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ ریشم ں کی آغوش میں سو رہی تھی۔ دُلّا سیٹھ نے ایک زوردار گرج سے ان دونوں کو ہڑبڑا کر یا دیا۔ داراں نے دُتے کی شکل دیکھی تو اچک کر بستر سے کودی اور چاچی سیداں کے پاس آکر ہم ڑی ہوگئی۔ ریشم کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔ وہ بستر پر ایک جانب سمٹ کر بیٹھ گئی تھی اور یں جھکائے کچھ سوچ رہی تھی ۔ ۔ ۔ بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ ایک ہی دن میں ان ایکا ایکی ب ناک ہو جانے والے چہروں کے درمیان پاگل سی ہوگئی تھی۔ وہ ان لوگوں سے پیار بھی ں کرسکتی تھی اور نفرت بھی نہیں۔ وہ ایک عجیب وغریب درمیانی کیفیت میں تھی۔ وہ یمپوں کے درمیان میں سے ہوکر اس راستے پر چل رہی تھی جہاں تنی ہوئی رسیاں اور ی ہوئی میخیں تھیں اور وہ ہر دوسرے قدم پر الجھ رہی تھی، گر رہی تھی اور اس کے پاؤں خون بہنے لگا تھا، اور لباس جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا۔ پھر بھی وہ آگے بڑھتی جارہی ا۔ اس نے اپنے آپ کو حالات کے بہتے دھارے کے سپرد نہ کیا تھا۔ اس کا کمزور جہاز ناک طوفان کی زد میں تھا اور شوریدہ سر، جھاگ اڑاتی موجیں اسے کھلونے کی طرح اِدھر اُدھر اچھال رہی تھیں مگر وہ آہنی چرخ سنبھالے بڑی تندہی سے جہاز کی حفاظت میں زور کوششیں کر رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ بہت جلد وہ جہاز کو صحیح وسالم خاموش اور

پُرسکون سمندروں میں لے آئے گی، جہاں سفید پروں والے سمندری پرندے اس کے اوپر خوشی سے منڈلاتے ہوئے چیخ چیخ کر اس کا خیر مقدم کریں گے۔ چنانچہ وہ خاموش تھی اور بڑے حوصلے سے ہر آفت اور ہر چوٹ سہہ رہی تھی۔

سب لوگ کھڑکی سے آنے والی روشنی میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے تھے۔

دُلا سیٹھ آگے بڑھا اور ریشم کی چھاتیوں پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ ریشم تڑپ کر پرے ہٹ گئی۔ دُتے سیٹھ کے غصّے کو بھڑکانے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس نے گامی کو اشارہ کیا۔ گامی آگے آیا اور پھر ان دونوں نے مل کر ریشم کے بدن پر سے اس کے سارے کپڑے اتار دیے۔ ریشم نے بڑی مزاحمت کی اور زور زور سے چیخی چلائی۔ لیکن دُتے سیٹھ کے ایک زناٹے دار تھپڑ نے اس پر نیم غشی کی سی حالت طاری کر دی اور اس کا اوپر کا ہونٹ زخمی ہو گیا اور ہونٹوں میں سے خون کی پتلی لکیر بہہ نکلی۔ انھوں نے ریشم کو بالکل ننگا کر کے اسے چارپائی کے ساتھ کس کر باندھ دیا اور چارپائی دیوار کے ساتھ ترچھی کر کے کھڑی کر دی۔ نیم بیہوش، عریاں ریشم اب چارپائی پر یوں پڑی تھی جیسے لوچڑخانے کے باہر کسی بھینس کی کھال سکھانے کے لیے پھیلا رکھی ہو۔ دُتے سیٹھ نے پانی کا گلاس منگوا کر ریشم کے منہ پر چھینٹے دیے۔ جب اُس نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں تو وہ اسے انتہائی فحش اور مکروہ قسم کی گالیاں دینے لگا جب وہ تھک گیا تو اس نے گامی کو آواز دی۔

"چل اوئے گامی۔ ۔ ۔ دو سو گالیاں تو گن۔"

گامی دیوار سے ہٹ کر ریشم کی چارپائی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور دُتے کو خوش کرنے کے لیے بڑے بھیٹھ کو چوانی انداز میں گندی اور گھناؤنی گالیاں بولنا شروع کر دیں۔ ریشم کا جو حال ہو رہا تھا، وہ تو ہونا ہی تھا۔ گامی کی گالیاں سن کر داراں اور فیروزی دوپٹے والی بھی کانوں پر ہاتھ رکھے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔ ریشم کی آنکھیں بند تھیں اور دانت یوں بھنچے ہوئے تھے جیسے کوئی اس کے جسم کے انتہائی نازک حصّے کی چیر پھاڑ کر رہا ہو۔ جب گامی اپنے حصے کی دو سو گالیاں پوری کر چکا تو دُتے نے چاچی سیداں کے ہاتھوں دوسری کوٹھڑی سے سانٹا منگوایا، اور گالیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ ریشم کو بڑی بیدردی سے پیٹنے

یشم شدّتِ درد سے بچوں کی طرح بلبلا اٹھی اور گامی ایک بار کانپ سا گیا۔ اس نے اتنی ں سے کبھی اپنی گھوڑی کو بھی نہ پیٹا تھا۔ ریشم کے جسم پر۔ ۔ ۔ ریشمی جسم پر لمبے لمبے سُرخ لے نشان پڑ گئے اور ان میں سے گہرا سرخ خون رسنے لگا۔ اس کے بعد دُتے سیٹھ نے پ شوا تارا اور بڑی بے حیائی سے ریشم کے جسم کے بے انتہا نازک مقامات پہ مارنے لگا۔

"ان کا مان کرتی ہو؟ ان کی شرم کرتی ہو تیری ماں۔ ۔ ۔"

آخر چاچی سیداں آگے بڑھی اور اس نے دُتے سیٹھ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"دُتیا! بس اب حد ہو گئی ہے۔ اب اس بے زبان پر رحم کرو۔"

دُتے سیٹھ نے اسی گرمی سردی میں ایک جوتا چاچی سیداں کو بھی لگا دیا اور غضب ناک طرح غراتا کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔

تین دن تک ریشم پر غشی کی سی حالت طاری رہی، اور داراں، چاچی سیداں اور فیروزی دوپٹے ے انہماک اور محبت سے اس کی تیمار داری میں لگی رہیں۔ پل پل اس کی پٹیاں بدلتیں، کو نیم کے گرم پانی سے دھوتیں۔ ریشم کے منہ میں دودھ اور روح کیوڑہ ٹپکاتیں۔ پانچویں بب اسے ذرا ہوش آیا تو داراں سے لپٹ کر بچیوں کی طرح پھوٹ کر رونے لگی۔ داراں ی آنسو نکل آئے اور وہ اسے حوصلہ دینے لگی۔

"ہمت نہ ہار و بہن ریشم! جو خدا کو منظور تھا وہی ہوا ہے۔ اب ہمیں ہی اپنی بہنیں ا اور ہمیں ہی سہیلیاں۔ اس طرح کب تک روتی رہو گی؟"

فیروزی دوپٹے والی بھی اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔

"ہاں ریشم بہن! اس طرح کب تک روتی رہو گی؟"

رات کے نہ جانے کتنے بجے ہوں گے۔ ریشم کوٹھڑی میں بستر پہ چپ چاپ لیٹی چھت ںد رہی تھی۔ آج اس کے زخم پہلے سے بہت اچھے تھے اور بخار بھی نہیں تھا کہ کوٹھڑی کا دروازہ آہستگی سے کھل کر بند ہوا اور گول سر اور گھناؤنی مونچھوں والا گامی، ریشم کی چارپائی کے پاس آ کر پر بیٹھ گیا۔ ریشم نے گردن اٹھا کر اسے تعجب سے دیکھا۔ گامی بڑے رازدارانہ انداز میں بولا۔

"ریشم! ریشم!! میں تجھے یہاں سے بھگانے آیا ہوں۔ چلو میرے ساتھ بھاگ چلو۔ ہم دونوں

لاہور سے کوچ کرکے چک جھمرہ ایک گاؤں میں جاکر رہیں گے تم مجھ شادی کر لینا اور میں تمھیں تانگے کی سیر کرایا کروں گا۔ کیوں ریشم! چلتی ہو؟ ہیں؟ ہیں ریشم۔ ۔ ۔ ۔؟"

گامی کا دَم پھولا ہوا تھا اور وہ بار بار ہونٹوں پہ زبان پھیر رہا تھا۔ ریشم کے دل پر گامی کی تجو[یز] کا ذرّہ برابر اثر بھی نہ ہوا۔ اس نے کمبل اپنے اوپر کھینچ لیا اور بڑی نفرت بھری آواز میں بولی۔

"یہاں سے دفع ہو جاؤ، ورنہ ابھی شور مچا دوں گی۔"

"مگر ریشم! ریشم جی! میں تیرے ہی فائدے کی سوچ رہا ہوں۔ میرے ساتھ بھاگ چلو گی تو موج میں رہو گی۔ وگرنہ یہ لوگ تجھے کبھی نہ چھوڑیں گے اور تم اسی کوٹھڑی میں ایڑیاں رگڑ رگ[ڑ] کر مر جاؤ گی۔"

ریشم ذرا اونچی آواز میں بولی۔

"اگر تم نہ گئے تو میں تمھارے مالک کو سب کچھ بتا دوں گی۔"

گامی نے ایک دَم ریشم کے پاؤں پکڑ لیئے اور گڑگڑانے لگا۔

"خدا کے لیئے اسے مت کہنا۔ وہ میری گردن اتار دے گا۔ تم بے شک میرے ساتھ چلو مگر دُتے سیٹھ کو کچھ نہ بتانا۔ وعدہ کرو کہ تم اسے کچھ نہ کہو گی۔ وعدہ کرو ریشم!"

جب ریشم نے وعدہ کر لیا کہ وہ دُتے سیٹھ کو اس رات کا حال کبھی نہ بتائے گی تو گا[می] آہستہ سے اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا:

"میں کوئی نیکی کرنا چاہتا تھا ریشم! اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے تم سے پیار ہو گ[یا] ہے۔ لیکن خیر۔ ۔ ۔ میری قسمت ہی ایسی ہے۔ میں شروع ہی سے گنہگار ہوں۔ ۔ ۔!"

اور وہ دروازہ کھول کر چپکے سے دبے پاؤں باہر دالان میں نکل گیا۔

ریشم کو نہ جانے کیا خیال آیا۔ اس نے لیٹے لیٹے اپنے دونوں بازو اپنے چہرے پر رکھ[ے] اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی اور اس کے ساتھ ہی اسے داراں کے الفاظ یاد آگئے۔

"اس طرح کب تک روتی رہو گی ریشم بہن؟"

ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ کی مناسب تیمار داری کے بعد ریشم بالکل ٹھیک ہو گئی۔

جب اس کے زخم اچھے ہو گئے اور وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گئی تو ایک شام دُتا سیٹھ اسے اور داراں کو لے کر کوٹھڑی میں بیٹھ گیا اور شراب پینی شروع کر دی۔ پھر گامی بھی کباب، تکے اور پان لے کر وہاں آگیا۔ دُتا سیٹھ کی آنکھیں بڑی خوفناک ہو رہی تھیں اور وہ بار بار یوں ریشم کو دیکھتا جیسے عالم نزع میں ہو۔ اس نے ریشم کو اپنی ران پر بٹھلا رکھا تھا اور اس کے ہاتھ سے شراب پی رہا تھا۔ ریشم دُتے سیٹھ سے خوف کھانے لگی تھی اور اس کی ہر بات بغیر حیل و حجت مان لیتی تھی۔ شراب کی بُو سے اسے متلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن وہ ضبط کیئے بیٹھی تھی اور بوتل میں سے شراب گلاس میں انڈیل کر دُتے سیٹھ کو پلا رہی تھی۔

"ہک۔ ۔ ۔ ۔ ذرا ہنس کے۔ ۔ ۔ ۔ ذرا۔ ۔ ۔ ہک۔ ۔ ۔ پھیری لے کے پلا جانی۔"

داراں کو گامی نے دبوچ رکھا تھا۔ لیکن وہ اسے ہنس ہنس کے پلا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ گندی قسم کے مذاق بھی کیئے جا رہی تھی۔ گامی کو ابھی نشہ نہیں چڑھا تھا اور وہ بڑی گرمجوشی سے سگریٹ پیتے ہوئے تکے نوشِ جان کر رہا تھا۔ داراں خود بھی پی رہی تھی اور اس کی آنکھیں کسی وقت طوطے کی طرح اپنے حلقوں میں گردش کرنے لگتی تھیں۔ دُتے سیٹھ نے چوتھا پیگ اٹھاتے ہوئے ریشم کے گال پر بڑا پٹاخے دار بوسہ دیا اور گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ تیز بُو کا ایک بھبکا ریشم کے دماغ میں سلاخ کی طرح گڑ گیا اور اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔

"ارے پیو ہک ... میری بلبل ہک ... پی ڈُ ...

شالا جوانیاں مانیں

آکھا نہ موڑیں ... ہک ... پی لے ..."

ریشم دونوں ہاتھوں سے ہونٹوں تک آیا ہوا گلاس پیچھے ہٹانے لگی۔

"میرا دل نہیں چاہتا۔ مَیں نہیں پیوں گی"

ڈُلّا سیٹھ کی کانی آنکھ بڑی عاجزی سے پھڑکی اور اس کا بایاں گال نیچے ڈھلک گیا

"میری بلبل نہیں پیتی ... ہک ... پھر ... ڈُلّا سیٹھ بھی نہیں ... ہک گامی جی گامی جی ... اوئے بدّ دیا پُترا؟"

گامی، داراں کی گردن پر اپنی مونچھیں رگڑنے میں مصروف تھا۔ ڈُلّا سیٹھ کی تیسری آواز پر ایک دم چونکا۔

"جی بادشاہو؟"

"گامی جی" ڈُلّا سیٹھ پھر موم ہو گیا "میری گیتا بالو نہیں پیتی ... ہائے میں مر جاؤں گا، ہک ... گامی جی رستہ تیار ہے جی؟"

گامی بھی کچھ کچھ نشے میں آ رہا تھا۔ داراں کے کان میں ناک گھسیڑتے ہوئے بولا:

"تیار ہے جی ... ڈُلّا سیٹھ جی"

"تو پھر ہم مر جائیں گے جانی" ڈُلّا ریشم سے لپٹ گیا۔ ریشم کا دم گھٹنے لگا۔ ڈُلّا سیٹھ ایک ہاتھ پھیلائے ریشم کو بڑی رقّت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے لمبی اور بھدّی آواز میں گانے لگا، بلکہ ماتم کرنے لگا۔

"...... میرا دل دُکھا دیا تو نے

ہائے کیا پا لیا تو نے ......"

اور پھر ڈُلّا سیٹھ ناک سڑکتے ہوئے رونے لگا۔ داراں کی ناک میں گامی کی مونچھ کا بال گھسا تو اسے چھینک آ گئی اور گامی بکرے کی مانند بڑی تکلیف سے ممیا اٹھا۔

"ہائے نشہ نہ توڑ ظالما ... ساتھوں مکھ نہ موڑ ظالماں ....

داراں ... کوٹھے چڑھ چھیڑاں ماراں ... داراں جی ..."

داراں اب پورے نشے میں تھی اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور سگریٹ پہ سگریٹ پی رہی تھی اور ایک ٹانگ چارپائی پر رکھے ران پر ہاتھ سے طبلہ بجاتے ہوئے گا رہی تھی:

"دل دے کے دل لیا ہے

کیا محنت دے دیا ہے ...."

ڈُلّا سیٹھ ریشم کی بغل میں منہ گھسیڑے سسکیاں بھر رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ڈُلّا سیٹھ بار بار یہی کہہ رہا تھا۔

"میرا دل دُکھا دیا تو نے ... ہک ... ہائے کیا پا لیا تو نے؟ ... پی لے میری گیتا بالو جی ... پی لے ... ہک ..."

"مگر مَیں کیسے پیوں؟ مَیں نے اسے کبھی نہیں پیا"

"تو پھر ... ہک ... آج پی لے ظالم ... نہیں تو میں مر جاؤں گا ... ڈُلّا مر جائے گا ... سب مر جائیں گے ... میں بھی دوزخ میں جاؤں گا .. گامی بھی دوزخ میں ہک ... چاچی سیداں ہک ... پی لے ... پی لے ... ہائے پی لے ..."

ڈُلّا ایک بار پھر بچوں کی طرح رونے لگا اور اس کی کانی آنکھ آنسوؤں سے بھر گئی۔ ریشم کا دل بھی بھر آیا اور اس کا ہاتھ اپنے آپ ڈُتّے سیٹھ کے سر کے چھوٹے چھوٹے بالوں پر بڑی شفقت سے پھرنے لگا جیسے ماں اپنے ضدّی بچے کو پیار کر رہی ہو۔

"اچھا تھوڑی سی پی لیتی ہوں"

ڈُتّے سیٹھ نے خوشی کی ایک چیخ ماری اور ہچکولے کھاتی وسکی سے نصف بھرا ہوا گلاس ریشم کے ہونٹوں سے بھڑا دیا۔ ریشم نے آنکھیں اور ناک بند کر کے کڑوے کسیلے اور تیز پانی کا پہلا گھونٹ حلق میں اتارا ہی تھا کہ اسے اچھو آ گیا اور وہ بے اختیار ہو کر کھانسنے لگی اور اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ ڈُتّے سیٹھ نے جوش میں آ کر گلاس کی باقی شراب بھی ریشم کے منہ پہ پھینک دی اور ضائع شدہ شراب کو دیکھ کر اس کا آدھا نشہ ہرن ہو گیا اور غصّے میں اس کی کانی آنکھ پھڑکنے لگی۔ اس نے بھرپور ہاتھ سے ریشم کے ایک لپڑ مارا۔

وہ ہلکی سی بھنچی ہوئی "ہائے" کہہ کر دری پر گر پڑی "تیری ماں . . . سالی میری وسکی ضائع کرتی ہے . . . ہیں؟ . . . ہوں . . . ہک . . . ."

گامی اور داراں نے نشے کی دبیز تہوں میں سے سر اٹھا کر انھیں دیکھا اور پھر اپنے شغل میں محو ہو گئے۔ لیکن گامی نے ریشم کی ہلکی سی "ہائے" سن لی تھی۔ اس کا دل دکھ گیا تھا لیکن وہ دُلے سیٹھ کے آگے کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ داراں کی قمیص کے اندر پھیرتے ہوئے اپنا منہ داراں کے گنجان بالوں میں چھپا دیا اور ریشم کو یاد کر کے دل ہی دل میں کہنے لگا "ریشم جی . . . میرے ساتھ بیاہ کر لو جی . . . ."

اتنے میں ریشم کی شلوار ان دونوں کے سروں پر آن گری اور اس کی خبر نہ گامی کو ہوئی اور نہ داراں کو . . . بند کھڑکی کے عقب میں رات کے بیمار سائے گندی اور اندھیری گلی میں گہرے ہو گئے اور کسی مکان کے گرتے پرنالے کی آواز زیادہ صاف سنائی دینے لگی۔ باہر دالان میں چاچی سیداں بجھے ہوئے چولھے کے پاس بیٹھی کمبل میں لپٹی اونگھ رہی تھی اور دوسری کوٹھڑی میں فیروزی دوپٹے والی محلے کے ادھیڑ عمر چوہدری کی مہندی لگی مونچھوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی اور وہ اس کے ساتھ لیٹا بناوٹی دانت نکالے ہنس رہا تھا اور کبھی کبھی پوچھ لیتا تھا۔

"اُدھر کیا ہو رہا ہے جی؟"

پچھلے پہر کوئی تین چار بجے کے قریب داراں کی آنکھ کھل گئی۔

اس کی آنکھیں سلگ رہی تھیں اور منہ کا ذائقہ ایسا ہو رہا تھا جیسے وہ ساری رات پیاز کھاتی رہی ہو۔ اس نے دری پر لیٹے لیٹے گردن اٹھا کر دیکھا۔ کونے میں ٹمٹماتا ہوا دیا آدموں پر تھا۔ گامی اور دُلا سیٹھ جا چکے تھے اور ذرا پرے ریشم دری پر سو رہی تھی۔ اس کا سر اپنے بازو پر تھا اور کمبل ٹانگوں پر اوپر تک کھسک گیا تھا۔ داراں آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور اس نے اپنے پاس ہی ریشم کی سپید سلکی شلوار دیکھی۔ وہ آہستہ سے دری پر گھسٹتی ریشم کے پاس گئی اور اس سے لپٹ کر پھر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ ریشم نے کوئی مزاحمت نہ کی اور آہستہ آہستہ بیدار ہو گئی۔

"میں ہوں . . . ! . . . داراں۔ سو رہو، سو رہو۔"

ریشم آنکھیں بند کرتے ہوئے جیسے خواب میں بڑبڑائی۔

"ہاں داراں . . . سو رہو . . . سو رہو۔"

داراں یوں منہ مارنے لگی جیسے کچھ کھا رہی ہو۔

"ریشم . . . میری بہن! تجھے بچہ ہونے والا ہے۔ یہ بچہ تو مجھے دے دے میں ساری عمر تیری غلام رہوں گی۔ یہ بچہ مجھے دے دے میری بہن . . . یہ لوگ اسے ضائع کر دیں گے . . . ."

ریشم جیسے خواب سے چونک اٹھی۔ اس نے دیئے کی ٹمٹماتی نحیف روشنی میں آنکھیں جھپکا جھپکا کر کوٹھڑی میں اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر داراں کے رخسار پر اپنے گال رکھ دیے۔

"ہاں داراں . . . مجھے بچہ ہونے والا ہے۔ بڑا خوبصورت، بڑا پیارا . . . آلوچے کے پھولوں سے بھی زیادہ پیارا . . . میں اس کا نام کیا رکھوں داراں؟"

"یہ بچہ مجھے دے دو میری بہن . . . مجھے دے دو . . . ."

"میں اس کا نام رکھوں گی وحیدہ . . . ." ریشم کا حلق ایک دم کڑوا ہو گیا۔ اور اس نے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں۔

"نہیں . . . یہ نام نہ رکھوں گی۔ یہ نام بڑا منحوس ہے۔ یہ نام تو کسی بچے کا نہیں ہو سکتا میں اپنے بچے کا نام چمبہ رکھوں گی۔ چمبہ جہاں میں پیدا ہوئی تھی۔ داراں! تم کبھی چمبہ گئی ہو میری بہن؟ چمبہ میرے وطن کا نام ہے۔ میری پہاڑیوں، میری گلیوں اور میری سہیلیوں کا نام ہے . . . رُمکن، نرملا، بسنت اور رامی . . . ہمارے گھر میں کتنی ہی بھینسیں تھیں۔ میں نے گلدموں کے بچے پال رکھے تھے اور جب ہم پاکستان آنے لگے تھے تو میں نے دیکھا گلد میں سہمی بیٹھی ہیں، اور ہانپ رہی ہیں اور اب تو وہ بڑی ہو گئی ہوں گی اور اپنی دُموں کے جھاڑ پھیلائے آنگن میں دانہ دنکا چنتی ہوں گی۔ . میں اپنے بچے کا نام چمبہ رکھوں گی . . . چمبہ . . . اور داراں تم نے وہ گیت سنا ہے جو ہم دیوالی کی رات کو گایا کرتی تھیں۔

چھبے دیاں ہٹیاں
وکدا ای چینا
کس مرنا اور کس جینا
چھبے کی دکانوں پر خشک میوے بک رہے ہیں
کیا خبر اگلے موسم میں
کون زندہ رہے، کون مر جائے؛

داراں نے ریشم کو اپنے ساتھ لپٹا رکھا تھا اور بڑی افسردگی سے کہہ رہی تھی۔

"وہ تمہارا بچہ ضائع کر دیں گے ریشم، وہ اسے گرا دیں گے۔ ۔ ۔ ۔"

ریشم کی آنکھوں میں غضبناک شیرنی کا غصہ بھڑکنے لگا۔

"میرا بچہ کوئی ضائع نہیں کر سکتا۔ میرا چھبہ کوئی مجھ سے جدا نہیں کر سکتا۔ میرا بچہ کوئی نہیں گرا سکتا۔ چھبہ میرا ہے اور سدا میرا رہے گا اور مرنے کے بعد میری روح کو انھی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور چھوٹی چھوٹی وادیوں میں سکون ملے گا۔ ۔ ۔ ۔"

"مگر ریشم بہن! میری بات کا یقین کرو۔ دُلا سیٹھ تمہارا بچہ ضرور گرا دے گا۔ ضرور گرا دے گا۔"

ریشم اپنی بے بسی کے دردانگیز خیال سے رونے لگی۔

"لیکن وہ ایسا کیوں کرے گا داراں! میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؛ میرے بچے نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ اگر اس نے ننھی سی جان کو گرا دیا تو پھر اس شہر کے سارے مکان گر پڑیں گے اور کاؤ کا وہ درخت بھی گر پڑے گا جس کے تنے کے ساتھ چھبہ کلی کی بیل لپٹی رہتی ہے اور جس کی چھاؤں میں چھبہ کلی کے سفید پھولوں کی چادر پر میں نے اس بچے کو اٹھایا تھا۔ پھر کچھ باقی نہیں رہے گا داراں۔ ۔ ۔ ۔ میری بہن۔ ۔ ۔ ۔ میری سہیلی۔ ۔ ۔"

داراں نیم خوابیدہ آواز میں جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

"سو رہو۔ ۔ ۔ ۔ سو رہو۔ ۔ ۔ ۔"

طاقچے میں ٹمٹماتا ہوا دِیا آہستہ آہستہ مدھم ہوتا جا رہا تھا۔

نومبر میں جب موسم سرما کا لاہور میں باقاعدہ آغاز ہوا تو ریشم کے پیٹ میں اس کا بچہ ضائع کر دیا گیا۔ پہلے دن شام کو ڈاکٹر ٹیکہ لگانے اس کی کوٹھڑی میں آیا۔ اسے کہا گیا تھا کہ وہ طاقت کے ٹیکے ہیں، لیکن داراں نے کچھ روز پہلے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ ڈاکٹر مریل سے جھکے ہوئے جسم کا کمزور بوڑھا تھا جس کے گنجے سر پہ بچے کھچے تمام بال سفید اور مٹیالے تھے۔ پہلا ٹیکہ لگاتے ہوئے ایک بار اس کا ہاتھ بھی کانپا تھا لیکن دُلا سیٹھ ابھرے ہوئے سانڈ کی طرح اس کے سر پر کھڑا خرخرا رہا تھا اور کانی آنکھ ٹیڑھی کئے دوسری آنکھ سے بڑے غور سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ریشم بڑے سہمے ہوئے خوفزدہ چہرے سے ڈاکٹر کو ٹیکے میں دوائی بھرتے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل حلق کے قریب آ کر دھڑک رہا تھا اور پیشانی پسینے میں نہا رہی تھی۔ ٹیکے میں دوائی بھری جا چکی اور ڈاکٹر اس کے ننگے بازو پہ جھکا تو ریشم کے منہ سے بے اختیار ایک دردانگیز چیخ نکل گئی اور وہ مزاحمت میں اپنا بازو چھپانے لگی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ اگر اس نے اپنا بازو آگے کیا تو کوئی خونخوار دانتوں والی بلا اس کا سارا بازو ایک دم چبا جائے گی، لیکن دُلا سیٹھ کے سامنے اس کی ہر فریاد دھواں بن کر اڑ گئی۔ ہر لہر ریت میں خشک ہو گئی اور ہر آواز خلاؤں میں گونج کے رہ گئی۔

ابھی ٹیکے پورے نہیں ہوئے تھے کہ ریشم بیمار ہو کر چارپائی پہ پڑ گئی۔ اس کا رنگ ہلدی کی مانند پیلا اور مرجھا سا گیا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے سے نمودار ہو گئے اور چند ہی دنوں میں مہینوں کی بیمار لگنے لگی۔ چاچی سیداں، فیروزی دوپٹے والی اور داراں ایک بار پھر ریشم کی تیمارداری میں مصروف ہو گئیں۔ دُلا سیٹھ بھی اس کی بڑی خبرگیری کرتا۔ طاقت کی نئی سے نئی دوائیں منگوائی گئیں۔ گھی میں بھنے ہوئے بادام دن میں کئی بار کھلائے جانے لگے۔ ہر قسم کا موسمی پھل ریشم کے سرہانے ہر وقت موجود رہتا۔ گھر میں ہر شخص اس سے بڑی محبت سے پیش آتا۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت اور خواہش کا خیال رکھا جانے لگا۔ گامی سارا سارا دن یونانی جڑی بوٹیاں گھوٹتا رہتا۔ دُلا سیٹھ دن میں دو بار ضرور ریشم کا حال پوچھنے آتا۔ وہ بڑی محبت سے ریشم کے پاس بیٹھ جاتا اور اپنے ہاتھ سے انار یا ولائتی ناشپاتیاں چیر چیر کر اسے کھلانے لگتا۔ ریشم بھی کچھ یوں محسوس کرنے لگی تھی جیسے

غار کے جنگلی درندوں نے اس کی جان بخشی کر دی ہو اور اس پر ہمیشہ کے لیے مہربان ہو گئے ہوں۔ اسے اپنے بچے . . . . . اپنے بے قصور بچّے کے ضائع ہونے کا بہت صدمہ تھا۔ لیکن ایسے موقع پر اسے داراں کے الفاظ یاد آجاتے . . . "یہ بچہ تیرے پہلے گناہ کی آخری نشانی تھی ریشم۔ اس کا ضائع ہو جانا ہی بہتر تھا۔ یہ اگر زندہ رہ جاتا تو پھر تو دنیا کو اس چلتے پھرتے سوال کا کبھی جواب نہ دے سکتی تھی "، اور وہ سوچتی کہ ایک طرح سے تو جو کچھ ہوا ہے، بہتر ہی ہوا ہے۔ اگر وحید اسے اس طرح دغا دے کر ویران کھنڈروں میں دربدر ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ گیا ہے تو وہ اس کے بچے کی پرورش کیوں کرے؟ کیا خبر بڑا ہو کر وہ بچہ بھی ایک دن اپنے باپ کی طرح اسے کسی پلیٹ فارم پر تنہا چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ خدا جو کچھ کرتا ہے اس میں بڑی مصلحت ہوتی ہے۔ ریشم کو اس نئے خیال نے بڑا حوصلہ دیا اور وہ حیران ہو گئی کہ اس سے پہلے اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ اسے ہر حالت میں خدا پر اعتقاد رکھنا چاہیے تھا۔ وہی انسانوں کو ذلت دیتا ہے اور وہی عزّت عطا کرتا ہے۔ اگر اس نے زندگی کو گندگی کے اس گڑھے میں گرایا ہے، تو وہی اسے باہر نکالے گا۔ ویسے ریشم کو مکمل طور پر یقین ہو گیا تھا یا اسے یقین دلا دیا گیا تھا کہ وہ ان لوگوں سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی۔ وہ جہاں بھی جائے گی، دُتے سیٹھ کے حواری وہاں پہنچ کر اس کا خاتمہ کر دیں گے۔ بقول چاچی سیداں، دُلاّ سیٹھ ایسی کئی عورتوں کو ہلاک کروا کر ان کی لاشیں تیزاب میں ڈلوا چکا ہے۔ ریشم کا خیال تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے بھاگ کر اپنے گاؤں چلی جائے گی اور اپنے ماں باپ کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لے گی اور پھر اپنی پہلے ایسی سیدھی سادی زندگی شروع کر دے گی، مگر اب اسے یوں لگتا تھا جیسے اگر وہ گاؤں چلی جائے گی تو ایک دن وہ دودھ بیچ کر واپس آ رہی ہو گی یا باؤلی پر بیٹھی کپڑے دھو رہی ہو گی کہ اس کی پشت پر تیز دھار والا خنجر پیوست ہو جائے گا اور اس کی چیخ بھی نہ نکل سکے گی اور پھر اس کی لاش کو وہیں کہیں گھاٹیوں میں پتھروں تلے دفنا دیا جائے گا اور اس کے قاتل کا عمر بھر پتا نہ مل سکے گا وہ ایسا خطرہ کیوں مول لے۔ اگر خدا کو یہی منظور ہے کہ وہ دُتے سیٹھ کے پاس رہ کر اپنا جسم بیچ کر روزی حاصل کرے تو اس بیچاری ریشم کو کیسے انکار ہو سکتا

نے ہمیشہ خدا کی مرضی کے آگے سر جھکایا تھا اور آج بھی وہ اپنا سر جھکا دینا چاہتی تھی۔

اے نگاہوں اور دِلوں کے پھیر دینے والے!

اے رات اور صبح کے بنانے والے!!

. . . . میرا خیال تھا تو میری اس نئی زندگی کو پسند نہیں کرے گا۔ چنانچہ میں نے سر توڑ کوشش کی کہ اس سمندر کی گندی لہریں میرے دامن تک نہ پہنچ سکیں۔ میں نے کئی کئی وقت فاقے کیے۔ ننگے بدن پر چابکوں کے لمبے لمبے زخم سہے۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر تیرے حضور میں دعا کی۔ لیکن تو خاموش رہا اور اب پتا چلا کہ تیری بھی رضا یہی ہے جو دُلاّ سیٹھ کی ہے۔ پس اے مالکِ ارض و سما اے میرے بابا اور دُلاّ سیٹھ کے بنانے والے! میں تیری رضا کے آگے سرِ تسلیم خم کرتی ہوں۔ مجھے اتنی طاقت دے کہ میں اس امتحان میں پوری اُتر سکوں . . . . آمین!

اور پھر ریشم اب اپنے گھر جائے بھی تو کس منہ سے جائے گی؟ کیا گاؤں کے لوگ اسے برداشت کریں گے کہ ریشم جو ایک ماہ گھر سے باہر رہی ہے، ایک خانقاہ کے حجرے میں رہی ہے اور اسی طرح پاکیزہ ہے، جیسے گھر سے نکلتے وقت تھی۔ نہیں . . . کوئی بھی اس طرح نہیں سوچے گا۔ کوئی ماں اسے اپنی بیٹی کے ساتھ بات نہ کرنے دے گی اور کوئی باپ اسے اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دے گا۔ کیا معلوم اس کا باپو بھی نفرت کرنے لگے اور اس کی ماں اسے اپنی بیٹی تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ اور ہو سکتا ہے، وہ لوگ اسے اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے دیں، لیکن اس کا بوڑھا باپ گاؤں کی برادری میں اپنے وقار اور خاندانی عزّت کی گِری ہوئی ساکھ کو دوبارہ تعمیر کرنے کے لیے رات کو چپکے سے اٹھ کر اپنی بیٹی کا گلا دبا دے اور پھر صبح برادری میں للکار کر کہے "دیکھو میں نے اس ناگن کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ جس نے میرے گھر میں جنم لیا تھا اور ہمارے گاؤں کی عزّت پر کیچڑ اچھالا تھا۔ اپنے گاؤں کی عزّت کی خاطر یہ بوڑھا بیٹی ہی نہیں اپنے بیٹے بھی قربان کر سکتا ہے" ہر طرف سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوں اور بابا کا بوڑھا چہرہ کھوئی ہوئی عزّت کے واپس مل جانے پر تمتمانے لگے . . . . نہیں، وہ واپس نہیں

جاسکتی۔ داراں ٹھیک کہتی تھی۔ واپس جانے سے بہتر ہے کہ وہ یہیں گمنامی میں چھپ کر اپنے ماں باپ کی عزت کی حفاظت کرے۔۔۔ اب وہ کبھی واپس نہیں جائے گی۔۔۔ کبھی واپس نہیں جائے گی!

ٹیکہ لگانے والا بوڑھا ڈاکٹر ہر وقت کچھ کھویا کھویا سا رہتا۔ وہ روز شام کو ٹیکہ لگانے آتا۔ دوائی بھر کر انجکشن دیتا اور واپس چلا جاتا۔ وہ سوائے ہوں ہاں یا کسی وقت ایک آدھ جملہ کہہ دینے کے کسی سے کوئی بات نہ کرتا۔ اس کی سوچی سوچی خاموش سی آنکھوں میں ہر وقت گویا ان کہی باتوں کا اشتیاق سلگتا رہتا۔ ریشم نے کئی بار محسوس کیا جیسے بوڑھا ڈاکٹر اپنی پشت پر کوئی بوجھ لیے ہوئے ہے، جیسے وہ اپنی پہلی فرصت میں کہیں گرا دینا چاہتا ہے، جیسے وہ ریشم سے کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن اسے موقع نہیں مل رہا۔ عام طور پر جب وہ ٹیکہ لگانے آتا۔ ریشم کے پاس داراں یا چاچی سیداں اور یا پھر گامی ضرور ہوتا۔ چنانچہ وہ ٹیکہ لگا کر اپنا ڈبہ جیب میں ڈال کر اکھڑے اکھڑے سے قدم اٹھاتا آنگن میں سے گزر جاتا۔ ایک دن شام کو جب وہ کوٹھڑی میں داخل ہوا تو داراں ریشم کے پاس بیٹھی ابلے ہوئے بادام چھیل رہی تھی۔ ریشم کی حالت پہلے سے کافی بہتر ہو گئی تھی۔ اس کے جسم میں جان سی آ گئی تھی۔ اور چہرے کا رنگ بھی بہت حد تک نکھر گیا تھا۔ ڈاکٹر لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر اوزاروں کو گرم پانی میں دھونے لگا۔ جب وہ دوائی بھر کر سرنج کی سوئی کو روئی سے پونچھ رہا تھا تو داراں کو یاد آ گیا کہ چولھے پر دودھ رکھا ہے، کہیں ابل نہ جائے۔ وہ باداموں کا گلاس ساتھ ہی لے کر وہاں سے اٹھی اور باہر چولھے کے پاس جا بیٹھی۔ بوڑھے نے بڑی خاموشی سے ریشم کے انجکشن لگایا اور سپرٹ میں بھگوئی ہوئی روئی سے بازو پر ٹیکے کا نشان ملنے لگا۔ پھر وہ ڈبے میں اپنا سامان سنبھالتے ہوئے تھکی تھکی آواز میں بولا:

"کل انجکشن کا آخری دن ہوگا میری بچی"

ریشم کچھ نہ بولی۔ بوڑھا تھوڑی دیر بعد خود ہی بولا:

"تم میرے اس گناہ کو معاف کر دینا بیٹی۔۔۔ میں تمہارے مالک کا کہا نہیں

ل سکتا۔ میں اگرچہ بوڑھا ہو گیا ہوں، لیکن ابھی کچھ سال اور زندہ رہنا چاہتا ہوں، کاش ں ڈاکٹر نہ ہوتا۔ مجھے تمہارا بچہ ضائع کرنے کا کوئی حق نہیں تھا مگر دتے سیٹھ کے سامنے ئی بھی انکار نہیں کر سکتا اور جیسا کہ میں تمہیں کہہ چکا ہوں میں ابھی کچھ اور سال زندہ ہنا چاہتا ہوں۔ میں مجبور ہوں میری بچی۔۔۔۔"

ریشم کے چہرے پر بڑی گہری طنز بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"یہاں سب مجبور ہیں ڈاکٹر جی، میں بھی اور آپ بھی۔۔۔۔ نہ آپ کچھ کر سکتے ں اور نہ میں کچھ کر سکتی ہوں۔ جو کچھ ہو رہا ہے خدا کی طرف سے ہو رہا ہے اور خدا کی ضی میں ہمارا آپ کا کیا دخل ہے؟"

ڈاکٹر نے جھک کر اپنے بوڑھے ہاتھ سے ریشم کا بازو آہستہ سے تھپتھپایا۔

"غمی اور خوشی میں خدا تمہارے ساتھ ہو میری بچی"

اتنا کہہ کر اس نے ڈبہ جیب میں ڈالا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔

پورے ڈیڑھ ماہ بعد جب ریشم کو بالکل صحت ہو گئی اور رنگ روپ پہلے ایسی لت پر آ گیا تو ایک رات دس بجے کے بعد جب کہ سردی اپنے شباب پر تھی، اس کا ا گاہک کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ یہ محکمۂ ٹیلیگراف اور ٹیلیفون کا ایک کلرک تھا جس گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور خمیدہ ناک کچھ اس طرح نیچے کو مڑتی چلی گئی تھی ے ٹھوڑی کو چھونے کی کوشش کر رہی ہو۔ بھورے رنگ کا بڑا سا مفلر گردن کے گرد بڑی دردی سے لپٹا تھا اور اونچے اونچے تنگ سے کوٹ کے تینوں بٹن بند تھے وہ بے ربط الٹے سیدھے قدم اٹھائے یوں کوٹھڑی میں داخل ہوا جیسے اپنے کسی افسر کے کمرے میں کسی وجہ کے آ گیا ہو اور اب سوچ رہا ہو کہ وہاں کھڑا رہے یا باہر چلا جائے۔ ریشم بستر لحاف اوڑھے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور اس نئے اور پہلے گاہک کو عجیب رحم نگاہوں سے تک رہی ہو۔ اس کا خیال تھا کہ اندر آنے والا شراب میں دھت ہوگا اتے ہی بھوکے جانور کی طرح اس کی ہڈیاں بھنبھوڑنا شروع کر دے گا۔ لیکن معاملہ الٹ تھا۔ اندر داخل ہونے والا یوں اندر داخل ہوا جیسے باہر نکل رہا ہو۔ وہ بڑی

مسکین صورت بنائے پرانی کرسی پر آگے کو جھک کے بیٹھا تھا اور انگیٹھی میں دبی ہوئی آگ تاپ رہا تھا۔ وہ ریشم کی طرف دیکھتے ہوئے گھبرا رہا تھا اور بار بار ناک اوپر چڑھا رہا تھا۔

"سوں ...... سوں ...... سردی ہے سوں ......"

اس کی آواز میں بے رنگ سی ٹھٹھری اور خشک گلوگیری تھی جیسے اس نے ریت پھانک رکھی ہو۔ اگرچہ چاچی سیداں نے خاص طور پر کہا تھا کہ وہ اپنے مہمانوں کا اچھی طرح دل بہلائے اور انھیں شکایت کا کوئی موقع نہ دے لیکن وہ اس آدمی کے وجود سے بالکل بے نیاز ہو کر بیٹھی تھی اور گرم گرم ریشمی لحاف میں نرم نرم کھال والی بلی کی طرح آنکھیں بند کر رہی تھی اور پھر کھول رہی تھی۔

آخر جب کافی دیر گزر گئی اور دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی تو مسکین صورت کلرک نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کھنکار کر گلا صاف کیا اور انگیٹھی کی سمت دیکھتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ بے رنگ آواز میں بولا:

"آج بڑی سردی ہے ...... ہے نا جی؟"

جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے منہ اوپر اٹھا کر ریشم کو دیکھا جو اس دوران میں سو گئی تھی۔ کلرک نے پھر گردن جھکا لی اور کتنی ہی دیر چپ بیٹھا رہا۔ پھر ایکا ایکی اسے ان تیس روپوں کا خیال آیا جو اس نے چاچی سیداں کو دیے تھے اور وہ دو روپے بھی جو کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں پھر گئے جو گامی نے اس سے زبردستی لے لیے تھے۔ اب اس پہ کرسی پر بیٹھے رہنا بڑا مشکل ہو گیا۔ اس نے بیٹھے ہی بیٹھے پہلے مفلر اتار کر کرسی پشت پر لٹکا دیا۔ پھر کوٹ اتارا۔ اس کے بعد جوتے اتار کر پھٹی ہوئی جرابوں میں سے پا نکال کر انھیں انگیٹھی پر سینکا اور پھر جیب سے قینچی کا سگریٹ نکال کر کوئلے سے سلگا اور پھر سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے تو آہستہ سے اٹھا۔ جھکا جھکا ریشم کی چارپائی کے پاس آیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ کی ملائم روشنی میں ریشم کے سانولے اور خوبصورت نقش صاف دکھائی دے رہے۔

کلرک کے نتھنوں میں خوشبودار پاؤڈر اور لپ اسٹک کی مہک آئی اور اس کے ذہن میں ٹیلیفون کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور مختلف آوازیں سنائی دیں۔ ہیلو! ہیلو! کہاں سے بول رہے ہیں؟ ایوننگ اِن پیرس؟ ہیلو پونڈز کریم، پونڈز سنو ...... چڑیا گھر ...... شی شی۔ خاموش رہو، خاموش رہو ...... ہیلو! ہیلو!! ...... کلرک نے آہستہ سے لحاف کا کونہ اٹھایا اور جلدی سے اس کے اندر گھس گیا۔ ریشم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور کلرک جہاں تھا وہیں کا وہیں اکٹھا ہو کر رہ گیا۔

"کیوں بے آرام کرتے ہیں آپ ...... آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

ریشم نے بیزاری سے لحاف ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ اس کے گرم گرم پاؤں سے کلرک کا ایک برف آلود پاؤں چھو گیا اور وہ لمبی 'سی' کہہ کر پرے ہٹ گئی۔ کلرک اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور بڑی ندامت سے سر جھٹک کر بولا:

"مجھے معاف کر دیں۔ میں ذرا لحاف میں آنا چاہتا تھا۔ اصل میں باہر ذرا سردی لگ رہی تھی ...... سوں ......"

ریشم نے پائینچے آگے کھسکا کر اپنے دونوں پاؤں ریشمی شلوار کے اندر کر لیے اور بڑی التفات آمیز دلچسپی سے کلرک کی باتیں سننے لگی۔

"اصل میں میری آج رات کی ڈیوٹی نہیں تھی اور میں نے اپنی بیوی کو کہہ دیا کہ میری آج رات کو بھی ڈیوٹی ہے۔ پھر میں کہاں جاتا۔ چنانچہ یہی خیال کیا کہ آپ کے پاس بیٹھ کر آپ سے باتیں کر کے ہی ڈیوٹی دی جائے۔"

ریشم نے جمائی لیتے ہوئے کہا:

"آپ کی بیوی بھی ہے۔"

کلرک نے اثبات میں چھوٹے چھوٹے بالوں والا سر ہلاتے کہا۔

"جی ہاں ...... اور بچے بھی ہیں۔ سوں ...... میری بیوی بڑی ظالم ہے اور وہ اپنے خاوند کو ذرا اچھا نہیں سمجھتی۔"

ریشم ذرا سی ہنسی۔

"تو پھر کیسے اچھا سمجھتی ہے؟"

"میرے بچوں کو۔"

"وہ بھی تو آپ ہی کے ہیں۔"

"جی ہاں ... لیکن وہ 'میں'، تو نہیں ہوں نا ... ہوں ..."

پھر وہ خود ہی ہنس پڑا اور اپنی اس بات پر اتنا خوش ہوا کہ ریشم کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر اسے آہستہ آہستہ گدگدانے لگا۔ ریشم نے بڑے آرام سے اس کا ہاتھ کھینچ کر اس کے دوسرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ کلرک کھسیانہ سا ہو کر دونوں ہاتھ ملنے لگا۔

"میری بیوی مجھ پر بڑا ظلم کرتی ہے۔ ذرا دیر سے جاؤں تو میری روٹی سامنے بٹھا کر خود کھا جاتی ہے۔ ذرا اونچا بولوں تو جوتی اتار لیتی ہے اور اگر میں بھی جوتی اتار لوں تو مجھے ننگے پاؤں کمرے سے نکال کر غسل خانے میں بند کر دیتی ہے۔ اسی کے کہنے پر میں اپنے ماں باپ سے بھی الگ ہو گیا ہوں۔ اب اگر اسے پتا چلتا ہے کہ میں اپنی ماں سے ملنے گیا ہوں تو وہ مجھے ساری رات اپنی چارپائی کے نیچے سلائے رکھتی ہے۔ آج رات میری ڈیوٹی نہیں تھی اور میں نے اسے کہا کہ میری ڈیوٹی ہے۔ اس نے مجھے رومال میں روٹی باندھ کر دی اور میں سیدھا یہاں چلا آیا ... گامی ہمارے دفتر کے باہر تانگہ کھڑا کیا کرتا ہے۔ وہ مجھے یہاں لے آیا، اس عورت نے مجھ سے تیس روپے لیے اور گامی دو روپے ... یہ میرے سائیکل کے کرائے کے پیسے تھے ... آؤ پہلے روٹی کھا لیں"

مسکین صورت کلرک نے کرسی پر رکھے ہوئے کوٹ کی جیب میں سے رومال میں لپٹی ہوئی روٹی نکالی اور اسے ریشم کے سامنے کھولنے لگا۔ ریشم نے روٹی پکڑ کر دوبارہ کرسی پر رکھ دی۔

"پہلے باتیں کریں، پھر روٹی کھا لیں گے۔"

کلرک شرمندہ سا ہو کر ہنسنے لگا۔

"اصل میں مجھے باتیں کرنے کی کچھ عادت سی ہو گئی ہے۔ ہیڈ کلرک صاحب کو بھی مجھ سے یہی شکایت ہے کہ میں کام کم کرتا ہوں اور باتیں زیادہ کرتا ہوں اور اس

راز کوئی بھی نہیں جانتا۔ جہاں میری ڈیوٹی ہوتی ہے، وہاں ہر سیکنڈ کے بعد ٹیلیفون پر سینکڑوں لوگوں کی باتیں سننا پڑتی ہیں اور بس ... ہی ہی ... یوں سمجھ لیں کہ مجھے بھی وہیں سے عادت سی ہو گئی ہے۔"

اس کے بعد اس نے قمیص کے دامن سے اپنا مڑا ہوا لمبا ناک صاف کیا اور ریشم کی طرف احمقوں کی طرح دیکھ کر ہنستے ہوئے اپنا بایاں ہاتھ آہستہ آہستہ اس کی پشت پر پھیرنے لگا۔ رات کے کسی بڑے گہرے سرد اور ویران لمحے میں مسکین صورت کلرک لحاف میں کہیں چھپا ریشم کے بازوؤں پر سر رکھے بڑبڑا رہا تھا۔

"میری بیوی مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ میرے بچے بھی مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ کیا آپ مجھ سے محبت کریں گی؟"

اور ریشم جیسے خواب میں اس نوجوان مسکین بچے کو آہستہ آہستہ تھپک رہی تھی۔

ریشم کا دوسرا گاہک ایک ٹرک ڈرائیور تھا جو لاہور سے اُون، کھالیں، گندم، کیلے، اور کوئلہ لے کر جہلم، پنڈی اور پشاور جاتا اور وہاں سے خشک میوہ، چائے، تمباکو اور تیل وغیرہ لے کر لاہور واپس آ جاتا تھا۔ اس کے اگلے دو دانت اوپر کو اُٹھے ہوئے تھے اور دونوں ہونٹ ٹھیک طرح آپس میں نہ ملتے تھے۔ سر کے بال گرد اور مٹی کی وجہ سے نمدہ ہو رہے تھے۔ اس نے اندر آتے ہی کمبل اتار کر پرے رکھ دیا اور ریشم کے پاس آ کر اسے سُرخ سُرخ خرابی آنکھوں سے گھور کر دیکھتے اور بڑے پُراسرار انداز میں مسکرانے لگا۔ ریشم سب سے زیادہ اس کے آگے نکلے ہوئے چوڑے گندے دانت اور پھر اس کی خوفناک آنکھیں دیکھ کر ڈر گئی۔ وہ زور سے ہنسنا اور ریشم کے چہرے سے دیسی شراب کی تیز بُو کا بھبکا ٹکرایا اور اس کا جی خراب ہونے لگا۔

"نیا ماڈل ہے ..... ہک ہوں..... بالکل نیا ماڈل ہے ...."

پھر اس نے آنکھیں بند کر کے ایک ہاتھ نصف دائرے کی شکل میں ہوا میں لہرایا اور کسی نامعلوم شخص سے باتیں کرنے لگا۔

"ہینڈل مارا دے مُڑیا... ہک ... نیا ماڈل آیا ہے .... ہی ہی ہوں ہک۔"

وہ شراب کے نشے میں چُور تھا اور عجیب عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔ کبھی لحاف کا کونا کر کہتا۔

"اس کے نیچے کیا ہے؟ ہیں؟ چرس تو نہیں چھپا رکھی ...؟"

۱۱

نجمہ اپنے خاوند اصغر ایڈووکیٹ کے ساتھ اس ہوٹل میں آئی تھی۔

اصغر نے مال پر اسے تھوڑی سی شاپنگ کرائی اور پھر دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے یہاں لے آیا۔ وہ قصبہ اسلام پور کی سادہ لوح نجمہ پر اپنی شہری زندگی کا رُعب جمانا چاہتا تھا۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ یہ لاہور کا بہترین ہوٹل ہے اور یہاں صرف اعلیٰ قسم کے تعلیم یافتہ اور امیر لوگ ہی کھانا کھانے آتے ہیں۔

"یہ ہوٹل گرمیوں میں ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم رہتا ہے۔ دیکھو ان کے چمچے اور پیالے کتنے اعلیٰ ہیں۔ یہ خاص طور پر لندن سے منگوائے گئے ہیں۔ مَیں تو شادی سے پہلے صرف اسی ہوٹل میں آ کر بیٹھا کرتا تھا۔ یہاں چائے کی ایک پیالی ایک روپے میں ملتی ہے ....."

لیکن نجمہ اب کچھ نہیں سُن رہی تھی کیونکہ اُس نے بھی سامنے والی میز پر یاقوت کو دیکھ لیا تھا۔ ایک اور برقع پوش لڑکی کے ساتھ، وہ پہلی بار یاقوت کو کسی غیر لڑکی کے ساتھ دیکھ رہی تھی اور یاقوت بھی نجمہ کو پہلی بار کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ اُداس ہو گئے تھے۔ نجمہ کے ساتھ بھی ایک فالتو مرد تھا جو اس کا خاوند تھا۔ یاقوت کے ساتھ بھی ایک فالتو لڑکی تھی جو اُس کی محبوبہ تھی۔ اگر نجمہ یاقوت سے نہ بچھڑتی تو اسے کلثوم سے محبت نہ ہوتی اگر نجمہ یاقوت کے ساتھ گھر سے بھاگ کر شادی کر لیتی تو آج اصغر ایڈووکیٹ اُس کے ساتھ نہ ہوتا۔ پھر وہاں نہ کلثوم ہوتی اور نہ

اصغر — بلکہ صرف نجمہ اور یاقوت ہوتے۔ میاں اور بیوی ہوتے۔ دُلہا اور دُلہن ہوتے۔ لیکن اب سوائے ان دونوں کے وہاں سب کچھ تھا۔ صرف وہ نہیں تھے۔ باقی ہر شئے موجود تھی۔ وہ دونوں ہوٹل کی گیلری سے نکل کر اسلام پور کے ایک حویلی نما پرانے مکان کی نیم روشن سیڑھیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر کھڑے تھے اور یاقوت کہہ رہا تھا۔

"یہ تمہارے ساتھ کون ہے نجمہ؟"

اور نجمہ سر جُھکائے۔ آنکھیں جُھکائے خاموش کھڑی تھی اور اس کی بند پلکوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

"یہ کون ہے نجمہ؟ کیا تم اس کے پلنگ پر سوتی ہو نجمہ؟ نجمہ تمہیں ایک اجنبی آدمی کے پلنگ پر لیٹنے سے حجاب محسوس نہیں ہوتا؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے نجمہ؟ تم کہاں سے چلی تھیں اور کہاں آگئی ہو نجمہ! بولو نجمہ! نسواری آنکھوں، سنہری بالوں اور کالے تل والی نجمہ!!......"

نجمہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ خاموش تھی۔ اور پھر یاقوت نے سر جھکا رکھا تھا اور نجمہ اُس سے کہہ رہی تھی۔

"تم نے اتنی جلدی مجھے فراموش کر دیا یاقوت کہ میرا بیاہ ہوتے ہی دوسری لڑکی کو ساتھ لے کر گھومنے لگے؟ کیا تم میری شادی کا انتظار کر رہے تھے؟ میں تو خیر ماں باپ کی عزتوں میں جکڑی ہوئی بے زبان گائے کی طرح ڈولی میں بیٹھ گئی لیکن تمہیں تو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ تم تو کہا کرتے تھے نجمہ میں تمہارے سوا اور کسی کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں اور ساری زندگی محبت کرتا رہوں گا۔ پھر تم اتنی جلدی ایک اور لڑکی سے محبت کیسے کرنے لگے یاقوت! بتاؤ یہ کالے برقعے والی لڑکی جس کی پیٹھ میری طرف ہے اور جس کے گورے گال کا مجھے ایک حصہ ہی دکھائی دے رہا ہے کون ہے؟

کیا تم واقعی اس لڑکی سے محبت کرتے ہو؟ کیا تم اسے بھی کسی مکان کی سیڑھیوں میں کہا کرتے ہو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں؟ جس طرح تم مجھ سے پیار کیا کرتے تھے۔ میرے ہونٹ چُوما کرتے تھے کیا اس کے ہونٹ بھی اُسی طرح، اسی محبت اور اسی دیوانگی سے چُومتے ہو؟ نہیں نہیں یاقوت! تم ایسا نہیں کر سکتے! تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیئے! اگر میں تمہیں اکیلا یہاں اُداس اور پریشان بیٹھا دیکھتی تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا جتنا اُس لڑکی کے ساتھ خوش و خرم بیٹھا دیکھ کر ہوا ہے۔ کاش! میں اپنے خاوند کے ساتھ یہاں کھانا کھانے نہ آتی...... کاش! آج میں اپنے گھر ہی سے باہر نہ نکلتی! کاش میں تم سے کبھی محبت نہ کرتی......"

نجمہ کے ہونٹوں پر مُہر لگی تھی۔ یاقوت بُت بنا ہوا تھا۔ لیکن دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے سے ایسی قسم کے سوالات پوچھ رہی تھیں۔ نجمہ کہہ رہی تھی۔ یہ میرا خاوند ہے۔ میرے ماں باپ نے مجھے اس کے پلّے باندھ دیا ہے۔ اب ساری زندگی اسی کے ساتھ رہنا ہے۔ جب تک اسے موت نہیں آتی باقی عمر اسی کے ساتھ بسر کرنی ہے۔ میں مجبور ہوں۔ اسلام پور قصبے کی شریف اور ماں باپ کی عزت پر اپنی محبت، اپنی آن اور اپنی زندگی تک قربان کر دینے والی لڑکی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ نہ بیاہی جا سکی۔ اس کا مجھے قلق ہے لیکن میں زندگی بھر صرف تم سے ہی پیار کرتی رہوں گی۔ دنیا تمہیں مجھ سے چھین سکتی ہے لیکن میں زندگی بھر صرف تم سے ہی پیار کرتی رہوں گی۔ دنیا تمہیں مجھ سے چھین سکتی ہے لیکن تمہارا پیار میرے دل سے نہیں نکال سکتی۔ وہ پھول کو ڈالی سے توڑ سکتی ہے مگر اس کی کلیوں سے اُس کی مسکراہٹ نہیں چھین سکتی۔

اور یاقوت کہہ رہا تھا۔ نجمہ! ایسی بات نہیں ہے۔ یہ محبت کر کے بھول جانے کی بات نہیں ہے۔ یہ زاویۂ نگاہ کا فرق ہے۔ جس طرح مرد عورت کے دل کی گہرائیوں کو ماپ نہیں سکتا اُسی طرح عورت بھی مرد کی نفسیات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ عورت صرف محبت کرتی ہے اور مرد بہت کچھ کرتا ہے۔ اُسے بہت کچھ کرنا ہوتا ہے۔ مجھے تم

سے بھی محبت ہے اور کلثوم سے بھی محبت ہے۔ ہاں! اس کا نام کلثوم ہے۔ یہ بڑی پُر اسرار لڑکی ہے۔ اس کے ہاتھ تمہارے دل سے بھی زیادہ نازک ہیں اور اس کی آنکھیں میرے دل سے بھی زیادہ گہری ہیں میں اس لڑکی سے پیار کرتا ہوں۔ جس طرح تمہیں پیار کرتا ہوں۔ میں نے اس کے ہونٹ کئی بار چُومے ہیں جس طرح کبھی تمہارے چُوما کرتا تھا۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ بڑا عجیب فلسفہ ہے۔ یہ کہانی میں تمہیں پوری طرح سنا بھی نہیں سکتا اور تم سُن بھی نہیں سکتیں۔ یہ عجیب فلسفہ میں تمہیں سمجھا بھی نہیں سکتا اور تم سمجھ بھی نہیں سکتیں۔

باتیں کرتے کرتے اچانک نجمہ کے خاوند ایڈووکیٹ محمد اصغر بھٹی کو محسوس ہوا کہ اس کی دلہن بیوی اس کی باتیں نہیں سن رہی بلکہ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔ اس کی طرف نہیں بلکہ اس کے کندھوں کے اوپر سے پیچھے کسی کی جانب دیکھ رہی ہے۔

"ادھر کیا دیکھ رہی ہو نجمہ؟"

نجمہ چونک پڑی۔

"جی نہیں۔ کچھ نہیں دیکھ رہی ——— وہ پیچھے ایک لڑکی بیٹھی ہے اس کے کانوں کے جھمکے دیکھ رہی تھی۔

بڑا خوبصورت ڈیزائن ہے۔"

عورت ہر مرحلے پر جھوٹ بول سکتی ہے۔ نازک سے نازک مقام پر محفوظ نا سکتی ہے۔ مرد ایسا نہیں کر سکتا۔

"ڈیزائن یاد رکھنا۔ میں کل ہی تمہیں اس قسم کے جھمکے منگوا دوں گا ——— ہاں تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ عدالت نے میرے پیش کردہ گواہ کو رد کر دیا۔ کیس کمزور ہو گیا۔ میں پریشان ہو گیا۔ آخر ایک نقطہ اچانک مجھے سُوجھ گیا۔ جس کاغذ پر جائیداد کا وصیت نامہ لکھا گیا تھا وہ کاغذ لندن کا بنا ہوا تھا اور جائیداد کوٹ رادھو رام میں تھی اور اس پر تاریخ ...."

اصغر اپنی بیوی کے آگے اپنی قانونی لیاقت کے تعریفی پُل باندھ رہا تھا اور سادہ لوح نجمہ

کو ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور اب جبکہ اُس نے یاقوت کو ایک لڑکی کے ساتھ اپنے سامنے دیکھ لیا تھا تو اُس پر خود فراموشی کا ایک عجیب عالم طاری تھا۔

کلثوم نے بھی یاقوت کو یک لخت خاموش ہوتے محسوس کر لیا تھا۔ اُس نے سوچا شاید وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ مگر جب خاموشی زیادہ لمبی ہو گئی اور یاقوت کی آنکھیں کسی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہیں تو کلثوم نے ایک بار پھر پوچھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں! کچھ نہیں! ...."

یاقوت نے چونک کر جواب دیا اور سگریٹ سلگا لیا۔

"کوئی بات ضرور ہے۔ آپ پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد خود فراموشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ مجھ سے کوئی بات نہ چھپائیے۔ مجھے ضرور بتا دیجئے کہ آپ کے دل میں کیا ہے؟"

تجربات نے یاقوت پر ایک بات سورج کی طرح واضح کر دی تھی کہ عورت کو اپنے دل کی بات کبھی نہ بتاؤ۔ اور ایسی عورت پر تو اپنے دل کا راز کبھی نہ کھولو جس سے تم محبت کرتے ہو۔ اور پھر وہاں کلثوم کو بتانے والی بات بھی کوئی نہ تھی۔ یاقوت نے ادھر اُدھر کی دو ایک باتوں میں کلثوم کو ٹال دیا اور محض اُس کی تسلی کے لئے اُس سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ دوسری جانب جب نجمہ نے یاقوت کو اُس لڑکی سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا دیکھا تو وہ اپنا دل تھام کر رہ گئی۔ اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے اور حلق کڑوا ہو گیا۔ وہ سمجھی کہ یاقوت اُسے جلانے کے لئے ایسا کر رہا ہے۔ اُسے یاقوت پر بڑا غصہ آیا۔ انتقامی طور پر اُس نے بھی اپنے خاوند سے ہنس ہنس کر باتیں کرنی شروع کر دیں وہ ایک دم بڑی زندہ دل اور شگفتہ ہو گئی اور اس کی بات بات سے شوخی اور مسکراہٹ ٹپکنے لگی۔ وہ اپنے ایڈووکیٹ خاوند کے گھٹیا سے گھٹیا لطیفے پر بھی دل کھول کر ہنسنے لگی۔ اُس کا خاوند پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اُس وقت وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے زیادہ ہنسانے والا لطیفہ باز آدمی خیال کر رہا تھا۔ یاقوت سمجھ گیا کہ

نجمہ محض اُسے جلانے کے لیے ایسا کر رہی ہے کیونکہ وہ کلثوم سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا ہے یاقوت کو نجمہ کی کھوکھلی مسکراہٹوں اور اُس کے خاوند کے جھوٹے بھرم پر بڑا ترس آیا۔

جب سے نجمہ اپنے خاوند کے ساتھ گیلری میں آئی تھی وہاں کی فضا میں ایک نمایاں تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ یوکلپٹس، کافی، تھری کیسل اور گارڈینیا کے سینٹ کی مہک کے ساتھ حنا کے عطر کی خوشبو بھی گھُل مِل گئی تھی۔ وہی عطر جو یاقوت اپنے خطوں میں بسا کر نجمہ کو بھیجا کرتا تھا۔ یاقوت کو اپنے خط یاد آ گئے۔ اور وہ اداس ہو گیا۔ نجمہ نے بھی فضا میں اپنے کپڑوں میں لگے ہوئے حنا کے عطر کے علاوہ ایک اور عطر کی خوشبو محسوس کی۔ بڑی پُر اسرار اور گہری خوشبو تھی۔ یقیناً یہ نیا عطر یاقوت کے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی نے لگا رکھا ہے نجمہ ایک بار پھر اُداس ہو گئی۔ اس کی مصنوعی مسکراہٹ بھاپ بن کر اُڑ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اُداس اور غمگین دیکھا تو دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے پھر محبت اور ہمدردی پیدا ہو گئی۔ وہ ایک دوسرے کو تھوڑی دیر بعد حسرت و یاس کے ساتھ تکنے لگے۔ اب یاقوت نے دیکھا کہ نجمہ پہلے سے زیادہ ہی سندر اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ اُس کی نسواری آنکھوں میں کاجل لگا تھا۔ اور ماتھے پر سونے کا جھومر چاند بن کر چمک رہا تھا اور کانوں میں جھمکے جھلملا رہے تھے اور ہونٹوں پر سُرخی دمک رہی تھی۔ نجمہ نے دیکھا کہ یاقوت پہلے سے کچھ دبلا پتلا ہو گیا ہے چہرہ کچھ پیلا پڑ گیا ہے اور آنکھیں اُداس اُداس رہنے لگی ہیں۔ کیا یہ سب اُس کے غم میں ہوا ہے؟ نجمہ نے اس بات کے جواب میں کچھ فخر سا محسوس کیا اور پھر وہ دل ہی دل میں یاقوت کی بلائیں لینے لگی۔ پھر اچانک اُسے دُوسری لڑکی کا خیال آ گیا۔ آخر یہ برقع پوش لڑکی کون ہے؟ یاقوت کی کوئی بہن اور رشتہ دار عورت لاہور میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ اجنبی لڑکی ہے۔ اور یاقوت اُس میں دلچسپی لیتا ہو گا۔ نجمہ کے ہونٹ ایک بار پھر سکڑ گئے اور زبان کا ذائقہ تلخ ہو گیا وہ کھانا کھا چکے تھے۔ اُس کا خاوند کافی کا آرڈر دینے لگا تو نجمہ نے کہا۔

"پھر پی لیں گے۔ میرا یہاں دم گھٹنے لگا ہے۔ اب گھر چلیں۔"

"اچھا۔ پھر پی لیں گے۔ تمہیں ان بند ہوٹلوں میں بیٹھنے کی عادت نہیں ہے نا اس لیے تمہیں گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔ مگر یہ تو ایئر کنڈیشنڈ ہوٹل ہے۔ چلو پھر سہی پھر سہی۔ بیرا! بل لاؤ۔"

یاقوت نے اپنے سر کا بوجھ ہلکا ہوتا محسوس کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ نجمہ جتنی جلدی ہو سکے اپنے خاوند کو ساتھ لے کر وہاں سے چلی جائے۔ وہ اُسے اپنے خاوند کے ساتھ اب زیادہ دیر تک باتیں کرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نجمہ کی باتوں سے اُسے وہ باتیں یاد آ رہی تھیں جو وہ اُس کے سینے پر سر رکھ کر کیا کرتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بیرا بل لے آیا۔ نجمہ کے خاوند نے بل ادا کیا اور نجمہ کو ساتھ لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ نجمہ برقعہ درست کرتے ہوئے سیڑھیاں اُترنے لگی۔ اُس نے آخری بار کنکھیوں سے یاقوت کو دیکھا اور اپنے خاوند کے ساتھ نیچے اُتر گئی۔ یاقوت نے سکھ کا گہرا سانس لیا۔ تھری کیسل کا تازہ سگریٹ سلگایا اور کلثوم سے خدا جانے کس موضوع پر باتیں کرتے ہوئے پردے کی جالیوں میں سے نیچے نجمہ کو اپنے خاوند کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکلتے دیکھنے لگا۔ جب نجمہ ہوٹل سے باہر نکل گئی تو یاقوت نے سوچا یہ خاوند اُلو ہوتے ہیں جو دوسروں کی بیویوں کو ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں اور یہ لڑکیاں کس قدر عجیب ہوتی ہیں جو ایک پل میں سب کچھ بھول بھال کر دوسروں کے ساتھ چل پڑتی ہیں۔

"نیچے کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟"

یاقوت نے جلدی سے نظریں جالی دار پردوں سے ہٹا لیں۔

"کچھ نہیں ____ یونہی لوگوں کو آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔ ہوٹل کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے۔ یہاں لوگوں کا ہر گھڑی تانتا بندھا رہتا ہے ایک آتا ہے۔ دوسرا نکل جاتا ہے۔"

یاقوت کچھ اوٹ پٹانگ سی باتیں کرنے لگا۔ اُس کے ذہن پر ابھی تک نجمہ کی شخصیت کا زبردست اثر تھا۔ وہ اچانک جو اپنے خاوند کے ساتھ اُس کے سامنے آ گئی تھی یاقوت نے جلدی سے اپنے جذبات پر قابو پایا اور بڑی محبت سے کلثوم کی گہری گھنی

پلکوں والی شفاف آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی کلثوم؟"

کلثوم نے ایک دو بار پلکیں جھپکا کر آنکھیں نیچی کر لیں اور کہا۔

"مجھے یوں لگا تھا جیسے ..... جیسے آپ اُس لڑکی کو دیکھ رہے ہیں!"

"کس لڑکی کو کلثوم؟"

"وہ جو ابھی ابھی یہاں سے اُٹھ کر گئی ہے۔"

جیسے یاقوت کے دل کو کسی نے اپنی مٹھی میں لے لیا۔ اُس نے مُسکرا کر کہا۔

"کلثوم! جہاں تک لڑکیوں کو دیکھنے کا تعلق ہے میں صرف اتنا کہوں گا کہ اب ہر لڑکی پر مجھے تمہارا گمان ہوتا ہے اور اگر تم اس ہوٹل کی بجائے اِس وقت میرے کمرے میں ہوتیں تو میں یہی بات تمہیں اپنے سینے سے لگا کر کہتا اور مجھے یقین ہے کہ زبان کے ساتھ ساتھ میرے دل کی گرمی اور سچائی بھی تمہیں اس کا یقین دلا دیتی۔"

یاقوت کی اِس قسم کی غیر معمولی باتوں سے کلثوم پر عجیب اثر ہُوا کرتا تھا۔ وہ ایک ہی پَل میں سب کچھ بھول بھلا کر اُس کی دل وجان سے گرویدہ ہو جاتی تھی۔ وہ تو سچ مچ اُس چھوٹی چھوٹی مونچھوں، ذہین آنکھوں، پکنے ہوئے بالوں اور چوڑے شانوں اور سنجیدہ پیشانی والے آدمی سے محبت کرنے لگی تھی۔ اُس نے کلثوم کا اُس نازک وقت میں ہاتھ تھاما تھا جب ہر کوئی اُسے چھوڑ کر چل دیا تھا۔ جب اُس کی زندگی کے ساتھ ساتھ اُس کے ماں باپ اور خاندان کی عزت بھی ذلت کے غار میں لڑھکتی جا رہی تھی۔ وہ کلثوم کا ہاتھ تھام کر اُسے اپنے ساتھ لگا کر آندھیوں کے طوفان میں اس کے لیے چٹان بن کر کھڑا ہو گیا تھا اور اُس نے ہر بادِ مخالف کا مقابلہ کیا تھا۔ پھر کلثوم کو اُس سے پیار کیوں نہ ہوتا۔ مگر کلثوم نے اپنی طرف سے کبھی زیادہ جوش وخروش کا اظہار نہ کیا تھا۔ کیونکہ ابھی اُسے پوری طرح سے یقین نہیں تھا کہ اُس کے گھر والے یاقوت سے اُس کی شادی کر دیں گے یا نہیں! اس ترازو میں نجمہ اور کلثوم دونوں برابر تھیں۔ جس طبقے سے یہ دونوں

لڑکیاں تعلق رکھتی تھیں وہاں عموماً یہ ہوتا ہے کہ یا تو لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ گھر سے بھاگ جاتی ہے یا نجمہ کی طرح ماں باپ کی مرضی کے مطابق شادی کر دی جاتی ہے اور جہیز میں اپنے عاشق کی یاد بھی خاوند کے گھر لے جاتی ہے۔ کچھ عرصے تک یہ رومانٹک سی یاد اُس کے سینے سے لگی رہتی ہے اور جب اس کی جگہ سینے سے ایک بچہ لگ جاتا ہے تو وہ سب کچھ بھول بھلا کر تن من سے اپنے بچوّں کی پرورش اپنے خاوند کی خدمت اور اپنے گھر کی دیکھ بھال میں محو ہو جاتی ہے۔ اُس وقت اگر پُرانا عاشق اُس کی زندگی میں دوبارا داخل ہونے کی کوشش کرے تو وہ اُسے ہرگز ہرگز ایسا کرنے نہیں دیتی۔ پھر وہ اُسے محض ایک بھولے بسرے دلچسپ خواب کی مانند یاد رکھتی ہے جو کچھ کچھ یاد رہا ہو اور بہت سا بھُول گیا ہو ایسی لڑکیاں اپنی محبت کے شدید جذبات، پیار کی کُھلی باتیں، جسم کی گہری لذتوں کی اُمنگیں اور شعلوں کی طرح بھڑکتی آرزوئیں شادی کے دن کے لیے بچا بچا کر رکھتی ہیں۔ اُن بچوّں کی طرح جو عید کے میلے کے لیے اپنی گُلّچی میں پیسے جوڑ جوڑ کر رکھتے ہیں۔ جب کبھی کوئی شخص ان لڑکیوں سے گُلّچی توڑ کر بچا بچا کر رکھا ہُوا مال زبردستی چھین کر لے جائے تو یہ اُسے کبھی معاف نہیں کرتیں اور انہیں اُس نقصان کا صدمہ کبھی نہیں بھُولتا۔ کلثوم بھی انہی لڑکیوں میں سے تھی۔ وہ بھی یاقوت سے شادی کر کے اپنے محبت بھرے جذبات کا بند توڑنا چاہتی تھی۔ پہلے گویا اُس کی زبان پر تالا پڑا تھا۔ اگرچہ اُس کا بھی تھوڑا بہت مال لُوٹ لیا گیا تھا۔ شہاب کی مکاری اور چالاکی کی وجہ سے۔ کلثوم کی نادانی اور ناسمجھی کی وجہ سے۔ اندھے جذبات کی رَو میں بہہ نکلنے کی وجہ سے ـــــ مگر کلثوم کو اس نقصانِ عظیم کی ایک ایک تفصیل یاد تھی اور اس نے اپنے لوٹنے والے کو ایک پل کے لیے بھی معاف نہیں کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ شہاب نے عمر بھر کے لیے اُسے داغ دار کر دیا ہے۔ اُس سے وہ شے چھین کر ضائع کر دی ہے جسے وہ دوبارا حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے یاقوت مل گیا۔ جس نے نہ صرف اُسے ڈوبتے میں سہارا دیا بلکہ اُسے احساس تک نہ ہونے دیا کہ وہ ایک خالی کھوکھلی سیپ ہے جس میں سے

موتی غائب ہو چکا ہے اور اب اُس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یاقوت نے اپنی محبت کے سارے پھول کلثوم کی جھولی میں ڈال دیئے اور اس کی پوجا کرنے لگا۔ کلثوم یہ ساری باتیں جانتی تھی۔ مگر اُس کے دل میں خوف کا ایک احساس ہر وقت رہتا تھا۔ اُسے ڈر لگا رہتا تھا اگر اُس کے ماں باپ نے کسی وجہ سے یاقوت کے ساتھ اُس کی شادی کرنے سے انکار کر دیا اور اُسے کسی دوسری جگہ بیاہ دیا تو اُس کی زندگی کا کیا ہوگا؟ وہ حجلۂ عروسی میں اپنے خاوند کے پاس کیا منہ لے کر جائے گی؟ کیا وہ یہ جان کر کہ اُس کی دلہن کا گوہر عصمت لُٹ چکا ہے اُسے قبول کرے گا؟ کیا جوہری موتی کے بدلے خالی سیپ خریدنا گوارا کرے گا اسی خوف کے احساس کے ساتھ وہ کبھی کبھی یاقوت کی محبت بھری ہم آغوشیوں کے بعد بھی غمگین ہو جاتی اور اُس کا محدود ذہن عجیب عجیب قسم کی ڈرا دینے والی سوچوں میں بٹنے لگتا۔ اس وقت بھی ہوٹل کی گیلری میں بیٹھے بیٹھے جب یاقوت نے اپنی گرم گرم نگاہوں اور مسکراتے ہونٹوں سے اُس کی طرف دیکھ کر بھرپور محبت کا اظہار کیا تھا تو وہ اُداس ہو گئی تھی۔ یاقوت نے اس کی اُداسی کو دیکھ کر پوچھا۔

"کیا اب بھی تمہیں میری محبت کا یقین نہیں آیا کلثوم؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں کسی اور سے بھی محبت کر سکتا ہوں؟ شاید میں ایسا کر سکتا کلثوم! لیکن جب تک تم میرے ساتھ ہو۔ جب تک تمہاری محبت میرے ساتھ ہے میں ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ کبھی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ تمہیں دلہن بنا کر اپنے گھر لاؤں گا۔ کیونکہ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر تم سدا میرے پاس رہ سکتی ہو۔"

کلثوم نے شادی کے نام پر شرما کر نظریں جھکا لیں۔ اُسے یقین تھا کہ یاقوت سچ کہہ رہا ہے۔ وہ اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن کیا کلثوم کے گھر والے راضی ہو جائیں گے؟ اُس کے بھائی، برادری کے باہر کا رشتہ قبول کر لیں گے؟ اس خیال سے اُس کا دل سوگوار ہو گیا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ اگر اُس کے گھر والوں نے رشتہ قبول کر لیا۔ اگر

کہ یاقوت سے شادی ہو گئی تو کیا شادی کے بعد زندگی کے کسی مرحلے کسی مقام پر جا کر وہ اُسے بے عصمت ہونے کا طعنہ تو نہیں دے گا؟ وہ یاقوت کو بہت زیادہ نہیں جانتی تھی اور اگر جانتی بھی ہوتی۔ ان کی محبت کو چند مہینوں کی بجائے کئی سال بھی گزر گئے ہوتے تو اس کا یہ خدشہ اپنی جگہ پر درست تھا۔ اُس نے اپنے رشتہ داروں میں گلی محلوں میں میاں بیوی کی لڑائیاں ہوتے دیکھی تھیں۔ اُن کے طعنے مہنے سنے تھے۔ وہ اُس وقت سے بے حد ڈر رہی تھی جب یاقوت کے دل میں یہ احساس جنم لے لے کہ اُس کی بیوی شادی کے سے کنواری نہیں تھی اور اس نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کر رکھی ہے جو شادی سے پہلے ایک بچہ ضائع کروا چکی ہے۔ کلثوم تو اس کے دعوے کو جھٹلا بھی نہ سکے گی۔ کیونکہ یاقوت تو اس کے ضائع شدہ بچے کا چشم دید گواہ تھا۔

"تم اُداس کیوں ہو گئیں کلثوم؟ کیا تم مجھ سے بیاہ نہیں کرنا چاہتیں؟ کیا تم میرے علاوہ ——— میرا مطلب ہے ——— تم کسی اور سے پیار کرتی ہو؟"

کلثوم نے ایک سسکی سی بھر کر ایک دم پلکیں اٹھائیں اور یاقوت کو بڑے پیار سے درد اور بڑی اداسی کے ساتھ دیکھا۔

"ایسا تو نہ کہیے۔ مجھے اس طرح کا الزام تو نہ دیجئے۔"

یاقوت نے جلدی سے کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں کلثوم! معافی چاہتا ہوں۔"

کلثوم کے بالوں میں لگے سویٹ پیز کے دونوں پھولوں کی نازک پنکھڑیاں مرجھا کر اس کے بالوں کے ساتھ لگ کر جیسے سو گئی تھیں۔ اُس کے لباس سے اٹھنے والی گارڈینیا سینٹ کی مہک بھی یاقوت کو اب کم محسوس ہو رہی تھی۔ یاقوت نے نیا سگریٹ سلگایا پیالی میں پڑی ٹھنڈی کافی کا ایک گھونٹ پی کر بولا۔

"لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ تمہارے دل میں کسی بات کا غم ہے جسے تم مجھ پر ظاہر نہیں کر رہی ہو جو تمہارے چہرے اور آنکھوں میں صاف

عیاں ہے۔"

کلثوم ایک لمحہ خاموش رہی۔ کچھ سوچتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

"مجھے صرف ایک بات کا ڈر ہے۔ ایک شے کا وہم ہے۔"

"کس بات کا؛ بتاؤ نا!"

"شادی کے بعد کہیں آپ یہ تو نہیں سوچنے لگیں گے کہ آپ نے ایک غلط لڑکی سے بیاہ کر لیا ہے؟"

یاقوت نے میز پر ہاتھ پھیلا کر کلثوم کا نازک ہاتھ پکڑ کر دبایا اور بڑے اعتماد سے

"جو لوگ ایسا کرتے ہیں میں انہیں مرد نہیں سمجھتا۔ ایک مرد جب کسی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے طوفان سے نکالتا ہے تو کنارے پر آ کر کبھی نہیں کہتا کہ اس لڑکی کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ کبھی اس کی کمزوری کا مذاق نہیں اڑاتا اس کی کسی خامی کا اسے طعنہ نہیں دیتا۔ اور پھر تم سے جو کچھ بھی ہوا تمہاری نادانی اور ناسمجھی میں ہوا۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ اگر تمہیں کسی نے بتا دیا ہوتا کہ اس ذرا سی غلطی کے بعد تمہیں کتنا بڑا خمیازہ بھگتنا پڑے گا تو میرا خیال ہے کہ تم چھت سے کود کر خودکشی کر لیتیں مگر وہ غلطی نہ کرتیں۔ اس لیے آیندہ میرے سامنے ایسی بات کبھی نہ کرنا۔ اور نہ کبھی اس قسم کی فضول باتوں پر غمگین ہو کر اپنے دماغ کو پریشان کرنا۔ کیا اب بھی تمہارا وہم دور نہیں ہوا؟"

کلثوم کو یوں محسوس ہوا جیسے بادل چھٹ گئے ہوں اور گہرے نیلے آسمان پر سورج چمکنے لگا ہو اور سفید سفید بے داغ، بے فکر، شاداں و فرحاں خیالات کے کبوتر دھوپ میں چکر لگا رہے ہوں۔ اس کے بالوں کے سویٹ پیز پھولوں میں جان سی پڑ گئی۔ ان کی مرجھائی ہوئی پنکھڑیاں دوبارا جی اٹھیں اور اس کے سپید لباس میں سے ایک بار پھر گارڈینیا کے سینٹ کی مہک اڑنا شروع ہو گئی۔ اس کا چہرا

ل گیا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ یاقوت نے خوش ہو کر کہا۔

"بس اسی طرح سدا مسکراتی رہا کرو۔ تم ہری بھری ٹہنی پر لگا اک پھول ہو تمہیں ہمیشہ کھلا رہنا چاہیئے۔ مسکراتے اور خوشبو لٹاتے رہنا چاہیے۔ تمہیں غمگین یا اداس ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

کلثوم کا اس وقت جی چاہا کہ وہ یاقوت کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کے سینے پر سر رکھ کر خوب روئے۔ خوشی کے آنسو روئے۔ اچانک اس نے گھڑی دیکھی نے دو ہو رہے تھے۔

"ہائے ہائے۔ بڑی دیر ہو گئی۔ مجھے اب کالج جانا ہے۔"

"کچھ دیر اور رک جاؤ کلثوم! ایک پیالی کافی اور پی لو۔"

"نہیں اب مجبور نہ کریں۔ سچ میرا جانا بڑا ضروری ہے۔ اگر نہ گئی تو خواہ مخواہ کی بدنامی ہوگی۔ گھر والے پہلے ہی میرے بارے میں بڑی سن گن رکھ رہے ہیں۔"

"انہیں کیسے معلوم ہوگا کہ تم یہاں بیٹھی ہو؟"

کلثوم نے اپنا نازک ہاتھ اپنے پھول ایسے ہونٹوں پر رکھ کر کہا۔

"خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ یاقوت نے ٹیکسی منگوانی تو کلثوم نے کہا۔

"میں چوک میں جا کر خود ہی لے لوں گی۔ آپ یہاں سے الگ ہو جائیں۔ جانے کیوں آج مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔"

"تم تو خواہ مخواہ ڈر رہی ہو۔ چلو میں بھی چوک تک تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"ہائے نہیں آپ چلے ہی جائیں۔"

"ایسی بھی کیا بات ہے۔ اچھا یہ بتاؤ اب کب ملو گی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔ خط لکھ بھیجوں گی۔"

کلثوم کا دل کسی انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا۔ وہ یاقوت کے ساتھ بادل ناخواستہ ریگل والے چوک کی طرف چل پڑی۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ اچانک کلثوم کا دل اچھل کر اس کے حلق میں آگیا۔ ٹانگیں ایک دم برف ہو گئیں اور پاؤں من من وزنی ہو گئے۔ سامنے سے اس کا بڑا بھائی ہاتھ میں چمڑے کا تھیلا اٹھائے چلا آرہا تھا۔

"ہائے میں مرگئی۔ بھائی جان آ رہے ہیں۔"

کلثوم کی آواز مردہ ہو رہی تھی۔

"کہاں؟ کہاں آرہے ہیں؟"

"ہائے خدا کے لیے الگ ہو جائیں۔ خدا کے لیے چلے جائیں۔ میں مر جاؤں گی۔"

لیکن اس اثنا میں اس کا بڑا بھائی بالکل نزدیک آگیا تھا۔ اس نے کلثوم کے قد سے گزرتے ہوئے سر سے لے کر پاؤں تک اپنی بہن کو دیکھا اور انتہائی خاموشی کے ساتھ آگے نکل گیا۔ کلثوم کے جسم کا خون خشک ہو گیا تھا۔ اس کی زبان سوکھ کر کانٹا ہو گئی

"ہائے اب کیا ہوگا؟ انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔"

"میرا خیال ہے انہوں نے تمہیں نہیں پہچانا۔ وگرنہ وہ ضرور بلا لیتے۔"

"ہائے آپ نہیں جانتے۔ اب خدا جانے میرا کیا حشر ہوگا۔ خدا کے لیے اب تو آپ الگ ہو جائیں۔ میرے اللہ! میں کیا کروں۔"

"حوصلہ رکھو کلثوم! میں ہر حال میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"خدا کے لیے اس وقت فوراً مجھ سے الگ ہو جائیں۔ میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔"

یاقوت جلدی سے الگ ہو کر فٹ پاتھ پر چڑھ گیا اور بس سٹاپ پر کھڑا ہو کر کو اکھڑی اکھڑی سے بے ربط چال کے ساتھ چوک کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔ چوک پ

کلثوم نے ایک خالی تانگہ دیکھا۔ اس میں جلدی سے سوار ہو گئی اور کوچوان سے کہا۔

"........ کالج ــــ جلدی۔"

"اچھا بی بی جی۔"

اور تانگہ کالج کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھوڑا اپنی روایتی لاہوری چال کے ساتھ چل رہا تھا اور کلثوم اڑ کر اپنے کالج پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اسے ایک خوش فہمی یہ بھی تھی کہ شاید بھائی جان نے اسے نہ پہچانا ہو۔

"بابا! تانگہ تیز چلاؤ۔"

"اچھا بی بی جی۔"

کوچوان نے گھوڑے کو ہلکا سا چابک رسید کیا۔ گھوڑا تھوڑا سا اچھلا۔ دو قدم تیز چلا اور پھر وہی پرانی روایتی چال چلنے لگا۔ کلثوم کا جی چاہا کہ وہ چابک اپنے ہاتھ یں لے کر گھوڑے کو اتنا مارے کہ وہ گولی کی طرح بھاگتا اس کے کالج پہنچ جائے۔ لیکن نہ ہ چابک اپنے ہاتھ میں لے سکی اور نہ گھوڑے کی چال میں فرق آیا۔ خدا خدا کر کے اس کا لج آیا۔ اس نے کوچوان کو اٹھنی پرس میں سے نکال کر دی اور ابھی تانگے میں سے اتر رہی ھی کہ ایک ٹیکسی چپکے سے اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اندر سے اس کے بھائی جان روازہ کھول کر باہر نکلے اور بولے۔

"آؤ کلثوم گھر چلیں۔ کالج جانے کی اب ضرورت نہیں۔"

کلثوم پر گویا بجلی سی گر پڑی۔ وہ ایک پل کے لیے بے جان لاش کی طرح وہیں ی رہی۔ پھر آہستہ سے ٹیکسی میں اپنے بھائی جان کے ساتھ سوار ہو گئی اور ٹیکسی ان کے ر کی طرف چل پڑی۔ کلثوم نے اس قدر پچھتاوے، ملال، ذہنی پریشانی اور خوف کے تھ ٹیکسی کا سفر کبھی نہیں کیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سیاہ برقعے میں لپٹی ہوئی ک لاش ہے اور اس کا بھائی اسے دفنانے قبرستان لیے جا رہا ہے۔ اس کے بھائی جان نے سارا راستہ کوئی بات نہ کی۔ خوف سے کلثوم کی زبان خشک ہو کر کھڑی ہو گئی تھی اور ا کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ایک بار تو اسے یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہو گئی

ہے اور سڑک کی دونوں جانب کی دکانیں اور فٹ پاتھ کے لوگ خواب میں پیچھے کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ ٹیکسی اُن کی گلی کے باہر جا کر کھڑی ہو گئی۔ بھائی جان نے بل ادا کیا اور کلثوم کو ساتھ لے کر گلی میں سے گزر اپنے مکان میں آ گئے۔ وہ مکان جس کے دروازے میں کلثوم ہنسی خوشی بلبل کی طرح چہکتی ہوئی داخل ہوا کرتی تھی، جس کی دیواریں اُسے باہر کی پریشانیوں سے نجات دلایا کرتی تھیں اور جس کے ہر کمرے میں اُس پر اطمینان و سکون کی بارش ہوا کرتی تھی آج ایک ناگہانی بلا کی طرح منہ پھاڑے اس کی ہڈی ہڈی چبا جانے کو تیار کھڑے تھے۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ایک بار اس مکان میں داخل ہو گئی تو پھر زندہ و سلامت باہر نہ نکل سکے گی۔ وہ اندر داخل ہو گئی اور بھائی جان نے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ کالج، یاقوت، شہر، محبت، سویٹ پیز کے پھولوں اور گارڈینیا کی مہک اور سنہری دھوپ اور ہوٹل کی گیلری کی خوشبوؤں بھری پرسکون دُنیا کا دروازہ بند ہو گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اور سب کچھ باہر کا باہر رہ گیا۔ اُس کے محبوب کی پیار بھری باتیں، پُرجوش ہم آغوشیاں، دلگداز سرگوشیاں، گلاب کے پھول اور گلدان والی یوکلپٹس کی شاخیں ——— ہر چیز، ہر شے باہر گلی میں کھڑی کلثوم کے بند دروازے کا منہ تکتی رہ گئی۔

مکان میں آ کر کلثوم کے بھائی جان نے صرف اتنا کہا۔

"تم اپنے کمرے میں جاؤ۔"

اور خود اوپر چلے گئے۔ کلثوم اپنے کمرے میں آ کر پلنگ پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ آنکھوں کا سارا سُرمہ بہہ گیا۔ پلکیں ایک دوسری سے جڑ گئیں اور سویٹ پیز کے پھول بالوں میں دب کر ٹوٹ گئے اور اس کی پنکھڑیاں بکھر گئیں۔ کوئی پندرہ منٹ بعد اس کی بھاری بھرکم باوقار سفید بالوں والی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اُس نے اندر آ کر کلثوم کو بالوں سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور بولی۔

ی بسر کرنے جایا کرتا تھا۔ مال کی ایک غیر مسلم عمارت میں اس نے ایک پورے فلیٹ پر قبضہ جما رکھا تھا۔ جس کی سیڑھیاں اس بلڈنگ کی عقبی گلی میں تھیں۔ اس کے پاس مختلف قسم کی ٹھ دس لڑکیاں تھیں جن کی رہائش کے لیے خان نے کوئی فلیٹ وغیرہ نہ لے رکھا تھا۔ یہ ہ سارا دن ہوٹلوں، سینما گھروں اور شہر کے پارکوں اور باغوں میں اِدھر اُدھر گھومتی رہتی تھیں۔ ات کو جہاں خان کے آدمی لے جاتے، چلی جاتیں، صبح خان کے فلیٹ میں ایک ایک دو دو کر کے آتیں۔ اگلی رات بسر کرنے کے احکامات لے کر پھر سے شہر کے ہوٹلوں اور پارکوں میں آوارہ گردی رنے نکل جاتیں۔ ہر ماہ خان انھیں جیب خرچ کے لیے تھوڑی سی رقم دیتا تھا۔ اس کے علاوہ ھیں اجازت تھی کہ دن بھر جہاں جی چاہے جا کر کمائیں اور کھائیں۔ رات کو بتائی ہوئی جگہ پر شب باشی کے لیے ضرور پہنچ جائیں۔ اتنی آزادی کے باوجود ان میں سے کسی نے بھی کبھی بھاگنے ی کوشش نہ کی تھی۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ خان نے پستول تان کر انھیں بتا دیا تھا کہ اگر انھوں نے بھاگنے کی کوشش کی یا کسی کے ساتھ بھاگ گئیں تو وہ جہاں کہیں بھی ہوں گی ایک نہ ایک دن خان کے آدمی ان کی کھوپڑی گولی سے اڑا دیں گے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اس زندگی کی عادی ہو گئی تھیں اور اس آزاد اور بے فکر اور محفوظ زندگی سے کنارہ کش ہو کر گھر کی چار دیواری یں بند ہونا کبھی گوارا نہیں کر سکتی تھیں۔ باقی رہا کسی سے پیار ہو جانے کا سوال۔ تو یہ سوال ان کے لیے بے معنی اور بے وقعت تھا۔ وہ دن میں کئی کئی بار پیار کرتیں اور بھول جاتی تھیں۔ سینما میں ہیروئن کو اپنے محبوب کی یاد میں درد بھرے گیت گاتے دیکھ کر وہ سگریٹ پیتے ہوئے ہنسنے لگتیں اور ہال میں آگے بیٹھے ہوئے لوگوں میں کسی ایسے نوجوان کی تلاش کرنے لگتیں جسے سینما ختم ہونے کے بعد وہ اپنے ساتھ لے جا کر شام کے کھانے اور تھوڑی سی تفریح کا بندوبست کر سکیں۔ کبھی کبھی جب ان میں سے کوئی بیٹھے بیٹھے، ہنستے ہنستے، پیار کرتے کرتے یکبارگی اداس ہو جاتی تو وہ کسی ہوٹل کے خالی کیبن میں جا کر تھوڑا سا رو لیتی۔ اور منہ ہاتھ دھو، پاؤڈر سُرخی لگا، ایک بار پھر زندگی کی ہماہمی میں چھلانگ لگا دیتی۔ اس کے باوجود خان لُغرا خان نے ان کے پیچھے شہر بھر میں اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے جو اسے صورتِ حال سے باخبر رکھتے تھے۔

ریشم پیشہ ور لڑکیوں کے اس نئے گروہ میں شامل ہونے کے بعد اپنے آپ کو آزاد اور ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ رُلتے سیٹھ کے گندے اور تاریک اصطبل میں ٹمٹمانے والے دیے کی کرو روشنی میں اس نے بہت کچھ کھویا تھا اور بہت کچھ پایا تھا۔ ان تین سالوں میں اس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ اس دوران میں وہ گھٹیا سے گھٹیا ہوٹل میں سپلائی ہوئی تھی۔ وہ اچھے ہوٹلوں میں گئی تھی۔ جہاں ہر قسم کے لوگوں سے اسے واسطہ پڑا تھا، پہلے وہ سگریٹ کو منہ تک نہ لگاتی تھی لیکن اب بستر سے اٹھتے ہی پہلے سگریٹ سلگاتی اور پھر کوئی اور کام کرتی تھی۔ شراب جہاں وہ جاتی ضرور موجود ہوتی۔ شروع شروع میں اسے وہ بڑی کڑوی لگی مگر اب وہ چسکیاں بھر بھر کر بڑے مزے لے لے کر پیتی تھی اور بدمست ہونے کی حد تک پیتی تھی۔ زیادہ شراب پینے سے اس کی آنکھوں کے گرد بھورے بھورے حلقوں کے مستقل نشان سے بن گئے تھے۔ چہرے کا رنگ کچھ بھوسلا ہو گیا تھا اور بدن پہلے سے کچھ ڈھیلا، کچھ وبلا پڑ گیا تھا۔ خان بُغرا خان کے پاس آ کر وہ بڑھیا سے بڑھیا ہوٹلوں میں سپلائی ہونے لگی۔ اور اس نے اردو کے علاوہ انگریزی کے بھی بعض ضروری لفظ سیکھ لیے۔ اب وہ سینما کے بکس یا کسی ہوٹل کے کیبن یا کسی بار کی جھاڑیوں میں بیٹھی اپنے عاشق کے گلے میں باہیں ڈال کر بڑی آسانی سے "آئی لو یو" "ہنی ڈارلنگ" کہہ لیتی تھی۔ وہ بڑی بُری طرح میک اپ کرنے لگی تھی اور اس نے کئی دنوں کی شب و روز محنت کے بعد اپنے بالوں میں چھلے ڈال لیے تھے۔ جنھیں وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے بیٹھی سجایا کرتی تھی...... بڑھے ہوئے لمبوترے ناخنوں پر وہ بڑی احتیاط سے کبھی سُرخ اور کبھی پیازی یا ہلکے سُرخ رنگ کا پالش پھیرتی اور بعد میں کپڑے سے رگڑ رگڑ کر انھیں خوب چمکاتی۔

شروع شروع میں خان بُغرا خان کے گروہ میں آ کر ریشم نے اس آزادی کا ضرورت سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہا۔ چنانچہ وہ بڑے کھُلے بندوں مال، میکلوڈ اور لارنس میں گھوم پھر کر اپنی بڑھی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے لگی۔ وہ بڑی بے تکلفی سے اپنی کسی سہیلی کو جھوٹ موٹ بس میں سوار کروا کر کسی نہ کسی نوجوان کی طرف ذرا سا نقاب اٹھا کر معنی خیز نگاہوں سے دیکھتی اور پھر اسے دو تین سڑکوں کے چکر دے کر اپنے ساتھ ملا لیتی اور گھر سے باہر نکلنے کی من گھڑت کہانیاں

سنا کر اس کے ساتھ کسی نہ کسی ہوٹل میں بیٹھ کر جی بھر کے کھانا کھاتی، بیئر پیتی اور سگرٹوں پر سگرٹیں اڑاتی۔ جب اس کا نیا عاشق اس کی تمباکو اور شراب نوشی پر تعجب کا اظہار کرتا تو وہ ہنس کر کہتی۔

"ہمارے گھر میں تو سبھی پیتے ہیں۔ دراصل ڈیڈی انگلستان میں زیادہ رہے ہیں۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اوپر تلے دو بار پولیس کے قابو میں آ گئی، جہاں سے بغرا خان کے آدمی بڑی مشکل سے اسے چھڑا کر لائے۔ خان نے ایک دن اسے بڑی گالیاں دیں اور کہہ دیا کہ اگر اس نے پھر غفلت سے کام لیا تو وہ گولی سے اس کی کھوپڑی اڑا دے گا۔

ریشم کی یوں تو ساری لڑکیاں سہیلیاں تھیں مگر نسرین سے اس کا خاص دوستانہ تھا، نسرین بھی اس کو بہت چاہتی تھی اور عام طور پر وہ دونوں سڑکوں اور ہوٹلوں میں ایک ساتھ گھوما کرتیں نسرین، ریشم سے کوئی ایک دو سال بڑی ہو گی لیکن اس کے چہرے پر پختہ عمر کی طوائفوں ایسا عُریاں پن تھا۔ اس کے گالوں اور ماتھے پر مہاسوں کے داغ تھے، جنھیں وہ پاؤڈر کی موٹی تہ کے نیچے چھپائے رکھتی تھی۔ بھنویں موٹی تھیں جنھیں وہ ہر دوسرے تیسرے روز مونڈ کر بڑی صفائی سے باریک بنا دیتی اور یوں لگتا جیسے اس کی ناک کے اوپر چھوٹی سی چیل پر تول رہی ہو۔ وہ چار سال سے اس دھندے میں پڑی ہوئی تھی اور بڑی گرمجوشی سے اپنا کام کیے جا رہی تھی۔ ضلع جالندھر کے ایک قصبے میں اس کا باپ کسی سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ جہاں حملہ ہونے کے بعد اس کے گھر کے تمام افراد قتل کر دیے گئے۔ اور اسے ایک فوجی اغوا کر کے لدھیانے کے قریب ایک گاؤں میں لے گیا۔ وہاں وہ دو سال تک رہی۔

"وہ بڑے مصیبت کے دن تھے۔ میں تو ہر وقت مری مری سی رہا کرتی تھی۔ بھلا تم خود ہی سوچو بیک وقت نصف درجن مردوں کی بیوی بننا کوئی آسان کام ہے؛ مگر ان میں ایک سکھ بڑا اچھا تھا۔ وہ راتوں کو اٹھ کر میرے پاؤں دبایا کرتا اور مجھے چوری چھپے مکھن کھلایا کرتا تھا۔ اگر وہ زندہ ہے تو فوج میں بڑی ترقی کر گیا ہو گا۔ وہ زبان کا بھی تو بڑا میٹھا تھا ناں!..."

وہاں سے نکال کر اسے لاہور کیمپ لایا گیا، جہاں رہی سہی کسر بھی پوری کر دی گئی۔ کیمپ میں ہی چوری چھپے تین بار اس کا حمل گرایا گیا۔ ایک بار تو وہ مرتے مرتے بچی۔ وہاں سے ایک

کافی عمر کا آدمی اسے بیاہ کر اپنے گھر لے گیا۔ وہ آدمی درزیوں کا کام کرتا تھا اور پہلے تین بیویوں کو دفنا چکا تھا۔ اس کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ صرف ایک بوڑھی ماں تھی جو گھٹیے کی مریضہ تھی، اور آٹھوں پہر چارپائی پر لیٹی رہتی تھی۔

"یہ بوڑھا بڑا ظالم تھا۔ اپنی ماں کے سامنے مجھے فحش گالیاں دیا کرتا اور پیٹا کرتا۔ میں نے سوچا تھا کہ چلو اس گھر میں رہ کر عزت کی روٹی تو ملے گی لیکن اس درزی نے میرا وہاں رہنا حرام کر دیا۔ وہ مجھے بالکل برہنہ کر کے زمین پر بٹھلا دیتا اور ایسے ایسے شرمناک تقاضے کرتا کہ مارے شرم کے میرا سارا بدن آگ کی طرح دہکنے لگ جاتا۔ پھر مجھے کہتا کہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھی رہو۔ خود سامنے بیٹھ جاتا اور مجھے دیکھتا رہتا۔ اگر مجھے نیند آ جاتی تو فوراً سوئی چبھو کر مجھے جگا دیتا۔ ہمارے گھر کے بالمقابل ایک نوجوان سنار رہتا تھا۔ جو کھڑکی میں کھڑے ہو کر کپڑے بدلا کرتا اور مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اشارے کیا کرتا۔ میں اپنے خاوند سے پہلے ہی بیزار تھی، چنانچہ اس نوجوان کی طرف کھنچنے لگی۔ آخر اس کے ساتھ گھر سے بھاگ نکلی۔ وہ مجھے لے کر سیدھا کراچی آ گیا۔ جہاں کچھ روز تو ہم نے خوب سیریں کیں اور اچھے سے اچھا کھایا۔ جب پیسے ختم ہو گئے تو میرے عاشق نے مجھے ایک اور کے حوالے کیا اور خود نو دو گیارہ ہو گیا۔ وہ آدمی پہلے اپنے دوستوں سے مجھے ملواتا رہا۔ اور پھر باقاعدہ مجھے ہوٹلوں میں بھجوانے لگا۔ وہاں سے میں ایک روز بھاگ کر لاہور آ گئی جہاں ایک اور شریف آدمی کے ذریعے خان کے گروہ میں آ گئی۔ اب تو بڑے مزے میں ہوں اور ان مردوں کی چکنی چپڑی باتوں پر جی بھر کر قہقہے لگاتی ہوں اور تم بھی ایسا ہی کیا کرو۔ کوثر! یہ سؤر بڑے مکار ہوتے ہیں۔"

ریشم نے نسرین کو ایک فرضی کہانی اپنے نام سے منسوب کر کے سنا دی جس میں وہی پرانی باتیں تھیں کہ شادی ہوئی، گھر سے بھاگی، کچھ دربدری کی اور اس ٹولی میں آن شامل ہوئی۔ ریشم نے اپنا اصلی نام بھی اسے بتانا گوارا نہ کیا اور اب وہ اس نام پر خود بھی تعجب کیا کرتی۔ جیسے ریشم کسی اور لڑکی کا نام ہو، ایک ایسی لڑکی کا جسے وہ مدت ہوئی لاہور سٹیشن پر ملی ہو اور جو مال روڈ کے فٹ پاتھ پر کھوئی کھوئی آنکھوں سے ادھر ادھر تکتے ہجوم میں کہیں گم ہو گئی ہو۔

بغرا خان کے گروہ میں تقریباً سبھی لڑکیوں کی کہانیاں ایک دوسری سے ملتی جلتی تھیں جیسے وہ ایک ہی جگہ بیٹھ کر گھڑی گئی ہوں۔ اور بعد میں کہیں کہیں تبدیلی کر دی گئی ہو۔ ہر لڑکی سگریٹ اور شراب کی عادی تھی۔ شمشاد جو ان سب میں بڑی تھی، افیم بھی کھاتی تھی۔ جس روز شہناز کو کوکین نہ ملے، وہ ایک قدم نہ چل سکتی تھی۔ چنانچہ کئی بار محض ماشہ ڈیڑھ ماشہ کوکین حاصل کرنے کے لیے اسے ایسے ایسے گندے آدمیوں کے پاس جانا پڑتا جن کے منہ پر وہ کوکین کھانے کے بعد تھوکنا بھی گوارا نہ کرتی تھی۔ سبھی لڑکیوں نے نام بدل رکھے تھے اور سبھی لڑکیاں اپنے گھریلو حالات کے بارے میں ایک دوسری سے جھوٹ بولتی تھیں۔

نسرین تو بالکل چین سموکر تھی۔ اس کی گوری گوری انگلیوں پہ زیادہ سگریٹ پینے سے نسواری چھٹے پڑ گئے تھے جو بہت برے لگتے تھے۔ ایسے ہی نشان ریشم کی انگلیوں پر بھی نمودار ہو رہے تھے۔ لیکن وہ انہیں ہر روز نہانے سے پہلے رگڑ دیا کرتی تھی۔ نسرین گرمی ہو یا سردی، کافی بڑے شوق سے پیتی۔ اور ایک ہی نشست میں تین تین پیالے چڑھا جاتی۔ ریشم چائے بڑے شوق سے پیتی۔ اور دن میں کئی کئی درجن پیالے پی جاتی۔ جس روز اسے عاشق تلاش کرنے میں دیر لگ جاتی تو اس کی طبیعت گھبرانے لگتی اور کانوں کے اندر شاں شاں کی سی آوازیں سنسنانے لگتیں پھر وہ اپنی پسند کا لحاظ کیے بغیر ہر اس مرد پر گر جاتی جو اس کی طرف ذرا سی بھی رضامندی کا اظہار کرتا۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ کوئی خوش پوش نوجوان اسے اپنے ساتھ ہوٹل میں لاتا۔ کیبن میں بیٹھ کر اظہارِ محبت کرتا، پیٹ بھر کر کھانا کھاتا اور خود جا کر بڑھیا سگریٹ لانے یا ذرا فون کرنے کے بہانے باہر کھسک جاتا۔ اور دوبارہ شکل نہ دکھاتا۔ مجبوراً ریشم کو سارا بل ادا کرنا پڑتا۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکتی تو یا ہوٹل کے منیجر سے دوسرا سودا کرنے کی کوشش کرتی اور یا اسے بغرا خان کو کہیں فون کر کے اس کی موٹی موٹی گالیاں سننا پڑتیں۔ وہ ہوشیار رہنے کی لاکھ کوشش کرتی لیکن جب کوئی شخص پاس بیٹھے بیٹھے اچانک یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہو کہ "ابھی آیا" تو پھر دوسرا آدمی اسے زبردستی تو نہیں پکڑ سکتا۔

کیفے ریڈ سٹار کے منیجر سے ریشم کا مستقل دوستانہ تھا۔ جس دن اسے کوئی عاشق نہ ملتا وہ کیفے ریڈ سٹار میں آ جاتی۔ منیجر کا رنگ کالا، قد چھوٹا، عمر چالیس کے قریب اور چہرہ چیچک کے

داغوں سے بھرا ہوا تھا اس کے چھوٹے چھوٹے کئی ایک نیچے بچیاں تھیں۔ زندگی میں اسے تین چار ایسی لڑکیوں سے واسطہ پڑا تھا جو کسی نہ کسی وجہ سے اسے چھوڑ کر دوسروں کے پاس چلی گئی تھیں۔ چنانچہ اس نے ان تجربات کی روشنی میں چند اصول گھڑ لیے تھے۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ عورت کی ذات بے وفا ہے اور اس کا صرف یہی ایک مصرف ہے کہ اس کے ساتھ بستر میں گھس جاؤ اور پھر لات مار کر باہر نکال دو۔ ریشم نے بھی کچھ اصول بنا لیے تھے اچھے اپنے نظریے وضع کر رکھے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جب کبھی بھوک ستائے اور کوئی عاشق نہ ملے تو کیفے ریڈ سٹار کے منیجر کے پاس جاؤ اور پیٹ بھر کر کھاؤ اس سے پیار محبت کرو اور باہر نکل کر اسے بھول جاؤ۔ چنانچہ وہ بڑی گرمجوشی سے ملتے تھے پہلے منیجر اپنے اصول پر عمل کرتا پھر وہ اپنے اصول کو استعمال میں لاتی اور دوبارہ بھوک لگنے تک وہ ایک دوسرے کو بالکل بھلا دیتے۔ ریشم اپنے نئے عاشق کی تلاش میں نکل پڑتی اور منیجر سگریٹ سلگا کر کاؤنٹر پر کسی نہ کسی سے ہمکلام ہو جاتا۔

"عورت کا صرف ایک ہی حل ہے کہ اس کے ساتھ . . . ."

ایک روز وہ دن چڑھے خان بغرا خان کے فلیٹ سے نسرین کے ساتھ مال پر نکلی۔ نسرین نے سٹیشن پر ایک ہوٹل میں کسی فلم کے پروڈیوسر کو وقت دے رکھا تھا، نسرین کو فلم میں کام کرنے کا بہت شوق تھا اور اس شوق نے بعد میں اسے اور زیادہ خراب کیا تھا۔ ریشم فلم بڑے شوق سے دیکھتی لیکن اس میں کام کرنے کا اسے کبھی خیال نہ آیا تھا۔ اس گروہ میں شاید ہی کوئی لڑکی ہو گی جو کسی نہ کسی فلم میں ناچ کی ٹولی میں شریک ہونے والی یا کسی ہیروئن کی کسی سہیلی کا پارٹ نہ کر چکی ہو۔ علاوہ ازیں خان بغرا خان بھی ان کی راہ میں روڑے اٹکاتا تھا۔ وہ انھیں فلمی لوگوں سے بہت کم ملنے دیتا تھا۔ لیکن نسرین نے سندھ کے ایک سیٹھ کا پتا نکال لیا تھا جو سٹیشن کے پاس کسی ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور جو لاہور میں ایک پنجابی فلم کی تیاری میں مصروف تھا۔ نسرین نے فون پر اس سے وقت لے لیا تھا اور آج بڑی بن سنور کر سارا چہرہ پاؤڈر میں چھپائے اس کے پاس جا رہی تھی۔ وہ چیرنگ کراس پر سے ٹیکسی میں سوار ہو کر سٹیشن والے ہوٹل کی طرف چل دی اور ریشم بھی اپنے روز کے دھندے پر ریگل کی طرف روانہ ہو گئی

ہ اس سبز بلڈنگ کے پاس سے گزری جس کی پیشانی پر بڑا لمبا چوڑا سائن بورڈ لگا تھا، جن
ں ایک آدمی ویو بیکر انجن چلاتا دکھایا گیا تھا اور جس کی سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہو کر ریشم
نے پہلی مرتبہ اس سڑک پر آکر پنواڑی سے پوچھا تھا۔

"میرے ویر! چائے کمپنی کا دفتر کہاں ہے؟"

وہ ہر روز اس سبز عمارت کے پاس سے گزرتی تھی، پہلے پہل اسے اس بلڈنگ کی طرف یکھتے ہوئے ڈر سا لگتا تھا۔ لیکن کچھ دیر بعد وہ بہت سی باتوں کی طرح اسے بھی بھول گئی تھی۔ ہ پنواڑی آج بھی اپنی چھوٹی سی دکان کے پاس گدی پر بیٹھا تھا اور کوئی فلمی پلاٹ پڑھ رہا فا۔ اور عمارت کی پیشانی پر وہ بورڈ بھی اسی طرح لگا تھا۔ آگے جا کر وہ دوسری نئی بلڈنگ جاتی جہاں اسے پتہ چلا تھا کہ وید . . . وہ اس کے مقدس مندر میں پھینکا ہوا پہلا جوتا، اور س کی بے داغ چاندنی پر رکھا ہوا پہلا گندا پاؤں اور اس کے ماتھے پر لگا ہوا کلنک کا پہلا داغ . . . . اس کا پردیسی عاشق وہاں سے تبدیل ہو کر ڈھاکے چلا گیا تھا۔ پہلے پہل وہ س عمارت کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی طرف منہ کر کے ہمیشہ تھوک دیا کرتی تھی۔ یکن رفتہ رفتہ وہ دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ اسے بھی بھول گئی تھی۔ ہاں! فٹ پاتھ پر سے گزرتے ہوئے اسے اس گوالن کا ہمیشہ خیال آیا تھا جو صبح سے شام تک سڑک کنارے گھاس کے تختے پر بیٹھی رہتی تھی۔ جس کے کانوں میں چاندی کے جھومر تھے اور جس کے بالوں میں چھلوں کی مینڈیاں تھیں اور گالوں پر پاؤنڈز پاؤڈر کی تہ کی جگہ چمبہ گلی کے سیب کی ادھ پکی سرخی تھی اور آنکھوں میں اندھیرے کنوئیں نہ تھے، سرد شیریں چشمے تھے جو شہروں سے دور سایہ دار جھکے جھکے درختوں کے جھنڈوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ جسے اس شہر میں کوئی نہ جانتا تھا، جو رات سے بھوکی تھی۔ اور جس کے پاس ایک چھوٹا سا کمزور کتا آکر کھیلنے لگا تھا . . . ریشم ابھی تک اس گوالن کو نہ بھلا سکی تھی۔ گوالن ہمیشہ سڑک کنارے گھاس پر بیٹھی ریشم کے انتظار میں ہوتی تھی اور جب وہ اکیلی یا نسرین یا کسی اور لڑکی کے ساتھ ہنستی کھیلتی، زور شور سے باتیں کرتی اور گزری ہوئی رات کے فحش لطیفے سناتی وہاں سے گزرتی تو گوالن اپنا اداس اداس دیہاتی چہرہ اٹھا کر اس کی طرف پلکیں جھپکا کر دیکھتی اور جیسے پوچھتی:۔

"کوثر! او ریشمی بُرقعے اور سُرخ جوتوں والی کوثر! میری طرف بھی دیکھو۔ میں اداس ہوں بڑی اداس ہوں، اپنے قہقہوں کی پھلواری میں سے ایک ننھی سی کلی میری جھولی میں بھی پھینکتی جاؤ۔"

ریشم بات کرتے کرتے آزردہ سی ہو کر چپ ہو جاتی اور وہاں سے تیز تیز گذر جاتی۔

اس روز جب وہ زرد عمارت کے قریب سے گزری تو ایک نوجوان اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ اس بلڈنگ میں سے باہر نکلا تھا اور سیاہ پتلون اور سپید قمیص پہنے سگریٹ پی رہا تھا، پوسٹ آفس کے اسٹینڈ پر سے ریشم دو منزلہ بس میں سوار ہو گئی۔ وہ نوجوان بھی اس کے ساتھ ہی سوار ہو گیا۔ ریشم انارکلی کے چوک میں ٹولنٹن مارکیٹ پر اتر گئی۔ وہ نوجوان بھی اتر آیا اور دوسرا سگریٹ سلگا کر ریشم کے پیچھے پیچھے بڑے مناسب فاصلے پر چلنے لگا۔ عجائب گھر کے احاطے میں ریشم نے ٹکٹ لیا اور اندر داخل ہو گئی۔ مغلیہ خاندان کی ٹوٹی پھوٹی سرمے دانیوں اور عطر دانیوں کو دیکھتے ہوئے ریشم ایک بڑی سی الماری کے سامنے کھڑی شہنشاہ جہانگیر کی شاہی قبا دیکھ رہی تھی کہ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے پاس کھڑا ہے۔

"بڑا خوبصورت کپڑا ہے" کسی نے اپنی آواز کی کپکپاہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں" ریشم نے بناوٹی انداز میں جھینپتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس کپڑے کی پتلون نہیں بن سکتی۔ اور کارڈرائے پھر مہنگی ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے ان الماریوں میں ان کپڑوں کے تھان بھی ٹانگنے چاہئیں جو ہم نہیں پہن سکتے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

ریشم نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ہنس پڑی اور دوسرے بڑے کمرے میں آ گئی۔ وہ نوجوان بھی اس کے ساتھ ہی آ گیا۔ اس ہال کمرے کے وسط میں گوتم بُدھ کی تانبے کی بہت بڑی مورتی لمبے چوڑے استھان پر رکھی تھی۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی الماریوں میں ڈیڑھ دو ہزار سال پہلے کے بُت تھے۔ یہاں نیزے، تیر کمانیں، چاقو، پیالے اور دوسری ٹوٹی پھوٹی چیزیں سجی ہوئی تھیں..... ایک الماری میں کچھ رنگین چینی تصویریں تھیں۔ جہاں کہیں صرف بانس کا درخت تھا اور کہیں دو تین پھولوں کے درمیان کالی کوئل چونچ اوپر اٹھائے بیٹھی تھی۔

"یہاں آرٹ اور انٹلیکٹ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ یہ بُت گوتم کا ہے۔ یہ تصویریں چینی مصوروں کی ہیں اور وہ تھالیاں جودھیا کے مہاراج یا شاید پاٹلی پتر کے کسی دھوبی کی ہیں اور آپ نے وہ گیت سنا ہے؟:-

"او کالی آنکھوں والی سندری!
پاٹلی پتر کو کونسا راستہ جاتا ہے؟
پاٹلی پتر کتنی دور ہے؟

....

میں گھر سے جل بھرنے نکلی ہوں،
اور مجھے ابھی برتنوں کا ڈھیر مانجھنا ہے،
اور پاٹلی پتر دیوداسیوں کی نگری ہے۔
راج کماریوں کی بھومی ہے،
میں وہاں کبھی نہیں گئی۔
پاٹلی پتر بہت دور ہے
او گاڑیبان بھائی!"

....

ریشم کچھ کہنے ہی والی تھی کہ وہ نوجوان بڑے تھیٹر والے لہجے میں بولا۔

"وہ کالی آنکھوں والی سندریاں اب کہیں دکھائی نہیں دیتیں نہ پاٹلی پتر میں اور نہ کوٹلی لوہاراں میں۔ وہ پاٹلی پتر بھی غائب ہو گیا ہے۔ وہ گاڑیبان بھائی بھی گم ہو گئے ہیں جن کے بیلوں کے گلوں میں کانسی کی گھنٹیاں ہوتی تھیں۔ اور جو بندھیا چل کے جنگلوں کے ساتھ ساتھ کچی سڑکوں پر راتوں کو سفر کیا کرتے تھے اور جن کے رستے میں سلیٹی رنگ کے سونے کے کلسوں والے مندر آتے تھے۔ مندر۔۔۔ جن کی کائی زدہ چھپی ہوئی سلوٹوں میں کبوتر بسیرا لیتے تھے اور سپید ساڑھیوں اور گندمی چہروں والی کنواریاں، شوک کلی اور کانسی کے پھول تھالیوں میں رکھے بھگوان کی آرتی اتارا کرتی تھیں۔ وہ بچار..."

ریشم جلدی سے بولی

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام۔۔۔؟" نوجوان دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈال کر بولا۔ "میرا نام سعید رضی ہے۔ میں شاعر ہوں اور ماہنامہ "اورنگ زیب" کا ایڈیٹر ہوں۔ اس پرچے کی چھپائی عمدہ، لکھائی دیدہ زیب اور پڑھائی نظر فریب ہے اور اس میں مزاحیہ، فکاہیہ، نفسیاتی، نفسیاتی مزاحیہ تاریخی۔۔۔"

"میں سمجھ گئی۔ سمجھ گئی ہوں۔"

"تو پھر چلیے کسی ہوٹل۔ میرا مطلب ہے کسی ٹی ہاؤس میں چلتے ہیں۔"

عجائب گھر سے نکل کر وہ دونوں یونیورسٹی کی پشت والی خاموش سڑک پر سے ہوتے ہوئے ورسٹی کیفے میں آ گئے۔ نومبر ختم ہو رہا تھا اور پورے سات ماہ لاہور کی سڑکوں، مکانوں کی چھتوں، اور دھول اڑاتے میدانوں میں آگ برسانے کے بعد دھوپ میں کافی مہربان سی نرمی آ گئی تھی۔ اس کا رنگ بھی کچھ کچھ سنہری ہو گیا تھا اور وہ درختوں اور گھاس پر پھیلی ہوئی آنکھوں کو بڑی بھلی لگنے لگی تھی۔ اگرچہ ابھی اتنی ٹھنڈ نہ اتری تھی مگر لوگوں نے سویٹر اور گرم سوٹ پہننے شروع کر دیے تھے پہلے پہل ریشم کو کہیں دسمبر میں جا کر سویٹر یا کوٹ کی ضرورت محسوس ہوتی تھی لیکن اب وہ پہلے ایسی ہٹی کٹی اور مضبوط ریشم نہ تھی۔ نومبر شروع ہوتے ہی وہ شام کے وقت کوٹ پہن لیتی تھی اور دن کو ہمیشہ گرم قمیص پہنتی تھی۔

ورسٹی کیفے کے کیبن میں جا کر ریشم نے پرس میز پر رکھتے ہوئے چہرے پر سے نقاب الٹ دیا اس کا ساتھی پہلے ریشم کی شکل اور پھر سرخ پرس دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔

"آپ تو بڑی خوبصورت ہیں۔"

پھر اس نے پرس اٹھا کر الٹا پلٹا کر دیکھنا شروع کیا۔

"یہ پرس بھی کافی خوبصورت ہے۔ جو شے باہر سے اتنی دیدہ زیب ہے، اندر سے کتنی نظر فریب ہو گی۔"

اور اس نے پرس کھول دیا، اسے ابھی سرخ نوٹ کا ایک کنارہ ہی دکھائی دیا تھا کہ ریشم

نے پرس جھپٹ لیا۔

"چھوڑیے آپ تو مذاق کر رہے ہیں۔"

وہ ہنس پڑا۔

"آپ تو بس یونہی گھبرا رہی ہیں۔"

اتنے میں کیبن کا پردہ ہٹا اور بیرا نمودار ہوا۔ اس نے چانپ، آملیٹ اور چائے کا آرڈر لیا اور پردہ اچھی طرح پھیلا کر واپس چلا گیا۔ سعید رضی کا رنگ گورا، آنکھیں باریک اور ہموار، بال لمبے لمبے تھے۔ ریشم نے اسے بتایا کہ اس کا نام رضیہ چوہان ہے۔ اس پر وہ ذرا ٹھٹھکا، اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں سکیڑتے ہوئے میز پر کہنی ٹیک کر بولا۔

"ایک بات بتائیں گی؟"

"پوچھیے"

"یہ چوہان کیا ہے؟"

ریشم ہنس پڑی۔

"کچھ نہیں۔۔۔ بس ہماری ذات ہے۔"

"خوب!" اس کی آنکھیں اصلی حالت پر آ گئیں۔

"اور آپ کیا سمجھتے تھے؟"

"کچھ نہیں۔۔۔ میں سمجھا تھا، شاید یہ چوہے کی عربی جمع ہے۔ حالانکہ چوہا عربی نہیں ہے۔"

ریشم اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی۔

"لیکن عربی چوہا تو ہوتا ہے۔ میں نے پرسوں چڑیا گھر میں دیکھا تھا۔"

"ہاں! ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح چوہان ہوتا ہے۔"

"تو پھر چوہان آپ کی ذات ہے؟"

"بالکل۔۔۔ جس طرح بھٹی، بیگ اور بٹ۔"

"رضیہ صاحبہ! ذات بھی کیا شے ہے! واہ واہ! آپ نے وہ شعر سنا ہے؟

ع تیری ذات پاک ہے، اے خدا تیری شان۔۔۔"

ریشم زور زور سے ہنس پڑی اور پھر وہ بھی ہنسنے لگا اور ہنسی ہنسی میں اس نے اچک کر ریشم کا گال چوم لیا۔ ریشم مصنوعی غصے کا اظہار کرنے لگی۔ جس پر وہ نوجوان معافیاں مانگنے لگا۔ آملیٹ اور چاپ کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے ریشم نے بتایا کہ وہ سلائی والے سکول میں کام کرتی ہے اور آج اپنی ایک سہیلی سے ملنے آئی تھی۔ جس نے عجائب گھر آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ دونوں آپس میں بہت جلد بے تکلف ہو گئے۔

دوپہر کا کھانا انھوں نے کیفے ریڈسٹار کے کیبن میں بیٹھ کر کھایا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے منیجر نے ٹیڑھی آنکھوں سے ریشم اور اس کے ساتھی کو دیکھا اور ذرا کھنکار کر میز پر بل یک بھاڑتے ہوئے اپنے گاہک سے بولا۔

"عورت کا جی بس ایک ہی حل ہے ...."

کیبن میں ریشم کے ساتھی نے ایک دو بار ادھر ادھر ہاتھ چلانے کی کوشش کی جسے ریشم نے ہر بار جھٹک دیا۔

"آپ کو کچھ تو خیال کرنا چاہیئے۔"

"لیکن میں کس کس کا خیال کروں مس چوہان! ذرا تم بھی تو خیال کرو۔ میرا دل تنور کی مانند دہک رہا ہے جس کے اندر امید کی باقرخانیاں جل کر کوئلہ ہو رہی ہیں۔ خدا کے لیے مجھے ایک ہی باقرخانی نکال لینے دو مس چوہان، تو راجپوتنی ہے۔ میں بھی راجپوت ہوں۔ ہم دونوں راجپوت ہیں لیکن تیری محبت نے مجھے نانبائی بنا دیا ہے۔"

"آپ کا دماغ تو درست ہے نا۔"

"نانبائی کا دماغ میدے کی بوری میں ہوتا ہے یا میدے کی بوری اس کے دماغ میں ہوتی ہے اور جب دماغ میں میدا بھرا ہو تو دل میں سوائے باقرخانیوں کے اور کیا اگ سکتا ہے۔ تم نے وہ بیت سنا ہے:۔

"تندوری تائی ہوئی اے۔
کھسماں نوں کھان روٹیاں
چھٹی ماہیئے دی آئی ہوئی اے۔"

ریشم منہ پہ رومال رکھے بڑی دیر تک ہنستی رہی اور اس دوران میں نوجوان شاعر نے اپنا ہاتھ اس کی قمیص کے اندر تک پہنچا دیا۔

کیفے ریڈسٹار سے اٹھ کر وہ کچھ دیر یونیورسٹی گراؤنڈ اور گول باغ وغیرہ میں گھومتے رہے اس کے بعد ریشم کا ساتھی اسے اپنے گھر لے گیا، جہاں اس کا کمرہ باقی گھر سے بالکل الگ تھا۔ رہ اُلّم غلّم ردی اور گرد آلود اشیا سے بھرا ہوا تھا۔ پلنگ پر کتابوں کا ڈھیر لگا تھا اور بستر ن پہ بچھا ہوا تھا۔ میز پر موم کے کتنے ہی بجھے ہوئے ٹکڑے پڑے تھے۔ کرسی کی ایک ٹانگ وٹی تھی جس کے نیچے ایک کتاب دے رکھی تھی۔ کونے میں الگنی پر سیاہ شیروانی اور دھوتی ٹنگی ئی تھی۔ کارنس پر مدھوبالا کی فریم کی ہوئی تصویر تھی جس میں وہ گھٹنوں تک چڑھائے ہاتھوں پستول میں لیے کسی کا نشانہ بنا رہی تھی۔ ریشم کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور وہ پلنگ کے نیچے سے ے سوٹ کیس کھینچ کر اس میں سے کچھ نکالنے لگا۔

"گھبرانا مت میری جان! دراصل گھر کے سب لوگ کراچی گئے ہوئے ہیں اور مجھے کمرہ اف کرنے کی عادت نہیں ہے۔"

پھر وہ کچھ خطوط نکال کر ریشم کے پاس لایا اور میز پر بیٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

"یہ سارے خطوط زرینہ کے ہیں۔ جیسا کہ میں نے تمھیں بتایا تھا۔ مارچ میں ہماری شادی ہو جائے گی۔ ہم ایک دوسرے سے بڑا پیار کرتے ہیں۔ وہ تو مجھ پر دیوانہ وار فدا ہے، تم ذرا نے کے طور پر ایک خط پڑھو تو...."

ریشم نے چھوٹے چھوٹے ٹیڑھے میڑھے لفظوں والا ایک نیلا خط اپنے سامنے کھول لیا۔ لن اسے پڑھنا کہاں آتا تھا۔ وہ یونہی سطروں پر نظر گھماتے لگی۔ اس کے ساتھی نے فوراً خط ے ہاتھ میں لے لیا۔

"یوں نہیں بھئی.... میں تمھیں پڑھ کر سناتا ہوں۔ دیکھا لکھائی کتنی دیدہ زیب اور... ر لکھتی ہے۔ میری آنکھوں کے نور۔ میرے دل کے شاعر جناب سعید صفی صاحب! . . . . سلام علیکم! آپ کی پیاری زرینہ آپ کو محبت بھرا سلام کہتی ہے اور اپنے سرتاج . . . ."

تقریباً سارے خط اسی طرح شروع ہو کر اسی طرح ختم ہو گئے تھے۔

جب ریشم کا سر درد کرنے لگا۔ تو اس کا ساتھی اسے اپنی بے ہنگم اور بے سُری آواز میں آوارہ فلم کا ایک گیت سنانے لگا۔

جب سے بلم گھر آئے . . . . . جیارا مچل مچل جائے۔

"اوہ! نسرین تو اس گیت کی دیوانی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، وضو کرتے، نماز پڑھتے۔ بس ہر وقت مجھے یاد کر کے یہی گاتی رہتی ہے . . . . جیارا مچل مچل جائے . . . .

آدھ گھنٹے بعد اس نے ریشم کو پلنگ پر کتابوں کے بستر میں لٹا رکھا تھا اور اس کے گلے میں بانہیں ڈالے پاؤں کے انگوٹھے سے پلنگ کی پٹی پر تال دیتے ہوئے گا رہا تھا۔

"جیارا مچل مچل جائے۔

جب سے بلم . . . . "

ریشم کچھ بیمار سی تھی۔

سارِیڈون کی تین گولیاں چائے کے ساتھ نگلنے کے بعد وہ کیفے ریڈ سٹار کے منیجر کے چھوٹے سے کمرے میں بستر پر دھنسی تھی۔ منہ سر کمبل میں لپیٹے وہ گٹھڑی سی بنی پڑی تھی اور اسے سردی محسوس رہی تھی۔ صبح سے اس نے کوئی کام نہ کیا تھا۔ اور اب سہ پہر ہو رہی تھی، دوپہر کو اس نے صرف دودھ میں بھگو کر ایک سلائیس کھایا تھا۔ آج رات اسے منپلورہ کے علاقے میں کسی پٹرول ایجنٹ کے پہلو میں گزارنا تھی۔ اور وہ اپنے اندر اتنی سکت نہ پا رہی تھی۔ دن ڈھلے کیفے کا ہیچک رُو منیجر اندر آ کر ریشم سے چہلیں کرنے لگا۔ اور ریشم کے انکار کے باوجود اس نے اپنے اصول پر عمل شروع کر دیا۔ شام کو ریشم کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ اور خان کے فلیٹ میں پلنگ پر پڑ گئی۔ خان نے نوکر بھیج کر اس کے لیے دوائیاں وغیرہ منگوائیں اور مغل پورہ اس کی جگہ کسی دوسری لڑکی کو بھیج دیا۔ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ گزرنے پر بھی جب ریشم کا بخار پوری طرح نہ اُترا تو خان بغرا خان بڑا گرم ہو گیا۔ اس نے پہلے ڈاکٹروں اور پھر ریشم کو گالیاں دینا شروع کر دیں اور اس کے بعد ریشم کو میو ہسپتال کے سپیشل زنانہ وارڈ میں داخل کروا دیا۔ ریشم کی بیماری طول پکڑ گئی۔ کچھ دنوں نسرین بھی دن میں کئی کئی چکر لگاتی رہی۔ پھر اس نے بھی آنا کم کر دیا۔ ریشم کو ایکا ایکی محسوس ہوا کہ اتنے بڑے شہر میں اتنے دوستوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ تنہا ہے بالکل تنہا ہے اور اگر وہ مر گئی تو اس کی لاش تک لینے شاید کوئی نہ آئے گا۔ ایک رات اسے بڑا تیز بخار تھا۔ اور اس کا بدن انگارے کی طرح پھک رہا تھا۔ رات بھر وہ ہذیان میں مبتلا واہی تباہی

بلتی رہی۔ کبھی نرس کو آوازیں دیتی۔ کبھی اپنی ماں کو پکارنے لگتی اور کبھی ایک دم چیخنا شروع کر دیتی۔ "چھوڑ... مجھے چھوڑ دو... مجھے چھوڑ دو..."

سلماف نرس رات کی گشت پر آئی۔ اس نے ریشم کی حالت دیکھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور نرس کو ٹیکہ لگانے کی ہدایت دے کر چل دی۔ ٹیکہ لگنے کے بعد ریشم پر غشی کی سی حالت طاری ہوگئی۔ اور اس کے گلے سے دیر تک غرغراہٹ کی سی آواز نکلتی رہی۔ دوسرے روز اس کا بخار کم تھا۔ لیکن بدن بری طرح دکھ رہا تھا۔ تسرین کچھ انار لفافے میں ڈالے اس سے ملنے آئی اور جتنی دیر بیٹھی رہی، اپنے سندھی پروڈیوسر کے گن گاتی رہی۔ جس نے تسرین کو ہیروئن بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

"اچھا میں جاتی ہوں کوتر! کل یا پرسوں پھر خبر لینے آؤں گی، سیٹھ ہوٹل میں انتظار کر رہا ہوگا آج ہم اکٹھے تصویریں کھنچوا رہے ہیں۔ سیٹھ بڑا سور ہے۔ عجیب عجیب قسم کی تصویریں اتروانا چاہتا ہے، اچھا میں جاتی ہوں..."

تسرین نے گلے میں بندھا ہوا رومال درست کیا۔ ریشم کی طرف دیکھ کر ذرا مسکرائی، اور وارڈ سے باہر نکل گئی۔ تین دن گزر گئے، سوائے خان کے ملازم کے اور کوئی نہ آیا۔ دوسری لڑکیاں ایک ایک کر کے پہلے ہی ہفتے خبر لے چکی تھیں۔ اور پھر جیسے وہ ریشم کو بالکل بھول گئی تھیں۔ اور ریشم کو بھی ان کا خیال بہت کم آتا تھا۔ اس نے تمام نرسوں کو اپنی سہیلیاں بنا لیا تھا اور ان کے ساتھ گھڑی دو گھڑی اپنا دل بہلا لیتی تھی۔ جب ملاقات کا وقت آتا اور بیماروں سے ملنے کے لیے ان کے دوست، بھائی بند اور رشتہ دار وارڈوں میں ہر سمت مکھیوں کی طرح اڑتے دکھائی دیتے تو ریشم اپنے وارڈ سے نکل کر برآمدے میں آجاتی اور جنگلے کے ساتھ لگے بنچ یا سٹول پر ذرا پرے ہٹ کر دھوپ میں بیٹھ جاتی اور نیچے ہسپتال کی دیوار کے پار سڑک پر سے گزرتے تانگوں، سائیکلوں، کاروں اور پیدل چلنے والوں کو دیکھتی رہتی۔

ایک دن موسم ابر آلود تھا۔ اور صبح سے بوندا باندی ہو رہی تھی۔ یہ جنوری کی ہڈیوں کو ج دینے والی بارش تھی۔ وارڈ کی تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ اور برآمدوں میں سرد ہوا چل رہی تھی اور نیچے لان میں اُگے ہوئے درخت اپنی بھیگی ہوئی ٹہنیاں ہلا رہے تھے۔ وارڈ کے وسط میں بنے ہ

ر رُخے آتش دان میں دونوں جانب لکڑی کے بڑے بڑے مڈھ جل رہے تھے۔ ملاقات کا وقت گیا تھا مگر بیماروں کے دوست اور رشتہ دار کہیں دکھائی نہ دیتے تھے۔ صرف ایک دو مریضوں کے پاس ایک آدھ آدمی یا عورت بیٹھی وارڈ کی سردی میں ٹھٹھر رہی تھی۔ ریشم گرم کمبل گردن اوڑھے آہنی پلنگ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی اور اپنے ساتھ والی مریض لڑکی سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ لڑکی کمبل کے اوپر نسواری رنگ کا ریشمی لحاف اوڑھے ریشم کی جانب منہ کیے لیٹی تھی۔ اور باتیں کرتے ہوئے کسی وقت ہنس دیتی تھی۔ وہ سپیشل وارڈ میں اسی روز داخل ہوئی تھی۔ اس کا نام نکہت آرا تھا اور پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے ایک ریٹائرڈ انجینئر کی بیٹی تھی۔ ڈیڑھ دو سال سے اسے ہلکے بخار کی شکایت تھی۔ نکہت کے ماں باپ کو شبہ ہوا کہ کہیں لمبی بی نہ ہوگئی ہو۔ انھوں نے ایکسرے کروایا۔ پتا چلا کہ بگڑا ہوا ملیریا ہے۔ ڈاکٹروں نے ہسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ آج ہی صبح نکہت کا ادھیڑ عمر چوڑے چکلے والا باپ اور بھاری بدن کی ماں اسے سپیشل وارڈ میں چھوڑ گئے تھے۔ نکہت کا رنگ زرد تھا جو اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ خوبصورت نہیں تھی۔ دبلا بدن، عام لڑکیوں ایسے سیدھے سادھے بال، معمولی آواز... اس کے باوجود اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی دلکشی تھی۔ جو مسکراتے ہوئے زیادہ نمایاں ہوتی تھی۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس کے قریب تھی۔ اور وہ کینارڈ کالج میں ایف، ایس۔ سی۔ میں پڑھ رہی تھی۔ ان دونوں کو ایک دوسرے میں عجیب سی کشش محسوس ہوئی اور وہ دونوں چند ہی گھنٹوں میں بڑی پکی سہیلیاں بن گئیں۔ اس وقت بھی دونوں بڑی دلچسپی سے باتیں کر رہی تھیں اور ہسپتال کے لان میں ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ جس کی پھوار میں برآمدے کا آدھا فرش بھیگ رہا تھا۔ وارڈ میں آتش دانوں میں آگ کے باوجود سردی تھی اور سفید پوش نرسیں برف سے نکلی ہوئی قلفیوں کی طرح ادھر سے اُدھر چکر لگا رہی تھیں۔ دو تین کمزور سی بتیاں روشن تھیں اور جلتی ہوئی لکڑیوں کی سسکار بیماروں کے باتیں کرنے کی دھیمی دھیمی آوازوں میں گم ہو رہی تھی۔ سردی اور بارش کے باعث آج وارڈ میں ملنے والوں کا بالکل رش نہ تھا، کسی وقت کوئی دروازہ کھول کر بوٹ جھاڑتا ٹھٹھرتا ٹھٹھرتا کسی بیمار عزیزہ کے پاس جا کر بنچ پر بیٹھ جاتا۔ اور جتنی دیر بیٹھا رہتا، ہتھیلیوں کو

رگڑ رگڑ کر گرم کرتا رہتا۔ ملاقات کا وقت شروع ہوئے آدھ گھنٹہ ہوا تھا کہ نکہت کی ماں، اس کا باپ، بڑی بہن اور بھائی سب لوگ اس سے ملنے آ گئے۔ وہ اپنے ساتھ انار، انگور، اور سنگترے اور چائے سے بھری ہوئی تھرمس لائے تھے۔ نکہت نے ان لوگوں سے ریشم کو ملایا۔ نکہت کی ماں نے پلیٹ میں انگور رکھ کر ریشم کو بھی دیے۔ ریشم نے انکار کیا تو نکہت نے آہستہ سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں بولوں گی پھر!"

ریشم اس کے بعد انکار نہ کر سکی، نکہت کی بڑی بہن بیاہی ہوئی تھی اور بڑی بارعب اور خوبصورت عورت تھی۔ وہ اس سے پانچ سات سال بڑی تھی۔ اس کا بھائی عمر میں اس سے دو تین سال بڑا ہوگا۔ اس کا رنگ نکہت کی طرح زرد تھا اور بال بغیر تیل کے خشک ہو کر بھورے ہو رہے تھے۔ وہ سر جھکائے چائے پی رہا تھا۔ اور باتوں میں بہت کم حصہ لے رہا تھا۔ اس کی بڑی بہن بڑے زور شور سے پچھلی سردیوں کا ایک واقعہ سنا رہی تھی۔ جب ان کی کار بارش میں ایک جگہ کیچڑ میں پھنس گئی۔ اور آخر رستے کی مدد سے دو بیلوں نے اسے باہر نکالا۔

نکہت کا باپ چائے پیتے ہوئے بار بار اسے اس واقعے کی گم شدہ کڑیاں یاد دلا رہا تھا۔ اس کی ماں ریشم سے باتیں کر رہی تھی اور کمرہ جو اس سے پہلے سرد اور ویران تھا، دیکھتے دیکھتے گرم اور زندگی سے بھرپور محسوس ہونے لگا تھا۔

ریشم کا جی لگ گیا تھا اور وہ اس وارڈ سے کبھی رخصت نہ ہونا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا بخار اتر چکا تھا اور اس کا پلنگ کسی دوسرے بیمار کا انتظار کرنے لگا تھا۔ چنانچہ ریشم نے نکہت سے مشورہ کر کے باہر سے پتا نہیں کونسی شے منگوا کر کھائی کہ تھوڑی ہی دیر بعد اس کا بدن بخار میں پھکنے لگا۔ ایک ہفتہ کے لیے وہ پھر مطمئن ہو گئی۔ خان کا ملازم دن میں ایک بار آتا اور بڑی باقاعدگی سے کھانے پینے کی چیزیں اور کپڑے وغیرہ دے جاتا۔ کبھی کبھی نسرین بھی گلے کا رومال لہراتی نکل آتی۔ ریشم نے نکہت کے سامنے اسے اپنی بہن ظاہر کیا تھا۔

ایک روز جبکہ دن بڑا روشن اور چمکیلا تھا۔ دھوپ... جنوری کی دھوپ کا رنگ سنہری تھا اور وارڈ میں بڑی خوبصورت روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ نکہت کا بھائی اس سے ملنے آیا

وہ بھوسلے رنگ کی گرم پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اور پوری آستینوں کی زرد جرسی کی بائیں جانب دل کے پاس بڑا سا سرخ گلاب کا سرخ پھول کڑھا ہوا تھا۔ سفید قمیص کے بڑے کالر کھلے تھے اور گہرے قرمزی رنگ کے پسینے کا مفلر گردن پر سے ہو کر قمیص کے اندر چلا گیا تھا۔ اس کا زرد چہرہ آج بڑا شگفتہ تھا اور گہری گہری گول آنکھیں چمک رہی تھیں۔ پاؤں میں گرم جرابیں اور موٹے تلے کا انگلش بوٹ تھا۔ اور وہ بڑی گرمجوشی سے سر ہلا ہلا کر ریشم اور نکہت کو گھر میں آئے ہوئے ایک مہمان کی باتیں سنا رہا تھا۔ جو اٹامک ریسرچ کے سلسلے میں ایک ہفتے کے لیے لاہور آیا تھا اور جس کے کمرے سے رات سے کبھی ہیر وارث شاہ گانے اور کبھی گھوڑے کے ہنہنانے کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ نکہت کے پیٹ میں ہنسی کے مارے بل پڑ رہے تھے اور وہ بار بار کہہ رہی تھی۔

"دیکھا کوثر! سلیم مسخرہ ہے۔"

اور سلیم کہہ رہا تھا

"میں تھوڑے ہی بول رہا ہوں۔ تم امی سے پوچھ لینا۔ میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ وہ ہمارے گھر کیسے آ گیا۔ وہ تو کسی اصطبل میں بندھنے کی چیز ہے۔"

سلیم بھی ہنس رہا تھا۔ ریشم بھی ہنس رہی تھی اور ان لوگوں کو ہنستے مسکراتے دیکھ کر پاس سے گزرتی ہوئی ایک نرس بھی مسکرانے لگی۔

دوسرے روز ریشم برآمدے میں ذرا ہٹ کر جنگلے کے پاس دھوپ میں بیٹھی چھوٹی سی ریتی سے اپنے ناخنوں پر جما ہوا پالش کھرچ رہی تھی اور اندر نکہت اپنی امی اور اپنی بڑی بہن سے باتیں کر رہی تھی کہ اس نے سلیم کو برآمدے میں آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں نرگس کے بسنتی پھولوں کا گچھا تھا اور چلتے ہوئے اس کا منہ ذرا سا کھلا تھا۔ ریشم کو نہ جانے کیوں اس پر بڑا پیار آیا اور اس کا جی چاہا کہ وہ اسے اپنی گود میں لے کر اتنا چومے اتنا چومے کہ اس کے ہونٹ شل ہو جائیں اور حلق خشک ہو جائے لیکن وہ پھر بھی نہ تھکے۔ سلیم نے ریشم کو باہر بیٹھے دیکھا تو اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"دھوپ میں بیٹھی ہو کوثر! سردی لگ رہی ہے!"

"ہاں"، ریشم نے اپنا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ جس پر ابھی ابھی گزر جانے والے ایک خوبصورت ترین خیال کا رنگین غبار ابھی تک اڑ رہا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

"یہ پھول تو نرگس کے ہیں۔ ہیں نا۔"

"ہاں"، سلیم نے گلدستہ آگے بڑھا کر کہا۔ "بڑی مشکل سے ملے ہیں۔ کسی کے پاس تھے ہی نہیں۔ کہتے ہیں جی اب کے نرگس کم ہوئی ہے۔ میں نے کہا، پھر کیا ہوا۔ ہم صبح اپنے کالج کے کھیتوں سے توڑ لائیں گے۔ خدا کی قسم! ہمارے کالج میں نرگس لگی ہے نا کوثر! بس تمھیں کیا بتاؤں اتنی خوشبو ہوتی ہے۔ اتنی خوشبو ہوتی ہے کہ اگر وہاں سے گدھا بھی گزرتا ہے تو ایک منٹ کے لیے ضرور رک جاتا ہے۔"

ریشم کھلکھلا کر ہنس پڑی اور سلیم کو جیسے ایکا ایکی کوئی بھولی ہوئی حسین شے یاد آگئی اس نے بڑے افسردہ انداز میں ریشم کو دیکھا اور اس سے بھی زیادہ افسردہ انداز میں آہستہ سے مسکرایا۔ نرگس کا ایک لمبے ڈنٹھل والا پھول گلدستے میں سے نکالا اور ریشم کی گود میں رکھ دیا۔

"یہ تمھارا ہے کوثر! . . . بالوں میں لگا لینا۔ تمھارے بال بڑے خوبصورت ہیں اس پھول سے بھی زیادہ . . . ."

اور اسی طرح مسکراتے ہوئے وہاں سے ہٹ کر وارڈ کا جالی دار دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

نرگس کا لمبے، نازک، ہرے ڈنٹھل والا سفید اور بسنتی پھول ریشم کی گود میں پڑا تھا اور وہ اسے ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ لگاتے ہی وہ ریت مٹی اور دھول بن کر اڑ جائے گا۔ پہلے بھی اس کی گود میں کئی پھول گرے تھے اور ریت اور مٹی اور دھول بن کر اڑ گئے تھے۔ اور اب اس کا دامن سورج کی آگ میں جلتا ہوا صحرا تھا۔ بہت بڑا صحرا، جہاں ہر وقت ریت کے وحشتناک، سیٹیاں بجاتے جھکڑ چلا کرتے تھے۔ اور جہاں سے کبھی تاروں کی خنک چھاؤں میں سفر کرنے والا قافلہ نہ گزرا تھا۔ جہاں کبھی لمبی پُر پیچ، پُرسوز آواز میں گیت گانے والے حدی خوانوں اور چھریرے بدن کی سیاہ چشم ڈاچیوں کے گھٹنوں پر بندھی ہوئی

جھانجنوں کی خواب انگیز آوازیں نہ گونجی تھیں۔ ریشم کی گود میں، ریشم کی جھولی میں یہ پہلا پھول، پہلا قافلہ اور پہلا نخلستان تھا۔ وہ ہمہ تن گوش ہو کر جھانجنوں کی آواز سن رہی تھی۔ اس کے ریگستانوں میں سے گزرنے والا قافلہ آگیا تھا۔ صحراؤں میں سورج طلوع ہونے والا تھا اور سحر کی نورانی جھلکیوں میں دور دور ہرے بھرے نخلستانوں کے درخت صبح کی ہواؤں میں اپنی لمبی نوک دار ٹہنیاں ہلا رہے تھے۔ اور میلوں دور ٹھنڈی ریت کے ساتھ ساتھ بلند ٹیلوں پر آنے والے قافلے کی پہلی ڈاچی، پہلی محمل نمودار ہوئی تھی اور پُرسوز حدی خوانوں کا پہلا گیت ریشم کے کانوں کو چوم کر گزر گیا تھا اور پھر جیسے درخت کے سارے پھل، شیریں پھل اپنی شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے قدموں میں گر رہے تھے۔ اور وہ اپنے قدموں میں گرے ہوئے پھلوں کو اور اپنی جھولی میں گرے ہوئے پھول کو ہاتھ لگاتے ڈر رہی تھی۔ کہیں وہ قافلے واپس نہ ہو جائیں اور وہ اونچے اونچے درختوں والے نخلستان پھر بنجر صحرا کے سینے میں نہ ڈوب جائیں۔ اور کانوں کو گزرنے والے گیت ریت پر گر کر دم نہ توڑ دیں۔ وہ اپنی گود میں پڑے ہوئے نرگس کے پھول کو بڑی محبت سے پیار کرنا چاہتی تھی، جیسے وہ اس کا اپنا بچہ ہو۔ وہ اس بچے کو دھیرے دھیرے تھپکتے ہوئے لوری گانا چاہتی تھی۔

"سو جا میرے لال! سو جا
ابھی گوالے دودھ لے کر نہیں آئے
ابھی پھولوں نے آنکھیں نہیں کھولیں
ابھی مرغ نے اذان نہیں دی
ابھی راستوں پر اندھیرا ہے
سو جا! میرے لال! سو جا۔"

لیکن ریشم کے دل میں ایک نامعلوم سا خوف تھا اس سے پہلے بھی اس کی گود میں کئی پھول گر چکے تھے۔ کئی بچے گر چکے تھے اور وہ انھیں تھپک تھپک کر لوری نہ سنا سکی تھی اور انھیں اٹھا کر اپنے سینے سے نہ لپٹا سکی تھی اور آج بڑی مدت بعد ایک پھول، ایک بچہ اس کی گود میں اپنی ننھی منی معصوم آنکھیں کھولے مسکرا رہا تھا۔ وہ ان بچوں کو، ان معصوم آنکھوں، اور

پھولوں کو بھول گئی تھی۔ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ تم کون ہو میرے پھول؟ تم کہاں سے آئے ہو؟ اور پھول کہہ رہا تھا۔ میں پہاڑوں سے آیا ہوں ریشم! پنج ناگ اور چمبہ گلی سے آیا ہوں اور میں نے باؤلی کا پانی پیا ہے اور میں نے شبنم کا منہ چوما ہے اور پہاڑی راتوں کے خاموش گیت سنے ہیں۔ اور ریشم! تم مجھے بھول گئی ہو؟ بھلا بیٹھی ہو؟ لیکن میں تمہیں بہت یاد کرتا تھا اور آخر منزلوں پر منزلیں عبور کرتا ہوا تیرے پاس آن پہنچا ہوں۔ تیری گود میں آگیا ہوں اور تیری جھولی میں لیٹا مسکرا رہا ہوں۔ میں تمھارا پھول ہوں ریشم! میں تمھارا بچہ ہوں۔ ماں! مجھے اٹھا لو، اپنے سینے سے بھینچ لو، چوم لو اور مجھے وہی لوری گا کر سناؤ۔

سو جا! میرے لال! سو جا

ابھی گوالے دودھ لے کر نہیں آئے۔

ابھی پھولوں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

ریشم نے بے اختیار ہو کر اس پھول کو اٹھا کر چوم لیا اور اسے اپنے زرد اور ٹھنڈے گالوں سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور اس کے اردگرد خلاؤں میں جیسے ان گنت سپید پروں والے ننھے ننھے بچے ماں!... ماں!... پیاری ماں! پکارتے ریشم کے اوپر منڈلانے اور اس کے سر پر پھولوں کی بارش برسانے لگے۔ ریشم کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اس نے آہستہ سے پلکیں کھول کر سامنے دیکھا۔

دیوار کے ساتھ اگے ہوئے درخت کی ٹہنی پر ایک چڑیا اپنے ننھے سے بچے کے منہ میں اپنی چونچ ڈال کر کچھ کھلا رہی تھی اور بچہ خوشی سے چیؤں چیؤں کیے جا رہا تھا۔ ریشم کے صدیوں سے اداس چہرے پر اس بچے سے بھی زیادہ ننھی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

چیؤں، چیؤں، چیؤں ...

اب ریشم، سلیم کا بڑی بیتابی سے انتظار کرتی۔ رات کو جب وارڈ کی تمام بتیاں بجھ جاتیں اور ڈیوٹی نرس کی میز والی بتی پر بھی غلاف چڑھا دیا جاتا اور نکہت بھی سو جاتی تو ریشم جاگ رہی ہوتی تھی۔ وہ کمبل اور لحاف میں لپٹی، آنکھیں کھولے وارڈ کی لمبی لمبی کھڑکیوں کو دیکھتی رہتی جن کے رنگین شیشوں پر نیچے سڑک پر چلنے والی بتیوں کا عکس جھلملا رہا ہوتا۔ دن کو جب بیماروں

سے ملاقات کا وقت آتا تو وہ منہ ہاتھ دھو کر کمبل اوپر کر کے پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر ٹھ جاتی اور نکہت سے باتیں کرتے ہوئے سلیم کا... اس کے بھائی کا انتظار کرنے لگتی۔ پھر ہ آجاتا، کبھی مسکراتا اور کبھی بہت ہی خاموش اور اداس، کبھی اکیلا اور کبھی اپنی امی یا ابا کے ساتھ۔ یشم بڑے اشتیاق سے اس کی باتیں سنتی اور اس کے چھوٹے سے چھوٹے مذاق کا زیادہ سے زیادہ لطف اٹھاتی۔ سلیم بھی کچھ کچھ اس کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ وہ بھی باتیں کرتے کرتے س کی طرف بڑی پُر محبت نگاہوں سے یوں دیکھتا گویا کوئی بھولا بسرا نغمہ سن رہا ہو، یا اپنے بچپن کی بڑی خوبصورت تصویر دیکھ رہا ہو۔ ایک روز وہ بالکل اکیلا آیا۔ نکہت شاید غسل خانے یں تھی۔ وہ بڑے نفیس گرم کپڑوں میں ملبوس تھا اور سرخ ٹائی کے ساتھ اس کے چہرے کی فسردہ دلکشی کچھ اور چمکنے لگی تھی۔ ریشم اپنے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ سلیم ریشم کی طرف منہ کر کے کہت کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"نکھو کہاں گئی؟"

"ابھی آجاتی ہے۔" ریشم کا چہرہ جیسے ایکا ایکی طلوع ہوتے ہوئے سورج کے سامنے آگیا تھا اور کندن بن کر دمکنے لگا تھا۔ سلیم کا دل بھی دھڑکنے لگا تھا اور وہ اپنی بدحواسی پر قابو پانے کے لیے بڑی بے معنی انداز میں ادھر اُدھر کی بے مقصد باتیں کر رہا تھا۔ ریشم بڑی خوش تھی۔ وہ صرف خوش تھی۔ مسرت کی ایک بے کنار لہر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر گمنام جزیروں کے گُل پوش ساحلوں پر لے آئی تھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے جہاں تک نگاہ جاتی تھی، رنگارنگ پھولوں کا فرش بچھا تھا۔ جن پر خوش رنگ تتلیاں اڑ رہی تھیں۔

"تم پھر میرے لیے پھول نہیں لائے۔"

سلیم جھینپ سا گیا۔ اسکول کے نوعمر طالبعلم کی طرح۔

"نرگس ختم ہو گیا ہے۔"

"اور بیلا؟"

"وہ بھی ختم"

"اور چنبیلی؟"

یوں لگا جیسے وہ اندھیرے میں اس سے بچھڑتے بچھڑتے بڑی مشکل سے بچی ہو۔

آخر وہ دن آ گیا جب ریشم کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔

نکہت سے جدا ہوتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دونوں کو اس جدائی کا صدمہ تھا۔ ریشم نے وعدہ کیا کہ وہ روز اس کی خبر لینے آیا کرے گی۔ اس روز سلیم نہ آیا تھا۔ ریشم اسے دیکھنے کی حسرت دل ہی دل میں لیے وارڈ سے چل دی۔ دوسرے دن وہ ملاقات کے وقت پر نکہت سے ملنے آئی۔ سلیم وہاں موجود تھا۔

"ارے بھئی واہ! تم تو چپکے سے چل دیں۔"

"اچھی جو ہو گئی ہوں۔"

ریشم کے پلنگ پہ ایک موٹی سی ادھیڑ عمر کی عورت اپنے ڈیڑھ درجن بچوں کے درمیان لیٹی ہائے وائے کر رہی تھی اور کوئی اس کا سر دبا رہا تھا، کوئی پاؤں . . . .

سلیم نے ریشم کے کان میں کہا

"تمھارے پلنگ پر کتنی موٹی عورت لیٹی ہے۔ خدا کرے تم بھی اتنی موٹی ہو جاؤ۔"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ جب سلیم ریشم کے قریب اپنا منہ لایا تو اس نے بڑی پیاری اور میٹھی خوشبو سونگھی تھی۔ گھنٹہ پون گھنٹہ نکہت کے پاس گزارنے کے بعد وہ دونوں اکٹھے وارڈ سے باہر نکلے اور برآمدے میں سے گزرنے لگے۔ ریشم ہلکے سلیٹی رنگ کا نیا برقعہ اوڑھے ہوئے تھی اس کی قمیص اور شلوار ریشمی تھی۔ جمپر سرخ اور سفید رنگ کی تھی اور کانوں میں نیلے نگینوں والے ٹوپس تھے۔ ریشم نے ہسپتال کی سیڑھیاں اترتے ہوئے پوچھا۔

"تم کونسا سینٹ استعمال کرتے ہو"؟

"میں؟" سلیم نے ٹائی کی گرہ سنبھالتے ہوئے کہا۔ "میں ہمیشہ سینٹ پال استعمال کرتا ہوں اور تم؟"

"ایوننگ ان پیرس۔"

اور وہ دونوں ایک بار پھر ہنس پڑے۔ ہسپتال سے باہر آ کر سلیم بولا۔

"چلو کوثر ہمارے گھر چلو۔ وہاں تم امی سے بھی مل لینا اور وہ ہمیں بڑی مزیدار چائے پلائیں گی۔"

ریشم نے نام رکھنے کے لیے تھوڑا سا انکار کیا اور پھر ساتھ ہو لی۔ آج بھی اس کا دن خالی تھا اور دوپہر کا کھانا اس نے کیفے ریڈسٹار میں کھایا تھا۔ پتا نہیں کیوں ریشم نے کسی ـ، کسی عاشق کی تلاش کی کوشش نہ کی تھی۔ وہ نسرین کے ساتھ بارہ بجے تک ورسٹی کیفے ٹھی رہی تھی اور وہ دونوں بار بار چائے اور کافی منگاتی رہی تھیں۔ سلیم کے بارے میں ـ نے نسرین کو کچھ نہ بتایا تھا۔ اس نے کافی کی تیسری پیالی خالی کرتے ہوئے نیا سگریٹ اکر صرف اتنا کہا تھا۔

"پتا نہیں کیا بات ہے نسرین! میرا اب اس کام میں ذرا جی نہیں لگتا۔"

نسرین کہنے لگی۔

"اور میرا تو جیسے بہت لگتا ہے۔ آخر کریں کیا، کوئی آدمی ہمیں گھر میں بسانے کو تیار نہیں۔ اگر کوئی تیار بھی ہو تو یہ جو ہمیں عادتیں پڑ گئی ہیں، ان کا خرچ کون اٹھائے گا۔ چلو یہ سب چھوڑ دیتی ہوں۔ اب خان سامنے پستول تانے کھڑا ہے بتاؤ، کہاں جاؤ گی؛ کس طرف بھاگو . . . ."

ریشم آہستہ آہستہ سگریٹ گھماتے ہوئے کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔

"شاید . . . شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ کوئی راستہ نہیں، کوئی راستہ نہیں۔ باہر جانے کا راستہ نہیں . . . ."

پھر جیسے وہ گھبرا سی گئی اور بیرے کو آواز دی۔

"کافی لاؤ . . . بڑی تیز۔"

کیفے سے نکل کر نسرین اپنے کسی ملنے والے کے ہاں چلی گئی۔ اور ریشم نے کچھ دیر بے مقصد ـ دو منزلہ بس کے چکر لگانے کے بعد . . . ریڈسٹار میں روٹی کھائی تھی اور پھر ہسپتال ـی۔ سارا راستہ وہ اپنے اور بھورے خشک بالوں والے، کبھی خوش اور کبھی اداس رہنے دبلے پتلے سے لڑکے کے متعلق سوچتی رہی تھی۔ اور سوچ سوچ کر زیادہ پریشان ہو گئی تھی ـلڑکے کا نام سلیم تھا اور اس کے چہرے کا رنگ زرد تھا۔ اور اس نے اس کی گود میں نرگس ـل رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ تمھارا ہے کوثر! . . ."

اس وقت بھی وہ اسی کے ساتھ بس میں بیٹھی ان کے گھر جارہی تھی۔ پہلی مرتبہ ان کے گھر جارہی تھی۔ اور اس کا ذہن بے شمار اٹمل اور بے جوڑ باتیں سوچ رہا تھا۔ جیسے وہ سورج بیشمار چھوٹے بڑے ٹکڑوں کے ڈھیر کے درمیان بیٹھی انھیں جوڑنے کی کوشش کررہی تھی لیکن ٹکڑا کسی سے نہ ملتا تھا، کسی سے نہ جُڑتا تھا اور اس کا ذہن تھک گیا تھا، شل ہوگیا تھا۔ اس نقاب کے اندر سے آنکھیں گھما کر سلیم کو دیکھا۔ وہ سامنے والی مردانہ سیٹ پر کھڑکی سے باز نکالے بیٹھا تھا۔ اور ہوا میں اس کے بھورے خشک بال اڑ رہے تھے۔

بس گنگا رام ہسپتال کے پاس کہیں رُکی اور سلیم ریشم کو ساتھ لے کر اُتر آیا۔

"اب سمجھو مکان آگیا۔" سلیم نے ہاتھ سے بالوں کو جماتے ہوئے کہا۔

دس پندرہ قدم چلنے کے بعد وہ دونوں ایک چھوٹی سی بغلی سڑک کی طرف گھوم گئے۔ سڑک پر جہاں لمبے لمبے تنوں والے اونچے اونچے درخت تھے۔ دو کوٹھیاں چھوڑ تیسری کوٹھی نکہت اپنے بھائی سلیم، امی اور ابا کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ کوٹھی کافی پرانی اور چھوٹی سی تھی۔ باغ میں گھاس بے طرح بڑھ گئی تھی اور کسی نے نہ کاٹی تھی۔ کھڑکیوں پہ لمبی لمبی جھکی جھکی ٹہنیوں والی بیلوں نے سایہ ڈال رکھا تھا۔ کمرے مختصر تھے۔ اور ان میں سامان اور فرنیچر جیسے بھرا تھا۔ نکہت کی امی ریشم سے مل کر بڑی خوش ہوئی۔ اور دیوان خانے میں بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگی۔ سلیم نے بتایا کہ ریشم کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی ہے۔

"اب تو بخار وخار نہیں آتا نا؟"

"جی نہیں . . . اب تو بالکل اچھی ہوں۔"

"بڑا اچھا ہے، اب خدا کہیں میری نکھو کو بھی اچھا کردے تو شکرانے کے نفل ادا کروں۔ میں نے ان کے ابا کو پہلے دن ہی کہا تھا کہ لڑکی کو ہسپتال بھجوا دیتے ہیں، ایک تو وہاں دیکھ بھال چوبیس گھنٹے ہوگی۔ دوسرے عین وقت پر دوائی ملے گی۔ مگر انھوں نے میری ایک نہ سُنی جب لڑکی کی حالت زیادہ خراب ہوگئی تو نانی یاد آئی اور . . ."

تھوڑی دیر بعد خادمہ چائے لے آئی۔ سلیم نے خود چائے بنائی، چائے کے بعد ر

یٹھی نکہت کی ماں سے غیر ضروری باتیں کرتی رہی، اپنے حسب نسب کا فرضی شجرہ سنایا اور کے لیے تیار ہوگئی۔ سلیم بس سٹاپ تک چھوڑنے آیا، سورج چھپ گیا تھا۔ درختوں میں ے گھنیرے سائے گہرے ہونے لگے تھے اور سردی بڑھ گئی تھی۔ ایک آدھ کوٹھی کے باہر ش میں سے نیلا نیلا دھواں اٹھ کر وہیں جمع ہو رہا تھا۔ اور اوپر نہیں جارہا تھا، سلیم ے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"سردی تو نہیں لگ رہی کوثر؟ . ."

"اونہوں . . ."

سڑک بالکل خالی تھی اور سامنے بڑی سڑک پر سے کبھی کوئی کار تیزی سے گزر جاتی تھی۔ ں مرطوب جھاڑیوں اور درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی بُو تھی۔ سلیم نے چپکے سے ریشم کا پنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ دونوں بڑے آرام آرام سے قدم قدم چل رہے تھے۔ ریشم کا ہاتھ ا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اس کا دل خوشی کے ایک انوکھے س سے لبریز ہوگیا۔ وہ بھول گئی تھی کہ جب کوئی پہلی بار محبت سے ہاتھ سہلاتا ہے پر کیا گزرتی ہے۔ اس کا دل تو جیسے سرد اور بے جان ہو چکا تھا۔ پھر بھی وہ ایک عجیب در آگیں، لذت اور نشے کی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ جیسے باہر بڑی تیز بارش ہو رہی بڑا سخت پالا پڑ رہا ہو۔ اور وہ گرم شال میں لپٹی چولھے کے پاس بیٹھی ہوا ور سماوار میں پکنے پانے کی دھیمی دھیمی سسکار سُن رہی ہو۔

"تمھارا ہاتھ گرم ہے۔"

ریشم مسکرائی۔

"اور تمھارا بھی۔"

اور سلیم نے ریشم کا ہاتھ چُوم لیا اور ریشم کی رگوں میں گرم خون دوڑ گیا اور اس نے خلاؤں ہار میں چلنے والی ہواؤں کے نغمے اور پتھروں سے ٹکرا ٹکرا اچھل اچھل کر ناچ ناچ کر بہتے ہاڑی ندیوں کے چنچل گیت سُنے اور اس کی آنکھیں بند سی ہوگئیں اور جیسے اس کے اندر پھر ا ریک، گہرے اور کھوئے ہوئے غار میں سے آواز آئی۔

"میں ریشم ہوں۔ میں پہاڑوں پر دودھ بیچا کرتی تھی اور میرے کانوں میں چاندی کے جھُومر ہوتے تھے اور کمر کے گرد رسی بندھی ہوتی تھی اور بالوں میں سیب کے شگوفے ہوتے تھے۔ اور میں کہاں ہوں، کدھر ہوں؟ ..."

ریشم نے بے اختیاری ہو کر سلیم کا ہاتھ چوم لیا۔ اور بس کے انتظار میں کھڑے وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔

اور اب وہ دونوں ہر روز ملتے، کبھی ہسپتال میں، کبھی سینما گھر کے باہر اور کبھی کسی کیفے میں۔ چند ہی دنوں کے اندر اندر ان کی محبت کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ ریشم نے اپنے آپ کو محبت کے اس امڈتے ہوئے دھارے کے سپرد کر دیا تھا اور وہ خود بخود بہے جا رہی تھی۔ وہ جب کبھی سنجیدگی سے اس معاملے پر سوچنے بیٹھتی تو اس قدر پریشان ہو جاتی کہ اس کا دماغ پھٹنے والا ہو جاتا۔ وہ اپنے آپ کو اتنی بھیانک سوچ کے جنگل سے نکال کر لارنس کی چمکیلی دھوپ میں لے آتی اور راستے میں آنے والے ہر پھول کا منہ چوم کر پوچھتی۔

"تمہارا نام سلیم ہے کہ ریشم؟"

اور پھر خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

اسے سلیم سے دیوانگی کی حد تک محبت ہو گئی تھی۔ وہ رات اس کے بنا جانے کیسے کاٹتی تھی۔ سلیم جب بھی ریشم سے ملتا، اپنے ساتھ پھول ضرور لاتا۔ کسی وقت ریشم سوچتی، اگر سلیم کو علم ہو جائے کہ وہ راتیں کہاں بسر کرتی ہے اور اس کا تعلق پیشہ ور عورتوں کے ایک گروہ سے ہے تو پھر کیا ہو۔ کیا وہ اسے اسی طرح چاہتا رہے گا یا نفرت کرنا شروع کر دے گا۔ اور اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگ جائے گا۔ وہ ایسی باتوں سے خوف کھاتی تھی۔ اور گھبرا کر کچھ اور سوچنے لگتی تھی لیکن سلیم کا خیال اسے کچھ اور نہ سوچنے دیتا تھا۔ وہ جس سڑک پر بھی چلنا شروع کرتی۔ وہ آگے جا کر اسی چوراہے میں ختم ہوتی، جہاں سلیم ہاتھ میں نرگس کے پھول لیے کھڑا ہوتا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہوتا۔ اسے اپنے کام سے گھن سی آنے لگی تھی۔ وہ اپنی پونجی بھرے بازار میں چبوترے پر کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے لٹا رہی تھی۔ لیکن اب اسے اپنے نقصان کا کچھ کچھ احساس ہونے لگا تھا۔ اور اب وہ اپنی جیبوں کا منہ بند کر دینا چاہتی تھی۔ وہ کچھ بچا لینا

ہا ہتی تھی۔ کچھ اپنے لیے اور زیادہ کسی اور کے لیے۔ وہ جب بھی نکہت کی خبر لینے ہسپتال جاتی سے باتیں کرتے ہوئے اپنا آپ بڑا ہلکا اور گھٹیا محسوس ہوتا۔ جیسے وہ سڑکوں پر جھاڑو دینے الی مہترانی ہو اور بادشاہی مسجد کے منبر کے سامنے کھڑی ہو۔ نکہت کا گھر کتنا اچھا ہے اور اس کی ں اور محبت کرنے والا باپ اور بھائی اور بڑی بہنیں۔ اس گھر میں کس قدر اطمینان اور گہری ہری مسرت کا احساس تھا۔ وہ گھر تھا گھر... جہاں ایک باورچی خانہ ہوتا ہے۔ خاموش اموش کھڑکیاں ہوتی ہیں۔ جن پر جھکی جھکی ٹہنیوں کے سائے ہوتے ہیں اور جہاں شام کی چائے رختوں کے نیچے مرطوب چپ چاپ ہوا میں بیٹھ کر پی جاتی ہے۔ اور جہاں عورتیں ہوتی ہیں، سفید لوں اور مہربان آنکھوں والی بوڑھی عورتیں۔ جو شر بر بچوں کو تھپک تھپک کر سر شام سُلا یتی ہیں اور انھیں لوریاں سناتی ہیں، کہانیاں سناتی ہیں، پھر شہزادہ جادو کے گھوڑے پر بیٹھ کر پنی شہزادی کی تلاش میں روانہ ہوتا اور جنگل جنگل گزرتا...

ریشم کے لیے یہ گھر اور ان گھروں کے باورچی خانے اور جھکی جھکی ٹہنیوں والی پُرسکون ڑکیاں وہ شہزادیاں تھیں جنھیں خوفناک بھوتوں نے اپنے غاروں میں قید کر رکھا تھا اور وہ ادو کے گھوڑے پر بیٹھ کر ان شہزادیوں کی تلاش میں نکل جانا چاہتی تھی۔ جنگل جنگل صحرا صحرا ... مگر یہ جادو کا گھوڑا کہاں تھا۔ اے سفید بالوں والی مہربان ماؤ! تمھاری کہانیوں کے شہزادے جادو کے گھوڑے کہاں باندھتے ہیں؛ میں بپھرتے طوفانی سمندروں میں اپنے تمام جہاز ڈبو چکی ہوں اور لق و دق صحراؤں میں اپنے قافلے کی ساری ڈاچیاں اور ڈاچیوں کی ساری جھانجنیں ور ان کے تمام سُریلے گیت لٹا بیٹھی ہوں۔ اور میں تاریک گھاٹیوں میں راستے سے بھٹک گئی ں اور میرا ستر نوکیلی چٹانوں اور بھیانک کھڈوں سے بھرا ہوا ہے، سایہ دار ساحلوں پر بیٹھ سنہری پھولوں کے ہار پروتے والو! اپنی مددگار کشتیوں کو میری طرف روانہ کرو کہ میں ڈوب ی ہوں اور غضبناک موجیں مجھے خالی تونبی کی طرح اچھال رہی ہیں۔ باورچی خانوں میں بیٹھ کر ی روشنی میں، بچوں کو کہانیاں سنانے والی، شریف عورتو! اپنے لیمپ اونچے کر دو کہ میں تاریکی میں ستہ بھول گئی ہوں، کوئی کشتی، کوئی تختہ، کوئی لیمپ! روشنی! ... روشنی ... اے ماؤ! نو! بھائیو!!!

نکہت ہسپتال سے اچھی ہو کر گھر آگئی تھی۔

ریشم اس کو مل کر واپس آرہی تھی۔ وہ لارنس میں سے تیز تیز گزر رہی تھی، شام ہو چکی تھی اور اسے بہت جلد خان کے پاس پہنچنا تھا۔ جو آج اسے کسی خاص جگہ بھیجنا چاہتا تھا۔ ابھی وہ پہاڑی کے پاس ہی پہنچی تھی کہ سامنے سے سلیم آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ریکٹ تھا اور وہ اسے گھماتے ہوئے چلا آرہا تھا۔ ریشم اسے بلائے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے نقاب اٹھا لیا اور سلیم اسے دیکھ کر بڑی گرمجوشی سے چلّایا۔

"ارے کوثر! تم گھر گئی تھیں؟"

ریشم کچھ نہ بولی۔

"اور میں یہاں کھیلتا رہا۔ تم مجھے پہلے کیوں نہیں بتا دیا کرتیں۔"

سلیم کے انتہائی اصرار پر ریشم اس کے ساتھ پہاڑی کے اوپر ایک بنچ پر کچھ دیر کے لیے رک گئی۔ یہ بنچ سڑک سے بلند اور پرے ہٹ کر درختوں اور جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ شام سرد تھی اور ریشم اکٹھی سی ہو کر بیٹھی تھی۔ سلیم نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔

"کوثر! ایک دن مجھے بھلا تو نہیں دو گی؟"

ریشم صرف دیکھتی رہی سلیم کے بچوں ایسے معصوم چہرے کو۔۔۔!

"بولو کوثر! ایک دن مجھے بھلا تو نہیں دو گی؟"

ریشم نے بڑی خشک آواز میں آہستہ سے کہا۔

"نہیں۔۔۔۔"

اور سلیم نے اسے اپنی آغوش میں کھینچ لیا اور بچوں کی طرح اس کا منہ، گال، بال اور آنکھیں چومنے لگا۔ اس کے ہونٹ گرم ہو گئے اور اوپر پانی والے ٹینک کی طرف سے رات کی رانی کی خوشبو کا ایک جھونکا انھیں چھو کر گزر گیا۔

"میں تمھیں نہیں چھوڑ سکتا۔ تمھارے بغیر میں ایک پل نہ جی سکوں گا۔ میں تم سے شادی کروں گا۔ بہت جلد۔۔۔ اور پھر ہم دونوں اکٹھے رہیں گے اور خوب سیر کیا کریں گے۔ پھر ہمیں کوئی نہ ٹوکے گا، کیوں کوثر؟ ٹھیک ہے نا؟ ہیں۔۔۔؟"

ریشم اپنا چہرہ سلیم کے بازوؤں میں چھپائے کچھ خوش تھی۔ کچھ اداس تھی، کچھ سوچ بھی رہی تھی اور کچھ نہیں بھی سوچ رہی تھی۔ اس نے دیکھا وہ دلھن بنی ڈولی میں سوار، گہنوں میں لدی اپنے سسرال جا رہی ہے۔ باجوں کا شور مچ رہا تھا۔ گولے، پٹاخے اور پھل جھڑیاں چھوٹ رہی ہیں۔ اور اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ہیں اور اسے یقین نہیں آرہا کہ اس کا بیاہ ہو رہا ہے۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ کہ اچانک خان بزاخان پستول کے فائر کرتا اپنے آدمیوں سمیت نمودار ہوتا ہے، اور سب کو ہلاک کر کے، اسے اٹھا، گھوڑے پر سوار ہو، اپنے پیچھے دھول کے جھکڑ اڑاتا بھاگ جاتا ہے۔ وہ کانپ گئی۔

"کیوں کوثر؟"

سلیم نے اپنے ہونٹ ریشم کے چھلّے دار بالوں پر رکھ دیے۔

"بولو۔۔۔ مجھ سے شادی کرو گی نا؟"

"ہاں۔۔۔ ضرور، مجھے اب جانا چاہیے۔ امی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔"

خوشی سے سلیم کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے بے اختیار ہو کر ریشم کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ اور اچھلتا، کودتا، ریشم سے پہلے پہاڑی سے نیچے اتر گیا۔

کچھ دن اور گزر گئے، ایک روز وہ نکہت کے پاس ان کے گھر بیٹھی تھی۔ دونوں کمرے میں اکیلی تھیں اور نئی فلموں پر باتیں کر رہی تھیں۔ سلیم کا میچ تھا اور وہ صبح کا گیا ہوا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں سلیم کا ذکر آگیا۔ نکہت بولی۔

"روز بروز چالاک ہوتا جا رہا ہے، گھر میں سوائے ابا کے کسی کی نہیں سنتا۔"

ریشم کچھ یاد کر کے ہنس پڑی۔

"واقعی بہت چالاک ہو گیا ہے۔"

"بس ڈیڑھ سال باقی رہ گیا ہے۔ ولایت جائے گا تو سب چالاکیاں بھول جائیگا۔"

ریشم ایک دم سُن سی ہو گئی۔ ولایت جائیگا۔۔۔ کون جائے گا۔۔۔؟

"کون ولایت جائیگا؟"

"یہی سلّی صاحب۔ وہاں سب غیر ہوں گے نا۔ ایک بار تو نانی یاد آجائے گی بچّو جی کو۔"

ریشم خاموش ہوگئی۔ اس کے پاس کہنے کے لیے جیسے کچھ باقی نہ رہا ہو۔

"تم نہیں جانتیں کوثر! ابا میاں کی کتنی حسرت ہے کہ وہ سلیم کو ولایت میں پڑھائیں، وہ خود نہیں جاسکے لیکن سلّی کو ضرور بھیجنا چاہتے ہیں اور پھر ہمارا ایک ہی تو بھائی ہے۔ ذرا غور کرو، ۶ بہنوں کے بعد ایک بھائی۔ ہم نے تو اس کے لیے ایک رشتہ بھی ڈھونڈ رکھا ہے۔"

"کون ہے وہ؟" ریشم کی آواز جیسے کسی دبے ہوئے صندوق سے نکلی۔

"بڑی اچھی لڑکی ہے۔ بی۔ اے میں پڑھ رہی ہے۔ حیدرآباد میں اس کا باپ بیرسٹر ہے ہمارے رشتہ دار بھی ہیں، کبھی یہاں آئی تو ضرور ملواؤں گی۔ اب یہ گدھا جلدی جلدی ولایت ہو آئے تو ہم بھی اپنے چاؤ پورے کریں۔"

پھر پلٹ کر بولی۔

"سلّی کی شادی پر میں تمھیں شبنون کا جوڑا دوں گی۔"

ریشم مسکرائی۔

"وہ تو مجھے دینا چاہیئے۔"

"نہ بھئی میں اپنی سہیلیوں سے کچھ نہ لوں گی بلکہ انھیں خود تحفے دوں گی۔"

ریشم پر جیسے موت کا گہرا اور سنگین اطمینان طاری تھا۔ وہ ہنسنے لگی۔

"میں بھی ایک تحفہ دوں گی۔"

پھر وہاں چائے آگئی۔

اس رات ریشم ایک بڑے زمیندار کی بھدّی توند سے لگ کر بار بار روتی رہی اور اس نے اتنی شراب پی کہ اسے قے ہوگئی۔

دوسرے دن اس نے دوپہر کے بعد سلیم کو ٹینس کلب کے دروازے سے اپنے ساتھ لیا او[ر] خان بغرا خان والے فلیٹ میں آگئی۔ خان کا ملازم باہر بیٹھا پشاوری حُقّہ پی رہا تھا۔

"یہ کس کا مکان ہے کوثر؟"

"یہ میرا مکان ہے سلیم۔ تم بے فکر چلے آؤ۔"

کمرے میں پہنچ کر ریشم نے اسے صوفے پر بٹھلایا اور خود اس کی پٹی پر بیٹھ گئی اور عجیب

سی نگاہوں سے سلیم کو تکنے لگی۔ سلیم نے ریشم کے زانوؤں پر کہنی رکھ دی اور ریشم کو بڑی محبت سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کالر کے چاک میں لگا ہوا نرگس کا پھول نکالا اور اسے ریشم کے بالوں میں لگانے کے لیے آگے بڑھا۔ ریشم نے آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام کر پھول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"کیوں؟ لگانے کیوں نہیں دیا؟"

"تم ہی نے تو کہا تھا کہ میرے بال نرگس کے پھولوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔"

سلیم کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہنسنے لگا۔

"ہاں یاد آیا، کہا تھا، اور ٹھیک ہی تو کہا تھا۔"

ریشم کھلی کھڑکی سے باہر اسمبلی ہال کی پتھریلی عمارت کو دیکھنے لگی۔

"اگر ایسا نہ ہو سلیم تو پھر۔ ۔ ۔"

"تو پھر کیا؟"

"میرا مطلب ہے اگر میرے بال چھوٹی چھوٹی سپنولیاں ہوں جنھیں میں نے سر پہ لگا رکھا ہو تو پھر تم مجھ سے محبت کروگے؟"

"میں سمجھا نہیں کوثر۔"

ریشم سرد آہ بھر کر چپ ہوگئی۔ سلیم بے چین سا ہوگیا۔ ریشم اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی سلیم بھی اس کے ساتھ ہی اُٹھ آیا۔

"تم پریشان کیوں ہو کوثر؟ خدا کے لیے مجھ سے مت چھپاؤ۔"

ریشم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے اپنا زخمی ویران اور اداس چہرہ سلیم کی طرف اٹھا کر کہا۔

"میں تم سے شادی نہیں کرسکتی، سلیم!"

سلیم زیادہ پریشان ہوگیا۔

"لیکن کیوں ... لیکن کیوں؟ کیوں کوثر؟ میری اچھی کوثر"

وہ اس سے لپٹ گیا۔ ریشم نے اسے بڑی آہستگی سے پیچھے ہٹا دیا اور جیسے پھٹ پڑی۔

"میں تمھارے لائق نہیں ہوں سلیم! میں بڑی خراب لڑکی ہوں، بڑی خراب۔ تم کسی شریف لڑکی سے بیاہ رچانا سلیم! میرے سلیم! چھ بہنوں کے اکیلے بھائی سلیم! میں تمھارے لائق نہیں ہوں۔ میں بہت بُری ہوں۔ میں کنواری بھی نہیں، میری شادی بھی ہو چکی ہے۔ کئی شادیاں ہو چکی ہیں۔ کئی شادیاں ہو چکی ہیں۔۔۔"

سلیم پاگلوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو کوثر، تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ تم لیٹ جاؤ۔ پلنگ پر لیٹ جاؤ۔ تم ضرور بیمار ہو۔"

"ہاں سلیم! میں بیمار ہوں۔ مجھے بڑا خطرناک مرض ہے، اگر میں تمھارے گھر آ گئی تو یہ مرض تمھارے سارے خاندان، ساری نسل کو برباد کر دے گا۔"

"خدا کے لیے ہوش میں آؤ کوثر! کوثر! کوثر!!!"

"میں تمھیں کیسے سمجھاؤں سلیم! کہ میں تمھارے لائق نہیں ہوں۔ کاش یہ سب کچھ میں تمھیں اسی دن بتلا سکتی۔ جس دن تم نے میری جھولی میں نرگس کا پہلا پھول رکھا تھا۔ لیکن شاید ابھی کچھ روشنی باقی ہے، ابھی دن کا کچھ حصہ باقی ہے۔ ٹھہرو! میں تمھیں کسی اور طرح سے سمجھاتی ہوں۔"

ریشم نے ایک صندوق میں سے تصویروں کا سیاہ اَلبم نکالا اور اس میں سے کچھ تصویریں کھینچ کر سلیم کے ہاتھ میں دے دیں۔

"انھیں دیکھو سلیم! اور انھیں دیکھ کر شاید تمھیں مجھے دیکھنے کی ضرورت نہ رہے۔"

سلیم ایک عجیب کشمکش کے عالم میں تھا۔ وہ جلدی جلدی تصویریں دیکھنے لگا، وہ تصویریں ریشم کی تھیں، ان میں وہ کہیں کسی لمبی لمبی مونچھوں والے کی آغوش میں بیٹھی شراب پی رہی تھی اور کہیں کسی کے منہ میں سگریٹ کا دھواں ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک تصویر میں اس نے مرد انڈر ویئر اور انگیا پہن رکھی تھی اور صوفے پر نیم دراز اپنے ساتھی مرد کو شراب پلا رہی تھی، سلیم کے ہاتھ کانپنے لگے اور آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے آگے بڑھا اور لڑکھڑایا اور تصویریں فرش پر بکھر گئیں اور وہیں صوفے کے بازو پر بیٹھ گیا۔ جیب سے رومال نکال کر اس نے چہرے پر آیا ہوا پسینہ پونچھا۔ زمین پر گرا ہوا ریکٹ اٹھایا اور اپنی کوثر کو د

بغیر تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ ریشم بُت بنی کھڑی تھی۔ وہ سلیم کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ وہ کھڑکی کی طرف مڑی۔ اس کے ہاتھ سے نرگس کا پھول فرش پر گر پڑا۔ اس کا چہرہ اس قبرستان کی مانند تھا جو ویران ہو گیا ہو۔ جہاں کبھی کوئی اپنے پیاروں کو لے کر دفنانے نہ آیا ہو۔ اس نے جھک کر پھول اٹھا لیا اور اسے پاگلوں کی طرح دیوانہ وار اپنے سینے سے بھینچ لیا اور کھڑکی کے پردے میں منہ چھپا کر ساون بھادوں کی مانند رونے لگی۔ بے اختیار ہو کر رونے لگی۔ وہ روتی جاتی تھی اور نرگس کے اداس پھول کو تھپکتی جاتی تھی۔

"سو جا میرے لال سو جا!
ابھی گوالے دودھ لے کر نہیں آئے
ابھی راستوں پر اندھیرا ہے
سو جا میرے لال! سو جا۔۔۔"

مارچ اپریل کی رُت آئی۔

لارنس میں گیندا، کیسری اور چنبیلی کے پھول کھلے اور مُرجھا گئے۔ مئی آیا۔ املتاس کی ٹہنیوں پر زرد زرد پھولوں کے فانوس جگمگانے لگے۔ مئی گزر گیا اور سارے فانوس ایک ایک کر کے بجھ گئے اور ان کی چھوٹی چھوٹی بسنتی پتیاں سڑک پر، گھاس پر، فٹ پاتھ پر بکھر گئیں اور گرم ہواؤں کے خشک جھونکے انھیں اپنے ساتھ اڑا کر کہیں سے کہیں لے گئے۔ لاہور میں سب سے زیادہ دیر قیام کرنے والا موسم آگیا۔ پو پھٹتے ہی سورج نکل آتا اور آگ برسانا شروع کر دیتا، دس بجے کے بعد جیسے سورج کا دہکتا ہوا سُرخ سُرخ تھال سوا نیزے پر آجاتا۔ اور سڑکیں راہگیروں سے خالی خالی ہو کر ہانپنے لگتیں۔ جون نے جاتے جاتے لُو کے جھکّڑ چلا دیے۔ شام گئے تک بدن کو جُھلسا دینے والی گرم ہوا چلتی رہتی۔ دکانوں کے آگے چھڑکاؤ ہوتے تو زمین گرم گرم بھاپ چھوڑ دیتی، برف مہنگی ہوتے ہوتے نایاب ہو گئی۔ سارا جولائی پنکھے جھلتے، مچھر مارتے، پانی پیتے اور پسینہ بہاتے گزر گیا۔ اور برسات کی پہلی بارش میں لاہور کی پیاسی سڑکوں اور لارنس کے جُھلسے ہوئے درختوں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر غسل کیا۔ اس بھیگی ہوئی رُت میں عید آگئی اور پچھلی اور اس سے پچھلی عید کی طرح ریشم نے اس عید پر بھی نئے کپڑے پہنے اور نسرین کے ساتھ کیفے ریڈ سٹار میں بیٹھ کر خود سویاں پکائیں اور آنکھوں میں اپنے اپنے گھروں ... بھولے بسرے گھروں کی اشکبار یادوں کے دیپ جلائے، انھیں کھایا اور ایسے موقعوں پر یاد آجانے والے پیاروں کا ذکر چھیڑ دیا اور پچھلی سے پچھلی عید کی طرح کچھ دیر دونوں اداس اداس بیٹھی سگریٹ پیتی رہیں۔ عید کی شام کو

ان کے لیے بہت کام تھا۔ خان کے گروہ کی تمام لڑکیاں عید کی شام سے لے کر ڑو کی صبح تک بُک ہوتی تھیں۔ عید بھی گزر گئی۔ عید کا دوسرا دن بھی گزر گیا، تیسرے روز شالامار میں عورتوں کا میلہ تھا۔

ریشم اور نسرین دوپہر کے بعد میلہ دیکھنے شالامار چلی گئیں۔

دیکھتے دیکھتے میلا بھر گیا اور وہاں اس قدر رونق ہو گئی گویا وہ لاہور کا آخری میلہ ہو، شہر کے کونے کونے سے ہر طبقے کی عورتیں، لڑکیاں اور بچے بچیاں وہاں جمع تھیں، جدھر نگاہ اٹھتی تھی گوٹے لگے سُرخ، سبز، عنابی، کیسری اور قرمزی رنگ کے چمکدار آنچل ہی آنچل لہرا رہے تھے۔ لڑکیوں نے درختوں پر جھُولے ڈال رکھے تھے اور خوشی سے چیخ چیخ کر پینگ بڑھا رہی تھیں۔ باغ کی پتھریلی روشوں کے ساتھ ساتھ بوڑھی عورتوں نے دکانیں سجا رکھی تھیں۔ کہیں مہندی سُرمہ اور وسمہ بِک رہا تھا، کہیں کھلونے بِک رہے تھے تو کہیں رنگ برنگ چوڑیاں فروخت ہو رہی تھیں۔ فوارے اچھل رہے تھے۔ جھِلمل جھِلمل کرتی بن بیاہی لڑکیاں ٹولیوں کی شکل میں ایک دوسری سے چہلیں کرتیں۔ راہ میں ملنے والی ہر اکیلی لڑکی یا عورت پر کوئی نہ کوئی فقرہ چُست کرتیں روشوں پر سے گزر رہی تھیں۔ دوسرے تختے میں پنگوڑوں پر سیر ہو رہی تھی۔ ایک جگہ بارہ دری میں اسکول کی لڑکیاں قطار باندھے کھڑی تھیں اور ایک استانی بار بار عینک ٹھیک کرتے ہوئے انھیں میلے میں زیادہ اچھل کود مچانے اور سارا انتظام خراب کر دینے پر جھاڑ رہی تھیں۔ بہ ڈانسر لڑکیاں تھیں اور سفید اور سبز وردیوں میں تھیں۔ جگہ جگہ گلاب کے سُرخ اور پیازی پھولوں کے تختے مسکرا رہے تھے۔ ہر تختے کے اردگرد کوئی نہ کوئی موٹی بھدی سرکاری مالن مُنڈلا رہی تھی۔ اور پھولوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے والی شریر لڑکیوں کو تاڑ رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا جسے وہ بار بار اپنے کندھے پر رکھتی اور پھر اٹھا لیتی تھی، ایک آنہ تھیٹریکل کمپنیوں کے خیمے لگے تھے اور بانس کی مچانوں پر ہیجڑے چست زنانہ کپڑے پہنے، پاؤڈر سرخی تھوپے، ہاتھ ہلا ہلا کر ناچ رہے تھے اور گھٹیا فلمی گیت گا رہے تھے، ایک جگہ چھوٹی سی گاڑی پر خاموش فلم دکھائی جا رہی تھی۔ بڑے سے ٹین کے صندوق میں جا بجا سوراخ کر رکھے تھے جن کے ساتھ آنکھیں لگائے لڑکیاں فلم چلتے دیکھ رہی تھیں۔ اندر فلم بُری طرح کانپ رہی تھی، پردے پر

کبھی مِس گکو ڈانس کرنے لگتی اور کبھی دو تین گاڑیاں مخالف سمتوں سے بھاگتی ہوئی آتیں اور ایک دوسری سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتیں۔ لڑکیوں کی ہلکی ہلکی چیخیں نکل جاتیں۔ اس کے بعد پھر کوئی سادھو کھڑتالیں بجاتا گزر جاتا اور اس کے ساتھ ہی عربی لباس والے مجاہد تلواریں چلاتے دکھائی دیتے۔ گاڑی پر لاؤڈ سپیکر لگا تھا اور لتا منگیشکر بڑی اونچی آواز میں گا رہی تھی۔

ہا ہا ہا ... ہا

ٹھنڈی ہوائیں ...

زنانہ پولیس کی ادھیڑ عمر سپاہنیں نیلی چادریں اوڑھے کڑک مرغیوں کی مانند میلے میں ٹہل رہی تھیں اور کبھی اس ہوٹل میں چائے پی رہی تھیں تو کبھی اس دکان پر سے حلوہ چکھ رہی تھیں۔ فضاؤں میں دھاگوں کے بندھے ہوئے رنگین غبارے لہرا رہے تھے۔ جب کوئی غبارہ کسی بچی کے ہاتھ سے چھوٹ کر اوپر کو اٹھنا شروع ہو جاتا تو اک شور سا مچ جاتا۔ اور بچے زور زور سے تالیاں پیٹنے لگتے۔ اگر وہ غبارہ درخت کی ٹہنیوں میں اُلجھ جاتا۔ تو کوئی نہ کوئی مَن چلا لڑکا شلوار چڑھا کر پہلے ادھر اُدھر اپنی ماں یا بہن کی ٹوہ لگاتا۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ وہاں اسے روکنے والا کوئی نہیں تو وہ شاباش شاباش اور تالیوں کے شور میں یوں درخت پر چڑھنا شروع کر دیتا جیسے اوپر ہی اوپر چڑھتا جائے گا اور ساتویں آسمان کو چھُو لیگا۔

جب کسی عورت کا بچہ چلتے چلتے بغیر کسی وجہ کے زور زور سے رونا شروع کر دیتا تو پہلے وہ اسے بڑے پیار سے چپ کرانے کی کوشش کرتی۔ لیکن جب بچہ اور زور زور سے چلّانے لگتا تو وہ اسے "نابڑ توڑ" کوٹنا شروع کر دیتی اور اس کے باپ کو گالیاں دیتے ہوئے ساتھ ساتھ گھسیٹنے لگتی۔ کنواری لڑکیوں کے ایک جگہ پاؤں نہ ٹکتے تھے۔ وہ سبک رفتار قمریوں کی مانند بڑے ناز سے گردنیں اٹھائے یہاں وہاں ٹولیوں کی شکل میں ٹہل رہی تھیں اور ان کے نقرئی قہقہے کبھی یہاں کبھی وہاں گونج رہے تھے۔ چُنے ہوئے ریشمی دوپٹے ان کی گردنوں میں لٹکے ہوئے تھے۔ قسم قسم کے فیشن کے بنے ہوئے بالوں کی نمائش ہو رہی تھی۔

ریشم نسرین کے ساتھ سارا میلہ گھومی، انھوں نے بھی تقریباً ہر دکان پر سے کچھ نہ کچھ لے کر کھایا اور ہر ہوٹل میں بیٹھ کر چائے یا سوڈا لیمن پیا۔ اگر موسم ابر آلود نہ ہوتا تو گرمی کے مارے

میلہ منانے والیوں کا بُرا حال ہو جاتا۔ لیکن آسمان پہ ..... موسم گرما کے پھیکے اور بے رنگ سمان پر بھوری بھوری بدلیاں چھائی تھیں۔ اور بڑی فرحت بخش ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

ریشم ایک دکان پہ چُوڑیاں چڑھانے کے لیے رُک گئی۔ دکان پر بڑا رش تھا اور چُوڑیاں چڑھانے والی عورت کو سر کھجلانے کی فرصت نہ تھی۔ نسرین نے مشورہ دیا۔

"تھوڑی دیر بعد آئیں گے۔"

لیکن ریشم کا خیال تھا ابھی رش کم ہو جائے گا۔ چنانچہ جب ریشم کی باری آئی تو اس نے اپنے لیے نسواری اور عنابی رنگ پسند کیا۔ پہلا جوڑا بخیریت تمام پہنا دیا گیا، دوسرا جوڑا چڑھا کر کلائی کے پاس جا کر کڑک کی آواز کے ساتھ دونوں چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ اور ریشم کی کلائی پر سے خون نکل آیا۔ ریشم کے منہ سے سِی کی آواز نکل گئی۔ اور اس کی بائیں جانب کھڑی ایک لڑکی نے جلدی سے اپنے رومال سے ریشم کی کلائی پر سے خون کی بوندیں پونچھ دیں۔ ریشم نے مسکراتی ہوئی احسان مند نگاہوں سے اس لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی کا رنگ گورا تھا اور وہ خوبصورت تھی۔

"شکریہ"

"کوئی بات نہیں، مسلمان کا خون برابر ہوتا ہے۔"

وہ لڑکی سر پر آنچل درست کرتے ہوئے بولی۔ نسرین نے ٹافی کھاتے ہوئے جھک کر اس مسلمان لڑکی کو دیکھا اور پھر اسی طرح منہ لٹکا کر ٹافی چبانے اور ریشم کو چوڑیاں چڑھاتے دیکھنے لگی۔

آدھ گھنٹہ بعد ریشم اور نسرین ایک دکان میں کرسیوں پر بیٹھیں بڑی تیز خوشبو، اور سکرین والی آئس کریم کھا رہی تھیں کہ وہ مسلمان لڑکی اپنی سہیلیوں کے ساتھ اندر داخل ہوئی ریشم نے اس کی طرف اور اس نے ریشم کی طرف دیکھا۔ دونوں ذرا ذرا مسکرائیں، ریشم نے آئس کریم کی دعوت دی۔

"شکریہ!"

نسرین نے پھر اس لڑکی کو بڑی اچاٹ دلچسپی سے دیکھا اور آئس کریم کھاتی رہی۔ اُٹھتے

ہوئے ریشم پھر اس لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکرائی، ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور پیسے ادا کر کے نسرین کے ساتھ میلے میں گھومنے لگی۔

تیسرے یا چوتھے روز ریشم اکیلی تانگے میں بیٹھی نکلسن روڈ سے نکل کر میکلوڈ روڈ پر سے گزر رہی تھی کہ اس نے پھر اسی گوری اور خوبصورت لڑکی کو سٹیشن سے آنے والی بس میں دیکھا۔ وہ کھڑکی کے پاس نقاب الٹائے بیٹھی تھی۔ بس کی رفتار چوک میں آ کر مدھم ہو گئی تھی اور ریشم کے تانگے کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ ریشم نے جلدی سے نقاب الٹ دیا۔ انھوں نے ایک دوسری کو فوراً پہچان لیا۔ اور مسکرا کر ایک دوسری کو سلام کیا۔ بس گزر گئی اور ریشم دور تک اسے دیکھتی رہی اسے وہ لڑکی بڑی پیاری لگی تھی۔ اور وہ اسے دن میں ایک بار ضرور دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا گورا گورا رنگ، نازک سی گردن، مختصر سا ستواں ناک اور لمبی لمبی پلکوں والی، بھیگی بھیگی شربتی آنکھیں ..... ریشم نے بڑی مدت بعد ایک خوبصورت اور معصوم لڑکی کو دیکھا تھا اور اسے سیب کے شگوفے اور ترناری کی نیلی نیلی کلیاں اور چرواہنوں کے ادھورے گیت یاد آ گئے تھے، اور پھر اس لڑکی نے ریشم کا خون لپٹے رومال پہ لے کر اس کا دل ہمیشہ کے لیے موہ لیا تھا۔ وہ اس سے دوستی پیدا کرنا چاہتی تھی، وہ اسے اپنی پکی سہیلی بنانا چاہتی تھی۔ لیکن اس خوبصورت بھیگی بھیگی شربتی آنکھوں والی لڑکی کی بس میکلوڈ پہ کہیں ٹریفک میں گم ہو گئی تھی۔

دو ماہ بعد، اکتوبر کے آخر میں جب موسم گرما کافی حد تک رخصت ہو چکا تھا اور راتوں کو اچھی خاصی خنکی ہونے لگی تھی اور موسم بڑا خوشگوار رہنے لگا تھا۔ ریشم نے اس لڑکی کو پھر دیکھا ریشم ریگل سینما میں اردو فلم کا میٹنی شو دیکھنے آئی تھی۔ وہ ٹکٹ خرید کر ہال میں داخل ہونے لگی تو اس نے گیٹ کے پاس برآمدے میں اپنی میلے والی خوبصورت سہیلی کو دیکھا۔ ریشم نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ بھی ریشم کو دیکھتے ہی اس کی طرف لپکی، بالکل اتفاق، اور بغیر سوچے سمجھے وہ ایک لمحے کے لیے ایک دوسری سے لپٹ گئیں اور بعد میں خود ہی اپنی اس حرکت پر ہنسنے اور شرمانے لگیں۔ وہ اپنی چھوٹی بہن اور دو اپنی سہیلیوں کے ساتھ آئی تھی۔ اور ایک سہیلی کا انتظار کر رہی تھی۔ جو ریٹے گیٹ کے پاس بھنے ہوئے چلغوزے خریدنے رک گئی تھی۔ وہ لڑکی اپنی سہیلیوں سے ریشم کا تعارف کروانے لگی۔ ریشم نے اپنا نام فرخندہ بتایا اور اس لڑکی نے صنوبر۔ اور پھر وہ

سب ہنسنے اور صرف باتیں کرنے کی غرض سے باتیں کرنے لگیں۔

انٹرول میں ریشم نے تلے ہوئے آلوؤں کے تین چار لفافے خریدے اور صنوبر کے انکار کے باوجود اس نے لفافے اپنی نئی سہیلیوں میں زبردستی بانٹ دیے۔

"آپ بڑی زیادتی کر رہی ہیں۔" صنوبر نے بڑے تکلف سے کہا۔

ریشم کے دل میں محبت اور احترام کا طوفان سا امڈ آیا اور اس کا جی صنوبر سے بے اختیار لپٹ جانے کو چاہا۔ لیکن وہ اپنے جذبات کو دبا کر رہ گئی۔ اس کا چہرہ مسرت سے شگفتہ ہو رہا تھا۔

"پھر کیا ہوا بہن صنوبر! وہ اب میری بھی تو سہیلیاں ہیں۔"

ریشم نے صنوبر کو اب اچھی طرح دیکھا تھا۔ وہ واقعی بہت خوبصورت تھی اور محسوس ہوتا تھا کہ خدا نے اسے کسی خاص تہوار میں پیش کرنے کے لیے بڑی محبت سے بنایا تھا۔ اس کے اعضاء متناسب اور چہرے کے نقوش تیکھے تھے۔ بال سنہری اور دانتوں کی لڑیاں ہموار اور دودھ ایسی سپید تھیں۔ اس نے ذرا سا پاؤڈر بھی نہ لگا رکھا تھا مگر اس کے چہرے پر انتہائی دلفریب چمک دمک تھی۔ ہونٹ باریک اور قدرتی سرخ تھے۔ آواز بڑی نازک اور شرمیلی تھی۔ جب وہ بولتی تو یوں لگتا گویا کوئی کنواری لڑکی چینی کا ٹی سیٹ اٹھائے اکھڑے اکھڑے قدموں سے اپنے ہونے والے خاوند کے سامنے گزر رہی ہو۔

فلم دیکھنے کے بعد وہ اکٹھی ہال سے باہر نکلیں۔ فلم بڑی دردناک تھی۔ اور صنوبر کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بیچ میں کہیں ایک آدھ بار ضرور روئی تھی۔ ریشم نے سوچا۔ صنوبر روتے ہوئے کتنی افسردہ لگ رہی ہو گی اور اس کا چہرہ غمگین ہو کر کتنا خوبصورت ہو گیا ہو گا۔ کاش وہ اسے آنکھوں سے آنسو ڈھلکاتے دیکھ سکتی۔ پھر وہ خود ہی اس خواہش پر نادم سی ہو گئی، اسے اپنی پیاری سہیلی کے بارے میں ایسی غمگین باتیں نہیں سوچنا چاہئیں۔

بس سٹینڈ پر آ کر وہ بنچ پر بیٹھ گئیں اور بس کا انتظار کرنے لگیں۔

ریشم نے باتوں ہی باتوں میں صنوبر سے کہا

"میرا خیال تھا، شاید اُس دن کے بعد ہماری ملاقات کبھی نہ ہو گی۔"

”مجھے بھی کبھی کبھی ایسا ہی خیال آتا تھا لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔“

صنوبر مسکرائی اور دانتوں کی سفید لڑی کی ذرا سی جھلک دکھائی دی۔

”ہاں . . . خدا کو ہمیشہ کچھ اور ہی منظور ہوتا ہے۔“

اس پر وہ دونوں ہنس پڑیں۔

”اب آپ کسی روز ہمارے گھر آئیں، پھر بیٹھ کر خوب باتیں کریں گے۔“

ریشم بہت خوش ہوئی لیکن جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔ صنوبر کہنے لگی۔

”پرسوں ٹھیک رہے گا۔ پرسوں اتوار ہے، مجھے سکول سے چھٹی ہوگی۔ بس پرسوں آپ صبح ہی آجائیں۔ دوپہر کا کھانا مل کر کھائیں گے اور سارا دن اکٹھے گزاریں گے۔“

”میں آپ کو اتنی تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ میں . . . .“

صنوبر جیسے جھوٹ موٹ بُرا مان گئی۔

دیکھو بھئی ایسی باتیں نہ کریں۔ ہمارا گھر کوئی غیر کا گھر نہیں۔ وہ بھی آپ کا گھر ہے، اچھا چلو، اگلی اتوار میں آپ کے گھر آجاؤں گی۔“

ریشم کانپ سی گئی۔ میرے گھر؟ میرے گھر آئیں گی؟ ہاں! صنوبر اگلی اتوار ریشم کے گھر جائے گی اور خان بغرا خان سے مل کر بہت خوش ہوگی۔ اس کے فلیٹ میں بیٹھ کر اس کے ملازم کا پشاوری حُقّہ، شراب اور سگریٹ پیئے گی اور پھر ریشم کی پرائیویٹ تصویریں دیکھے گی، اور خان بغرا خان کو فحش گالیاں بکتے سُنے گی . . . آہاہا! ریشم کا گھر کتنا اچھا ہے۔ ریشم کا گھر کتنا خوبصورت ہے۔

ہوم . . . سویٹ ہوم! ریشم کے سویٹ ہوم! نسرین، شہناز اور شمشاد کے سویٹ ہوم! گامی کوچوان اور چاچی سیداں اور وداراں کے سویٹ ہوم!

”نہیں نہیں، میں ضرور آؤں گی۔ میں اتوار کو ضرور آؤں گی۔“

ریشم کے منہ سے اپنے آپ نکل گیا اور وہ صنوبر سے اس کے گھر کا پتا سمجھنے لگی۔ پھر بس آگئی اور وہ سب اس میں سوار ہو کر چل دیں۔ ریشم میکلوڈ روڈ کے چوک میں اتر گئی۔ صنوبر نے اس سے پکا وعدہ لے لیا تھا کہ وہ اتوار کو ان کے گھر ضرور آئے گی۔

صنوبر کا مکان فلیمنگ روڈ کی ایک گلی میں تھا۔

یہ گلی ٹھنڈی اور مرطوب تھی اور تھوڑی دور جا کر بند ہو گئی تھی۔ ریشم کو اس گلی میں داخل ہوتے ہی سردی سی محسوس ہونے لگی جیسے وہ کسی ایک منزلہ مکان کے غسل خانے میں آگئی ہو۔ صنوبر نے بالکل واضح نشان بتائے تھے اور ریشم نے بہت جلد گلی میں داخل ہو کر بجلی کے دوسرے کھمبے والے مکان کے نیچے ایک پل کے لیے رک کر دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ اوپر سے کوئی آواز نہ آئی۔ دوسری دستک پر اوپر کھڑکی میں سے کسی نے جھانک کر دیکھا۔ یہ صنوبر کی چھوٹی بہن یاسمین تھی۔ یاسمین کی شکل اپنی بڑی بہن سے کافی ملتی تھی۔ اور کسی وقت اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا گویا صنوبر کو کسی جادو کے زور سے چھوٹا کر دیا گیا ہو۔ وہ چق چھوڑ کر جلدی سے بھاگی۔

”آپی! . . . . باجی فرخندہ آئی ہیں۔“

ریشم نے گلی میں کھڑے کھڑے یاسمین کی آواز سُنی جو ایک کمرے سے نکل کر کسی دوسرے کمرے میں جا کر ڈوب گئی۔ ریشم سیڑھیوں میں جا کر کھڑی ہو گئی، جہاں نچلے دیوان خانے کا دروازہ بند تھا اور ڈیوڑھی میں دو پرانی سائیکلیں پانی کے نل کے ساتھ زنجیر سے بندھی تھیں۔

صنوبر بڑی تیزی سے سیڑھیاں اتر کر اس کے پاس آئی۔

”میں تو صبح سے انتظار کر رہی تھی۔ امی کہنے لگیں کہ تمھاری سہیلی نہیں آئے گی میں نے کہا دیکھ لینا وہ ضرور آئے گی۔“

صنوبر نے ریشم کا بازو تھاما۔ اور بڑی خوشی خوشی اسے اپنے ساتھ اوپر لے گئی، اوپر دروازے میں یاسمین کھڑی تھی۔ اس نے ہلکے انگوری رنگ کا میچنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور بالوں میں ایک طرف سبز ربن بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ اس نے ریشم کو سلام کیا۔ اور بھاگ کر اندر امی کے پاس چلی گئی۔

ریشم، صنوبر کی سرخ و سپید بارعب چہرے والی امی سے مل کر بہت خوش ہوئی اور بڑے ادب سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ریشم بڑے سادہ لباس میں تھی اور اس کے چہرے پر کوئی پاؤڈر یا سرخی وغیرہ نہ تھی۔ وہ بڑے شریفانہ سیدھے سادے لباس میں صنوبر کی امی سے ملنا چاہتی تھی۔ صنوبر کی امی پُرانی کشمیری عورت تھی۔ جس کی صحت اس عمر میں بھی قابلِ رشک تھی، اس کا بولنے

کا لب ولہجہ پنجاب میں آباد کشمیر کی بزرگ عورتوں ایسا تھا اور یوں لگتا گویا وہ کشمیری میں پنجابی ب
رہی ہو۔ اس کا جسم بھاری بھرکم تھا۔ کھڑکی کے پاس ایک تخت تھا جس پر قالین کا پرانا ٹکڑ
بچھا ہوا تھا۔ صنوبر کی ماں اس تخت پر بیٹھی چاندی کی موٹھ والا حقّہ پی رہی تھی اور صنوبر ا
اس کی سہیلی کو باتیں کرتے دیکھ دیکھ کے خوش ہو رہی تھی۔ یاسمین نے جلدی سے اخروٹ
بادام، چلغوزے اور پستہ سے بھری ہوئی پلیٹ لا کر ان کے درمیان میں رکھ دی۔ صنوبر
ماں بولی۔

"بلائی لگانس! سمادا گرم کرتاں!"

صنوبر، ریشم کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگی اور دبی زبان میں سر جھکا کر بولی۔

"امی کو نمکین چائے سے عشق ہے۔"

ریشم نے کہا۔

"وہ تو مجھے بھی پسند ہے۔"

صنوبر نے چھوٹی سی ناک سکیڑ لی۔

"مجھے نہیں اچھی لگتی۔" اور پھر سانس لمبا کر کے بولی۔

"پر اب تو پینی ہی پڑے گی۔"

صنوبر نے آج بال دھو رکھے تھے اور آنکھوں میں سُرمے کی باریک لکیر سی کھینچ رکھ
وہ پہلے سے بے انتہا خوبصورت لگ رہی تھی۔ چہرے کی گوری جلد صاف اور چمکیلی تھی ا
کپڑوں سے حنا کی میٹھی میٹھی مہک اٹھ رہی تھی۔ کمرے میں بہت زیادہ سامان ٹھنسا ہوا تھا
کی الماری، چینی کے برتنوں کی الماری، چمڑے کے صندوق، اخروٹ کی لکڑی کی میزیں
جالی، دو پلنگ، لکھنے کی ٹیبل، صنوبر کے والد اور بھائیوں کی دیواروں سے ٹنگی ہوئی تصوی
... دوسرے کمرے کا پردہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا اور وہاں بھی تقریباً سامان کی اسی طرح بھرمار
کونے میں ریڈیو، جالی دار سبز غلاف میں ڈھکا پڑا تھا۔ کارنس پر سینکڑوں قسم کی چینی
ہاتھی دانت کی چھوٹی بڑی الّم غلّم چیزیں جمع کر رکھی تھیں۔ کارنس کے اوپر دیوار سے ملے
والا پرانی طرز کا کلاک ٹِک ٹِک کی آواز کے ساتھ چل رہا تھا۔ سبز کشمیری چائے پینے کے بع

صنوبر کے گھر کا باورچی خانہ دیکھا جو کافی کھلا اور کھانے پینے کی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ کہیں سوکھی مولیوں کے ہار لٹک رہے تھے اور کہیں نعمت خانے کے اوپر جام اور مربّوں کے مرتبان قطاریں باندھے کھڑے تھے، ان کا کم عمر کشمیری نوکر، جس کا سر گنجا اور آنکھیں موٹی موٹی تھیں، بڑی سی پرات میں چیرے ہوئے شلغموں کے قتلے ڈالے انھیں ٹھنڈے پانی سے دھو رہا تھا، چولھے پر بڑے سے دیگچے میں گوشت بھونا جا رہا تھا۔

"ارے اتنی آگ کیوں دے رہے ہو؟"

یاسمین نے چولھے میں سے کچھ لکڑیاں باہر کھینچ دیں۔

اس کے بعد صنوبر ریشم کو لے کر گلی والے دیوان خانے میں آگئی۔ یہ دیوان خانہ اوپر والے کمرے کی نسبت زیادہ خنک تھا۔ اور یہاں ہر چیز میں بے ڈھنگا پن نہیں بلکہ سلیقہ اور سادگی تھی۔ زمین پر قالین بچھا تھا اور خاکی رنگ کے صوفے ذرا فاصلے پر پڑے تھے، درمیان میں چھوٹے قد کی گول میز تھی، جس پر ہاتھی دانت کا راکھ دان رکھا تھا۔ کارنس پر پیتل کے دو پھولدان تھے جو خالی تھے اور دیوار پر کلاک کی بجائے قائداعظم کی سیاہ چوکھٹے والی تصویر آویزاں تھی۔

ریشم کو خنکی محسوس ہونے کے باوجود یہ کمرہ زیادہ پسند آیا۔ چنانچہ اس نے صنوبر کے ساتھ دوپہر کا کھانا اور سہ پہر کی چائے بھی اسی دیوان خانے میں پی۔ چائے پر صنوبر نے اپنی دو ایک محلے دار سہیلیوں کو بھی بلا لیا تھا۔ جو اس دعوت پر بیحد خوش دکھائی دے رہی تھیں اور بار بار چائے کی تعریف اور سردی کی شکایت کر رہی تھیں۔ صنوبر نے ریشم کی اتنی خاطر مدارات کی کہ وہ اس کی گرویدہ ہوگئی۔ اور روز روز وہاں جاتے ہوئے اسے شرم سی محسوس ہونے لگی۔ اس کے باوجود وہ صنوبر کی زیادہ دن کی جدائی برداشت نہ کر سکتی اور تیسرے چوتھے روز فلیمنگ روڈ کی اس ٹھنڈی اور مرطوب گلی میں جا نکلتی اور صنوبر کے گھر کے پُرسلیقہ اور پیتل کے پھولدانوں والے پُرسکون دیوان خانے میں بیٹھی گہری گہری شربتی آنکھوں والی خوبصورت سہیلی سے دیر تک باتیں کرنے کے بعد مطمئن سی ہو کر واپس چلی آتی۔ صنوبر کو بھی ریشم سے بڑا پیار ہوگیا۔ وہ اور اس کی چھوٹی بہن یاسمین دونوں اس سے محبت کرنے لگی تھیں۔ ریشم نے انھیں بتایا تھا کہ ان کے مکان کی الاٹ منٹ کا جھگڑا چل رہا ہے۔ اس کی ماں لائل پور میں اس کے بڑے بھائی کے پاس ہے اور وہ یہاں اپنی

پھوپھی کے ہاں رہ رہی ہے اور ان کا مکان شہر کے اندر بھنچی ہوئی تنگ تنگ سی گلیوں میں ہے صنوبر نے کہا تھا۔

"تم ہمارے گھر آجاؤ فرخندہ! میں تمھاری پھوپھی سے اجازت لے لوں گی۔ پھر ہم اکٹھے رہیں گے اور تم میرے پلنگ پر سویا کرنا اور جب تمھارے مکان کا فیصلہ ہو جائے گا تو واپس اپنے گھر چلے جانا۔"

ریشم نے اس پر بہت سی مجبوریوں کا اظہار کیا تھا، جسے صنوبر نہیں جانتی تھی، مگر وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

فروری گزر رہا تھا۔ درختوں پر ہری ہری تازہ کونپلیں پھوٹ رہی تھیں اور لارنس میں چنبیلی گیندا اور کیسر پھول رہے تھے کہ صنوبر کی ایک قریبی رشتہ دار کا بیاہ آگیا۔ جس روز مہندی کی رسم تھی، صنوبر، ریشم کو بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ شادی والے گھر میں بڑی رونق اور چہل پہل تھی۔ دُلہن گول مول گوری گوری سی تھی اور دو روز سے مانجھے بڑے بڑے مزے سے اپنی سہیلیوں میں بیٹھی فرنی کی بڑی پلیٹ کھا رہی تھی اور ان کے تیز تیز مذاق کا شرما کر، مسکرا کر جواب دے رہی تھی۔ ریشم صنوبر کے ساتھ نچلے کمرے میں قالین پر پشمینے کی نسواری گرم چادر لیے بیٹھی تھی۔ اس روز موسم ابر آلود تھا اور سردی ہو گئی تھی۔ چنانچہ کمرے کی تمام کھڑکیاں بند تھیں، وسط میں دلہن کی رشتہ دار بہنیں اور محلے کی چند ایک لڑکیاں بیٹھی ڈھولک بجا رہی تھیں۔ یاسمین اپنی الماریوں کی چابی سے ڈھولک پر تال دے رہی تھی۔

"ٹھپ، ٹھپ، ٹھپ، ٹھپ.... !"

وہ اپنی آپی اور باجی ریشم کی طرف دیکھ دیکھ کے شرما بھی رہی تھی۔ اور گا بھی رہی تھی۔ اس کی آواز بڑی شرمیلی اور باریک تھی۔

ہن باجرے بھورے نی!

دل آ وطناں نوں

ہن وعدے پورے نی

.... کہ کھیت بھورے ہو گئے ہیں۔

میرے پردیسی گھر آجا

اب وعدے پورے کرنے کا وقت آگیا ہے۔

ریشم کے کان فلمی گیت سن سن کر پک گئے تھے اسے جہاں بھی کسی گیت کی آہٹ سنائی دی سی نہ کسی تازہ یا پرانی فلم کا گیت ہوتا۔ آج ایک طویل مدت کے بعد وہ پہلی بار زمین کا گیت ن رہی تھی۔ کھیت کا گیت سن رہی تھی، باجرے کے کھیت میں سے گزرتی ہوئی گندمی چہرے والی وں کی کنواری لڑکی کا گیت سن رہی تھیں، اس گیت میں جسم کی پکار رہی نہیں، دل کی دھڑکنیں بھی یں۔ اور یہ بھورے بھورے سنہری باجرے کے کھیت کا گیت تھا، جو چاندنی راتوں ، چرخہ کاتتے ہوئے چکر کھاتی مال کی موسیقی پر گائے جاتے ہیں۔ ریشم کے سینے میں بھی ایسے ں گیت دفن تھے جن کی ویران ڈھیریوں پر شہر کی سڑکوں کی گرد اڑ رہی تھی۔ یہ سارے گیت ایک ب کر کے بیدار ہو رہے تھے۔ جاگ رہے تھے۔ برسوں کی مندی ہوئی آنکھیں کھول رہے تھے ب گیت، ایک پھول اس کے ہونٹوں پر آکر جھک گیا اور اس نے صنوبر کی طرف مسرت سے لتا ہوا چہرہ اٹھا کر کہا۔

"میں بھی گاؤں صنوبر!"

صنوبر پہلے تو حیران سی رہ گئی اور پھر فوراً بولی۔

"ضرور، ضرور... اری سنو! فرخندہ بھی گانا سنائے گی۔"

یاسمین جیسے خوشی سے اچھل پڑی اور جلدی سے پرے ہٹ کر بیٹھ گئی اور دوسرے لمحے یشم چابی سے ڈھولک کی سطح پر تال دے رہی تھی اور سر جھکائے خواب ایسی دھندلی واز میں گا رہی تھی۔

چھمکاں نے بوڑدیاں

ادھ وچ نہ چھوڑیں

اساں لائیاں توڑدیاں

سب لڑکیاں اپنے بھولے بھالے، پیارے پیارے چہرے اٹھائے ہمہ تن گوش ہو کر پرانے بڑ کی چھمکوں والا گیت سن رہی تھیں اور زرد چہرے اور اداس پیشانی والی ریشم کو تک رہی

تھیں جس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔ ہماری بہن صنوبر کی اداس سہیلی! تیرے ماتھے پر یہ کونسا سورج غروب ہو کر اپنی افسردہ زردی چھوڑ گیا ہے؟ تیری مانگ میں یہ کس رات بھر جلنے والے الاؤ کی راکھ اڑ رہی ہے اور تیری آواز میں یہ کونسے گزر جانے والے قدموں کی تھکی ہوئی چاپ ہے۔؟ تیری آنکھوں میں یہ کن گزری صبحوں کی شبنم تھرتھرا رہی ہے اور تیرے گیتوں کی سیج پر یہ سارے پھول کیسے مُرجھا گئے۔ سہیلی! تو اتنی غمگین کیوں ہے؟ اتنی آزردہ کیوں ہے؟ اب تو باجرے کے کھیت بھورے ہو گئے ہیں اور وطن کو لوٹنے کی رُت آگئی ہے۔

ہُن باجرے بھورے نی ...... ہُن باجرے بھورے نی

کچھ دیر کے لیے وہاں نمکین چائے اور باقرخانیوں کا دَور چلا۔ یاسمین اوپر تلے دو باقرخانیاں کھا گئی اور بار بار چائے کے لیے پکارنے لگی۔ صنوبر ریشم کو لے کر دوسرے کمرے میں آگئی۔ وہ ریشم کو دلہن کے جوڑے اور زیور دکھانا چاہتی تھی۔ اس کمرے میں صنوبر کے علاوہ دلہن کی خالہ اور خالہ زاد بہن بھی تھیں۔ وہ ریشم کو مخملی ڈبے کھول کھول کر زیور اور بیش قیمت بھاری جوڑے دکھا رہی تھیں۔ اور ریشم اس لڑکی پر رشک کر رہی تھی۔ جیسے یہ سب کچھ تھوڑے دنوں بعد ملنے والا تھا۔ بے خیالی اور بڑے معمولی انداز میں ریشم کی نگاہ سنگار میز پہ فریم میں جڑی ہوئی ایک درمیانے سائز کی تصویر پر پڑ گئی۔ جس میں ایک نوجوان کا بڑا سا چہرہ آگے کو جھکا ان سب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ریشم نے کوئی خیال نہ کیا اور دلہن کا جہیز دیکھنے لگی۔ پھر اچانک ...... بالکل اچانک اس کی آنکھیں کچھ سوچ کر سکڑ گئیں۔ اور اس نے گردن گھما کر ڈرتے ڈرتے سنگار میز کی جانب دیکھا۔

ہاں! وہی ...... بالکل وہی ...... وہی بال ... وہی آنکھیں، وہی ہونٹ ...... وہی ناک ...... وہی مسکراہٹ۔ سب کچھ وہی۔ لیکن وہاں کیسے؟ وہاں کیسے؟ ریشم کے دماغ میں جیسے کئی ریل گاڑیاں چیختی چلاتی، ایک ساتھ گزرنے لگیں۔

"یہ شیفون ہے۔ یہ ہملٹن ہے۔ یہ پیلش ہے اور کم خواب اور..."

اے صنوبر! اس کی خالہ اور اس کی خالہ زاد بہن کی آوازیں بڑی دور سے آتی محسوس ہو رہی تھیں، اسے ایک دم چکر سا آگیا اور وہ گرتے گرتے پلنگ کے بازو کو پکڑ کر سنبھل گئی پھر جیسے نیم بیہوشی کے عالم میں اس نے صنوبر کو کہتے سُنا۔

"یہ دُلہن کی بڑی بہن کے خاوند کی تصویر ہے، پہلے وہ ڈھاکے میں تھا اور آج کل کراچی میں ہے اور شاید کل یا پرسوں آئے گا۔"

ہاں! آج کل وہ کراچی میں ہے، اس سے پہلے ڈھاکہ میں تھا اور اس سے بھی پہلے وہ چمبہ گلی میں پنج ناگ میں تھا اور کبھی اخروٹ اور چنار کے درختوں میں چھپ کر بہنے والی باؤلی پر بھی تھا مگر وہ یہاں کیوں ہے؟ صنوبر کپڑے تہہ کر کے صندوق میں دوبارہ رکھ رہی تھی۔ ان کنواریوں کے جھرمٹ میں کیوں ہے؟ ان معصوم آنکھوں والی ہرنیوں کی وادی میں کیوں ہے؟ صنوبر کپڑے تہہ کر کے صندوق میں دوبارہ رکھ رہی تھی۔ ریشم کسی سے کچھ کہے بغیر چپکے سے دروازہ کھول کر باہر دالان میں آگئی باہر سردی تھی اور بڑا اندھیرا تھا اور ہلکا ہلکا مینہ پڑ رہا تھا۔ ریشم گیلی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنا منہ اوپر اٹھا لیا۔ آسمان کی طرف اٹھا لیا اور مینہ کی چھوٹی چھوٹی بوندیں اس کے ماتھے اور گالوں کو چومنے لگیں۔ آسمان سیاہ بادلوں میں چھپا ہوا تھا اور سرد ہوا چل رہی تھی اور دالان میں اندھیرا تھا اور اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور خشک آنکھوں میں پلکیں تھرتھرا رہی تھیں اور وہ سسکیاں بھر رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ تھا، کوئی نغمہ نہ تھا، کوئی گیت نہ تھا، کوئی پھول نہ تھا۔

ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔

بند کمرے سے یاسمین کی پتلی آواز آ رہی تھی۔

ہُن باجرے بھورے نی!

ہُن باجرے بھورے نی!

ریشم کیفے ریڈ سٹار میں مینجر کے کمرے میں تھی۔

سارا دن بادل چھائے رہے تھے اور تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد بوندا باندی ہوتی رہی تھی اور شہر کی سڑکوں، کیفوں، ہوٹلوں اور باغوں میں دیوانہ وار گھومتی رہی اور شام ہوتے ریڈ سٹار کیفے میں آ گئی تھی۔ دن بھر اس نے سوائے کافی کے اور کچھ نہ پیا تھا۔ اس کا سر درد کر رہا تھا اور سردی لگ رہی تھی اور وہ دروازہ اندر سے بند کر کے بے جان بُت کی طرح کرسی پر بیٹھی تھی، کمرے کی بتی خراب تھی۔ نوکر میز پر نئی موم بتی روشن کر گیا تھا۔ موم بتی کے پاس ہی میز پر سیاہ راکھ دان میں بجھا ہوا سگریٹ پڑا تھا، ریشم نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں اور ان میں کوئی موم بتی روشن نہ تھی، کوئی پھول نہ مہک رہا تھا، کیفے ریڈ سٹار کا وہ بند کمرہ ایک بہت بڑا راکھ دان تھا جس میں ریشم بجھے ہوئے سگریٹ کی مانند پڑی تھی۔

اور راکھ دان میں بجھا ہوا سگریٹ چپ چاپ جلنے والی موم بتی کو ایک کہانی سنا رہا تھا۔۔۔

بہت دنوں کا ذکر ہے پہاڑوں پر ایک گوالن رہتی تھی۔ اس گوالن کو گاؤں والے ریشی کہہ کر پکارتے تھے۔ ریشی بڑی خوبصورت تھی، اس کے بال ریشم تھے اور گال ٹیٹنگ کے گلابی شگوفے۔۔۔ ریشی منہ اندھیرے اٹھ کر قصبے میں اوپر دودھ بیچنے جایا کرتی تھی۔ اور واپس آ کر چھڑی ہاتھ میں لیے ڈھور چرایا کرتی۔ دودھ بلویا کرتی، سہیلیوں کے ساتھ کھیتوں سے بھٹے چُرا کر لاتی اور پھر چھپ چھپ کر انھیں بھُونتی اور جہاں چناروں کے درخت تھے اور ترناری کی جھاڑیوں میں باؤلی کا پانی گہری نیندیں سویا رہتا تھا۔ وہ کپڑے دھوتی، جانوروں کو پانی پلاتی، خود پیتی اور پھر

انھیں ہنکاتی گھر لے آتی۔ کہتے ہیں، ان پہاڑوں میں چمبہ کلی کی بیل بہت ہوتی تھی۔ جب کوئی گوالن دلہن بنا کر سجائی جاتی تو چمبہ کلی کے پھولوں کے ہار اس کے گلے میں ڈالے جاتے، گجرے اور بازو بند پہنائے جاتے، شہنائیاں اور ڈھول بجتے اور گوالنیں پُرپیچ راستوں پر سے گزرتی ہوئی ڈولی کو دیکھتی رہ جاتیں، ایک دن کیا ہوا کہ ایک شہری نوجوان اپنی خچر کو پانی پلانے اس باؤلی پر آیا، جہاں چناروں کے جھنڈ تھے۔ اور ترناری کی نیلے نیلے پھولوں والی جھاڑیاں تھیں اور ریشی تھی۔ چمکیلی آنکھوں اور ریشمی بالوں والی ریشی۔۔۔!"

موم بتی کا نازک شعلہ لرزا۔

پھر۔۔۔؟

پھر ریشم نے اپنی ہتھیلیوں پر سے سر اٹھا کر آنکھیں کھول دیں اور موم بتی کے زرد شعلے کو دیکھا۔ بجھنا نہیں میری سہیلی! ابھی تیری ضرورت ہے، ابھی بڑا اندھیرا ہے، تم نے وہ گیت سنا ہے؟ وہ لوری سُنی ہے؟

ابھی راستوں پر اندھیرا ہے
ابھی گوالے دودھ لے کر نہیں آئے
ابھی پھولوں نے اپنی آنکھیں نہیں کھولیں۔

— — — ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ابھی نہ بجھنا سہیلی! ابھی نہ بجھنا۔۔۔!

راکھ دان میں بجھا ہوا سگریٹ خاموش ہو گیا اور باہر مال پر بادل بڑی دھیمی آواز میں گرجا اور ٹپ ٹپ ٹپ، بارش شروع ہو گئی اور درختوں کی شاخوں میں چھپے ہوئے پرندوں نے اپنے پر سمیٹ لیے۔

ریشم کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور وہ فرخندہ، کوثر، نسرین، خان بغرا خان، اس کے فلیٹ اور بھرے ہوئے پستول کو وہیں چھوڑ باہر ٹھنڈی ہوا اور گرتی بارش میں نکل گئی اور فرخندہ نے اس کا آنچل پکڑنا چاہا اور کوثر اسے آوازیں دیتی رہ گئی۔ ریشم! ریشم! اتنی سردی میں، اتنی بارش میں کہاں جا رہی ہو۔ راہ میں تاریک جنگل ہیں اور دلدلوں سے بھرے ہوئے اندھیرے جوہڑ ہیں

اور غضب ناک موجوں والے دریا ہیں۔ اور پہاڑ ہیں اور تو اکیلی ہے۔ ہمیں بھی ساتھ لیتی چلو۔ تیرا برقع یہیں رہ گیا ہے اور گرم چادر بھی یہیں رہ گئی ہے۔ ریشم! ریشم! . . . لیکن ریشم تک کوئی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ کوئی صدا نہیں آ رہی تھی، اس کے کانوں میں پہاڑوں پر سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی ہوئی چٹانوں کا شور ہے۔ اور تاریک کھنڈروں میں چیختی آندھیوں کی المناک فریادیں ہیں۔ اس کا رنگ فق ہے، آنکھیں کھلی ہیں اور ہاتھ خالی ہیں اور آنچل تیز ہوا میں اڑ رہا ہے اور وہ بارش میں بھیگ گئی ہے اور آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہے اور گاڑی سٹیشن پر سٹیشن پیچھے چھوڑتی طوفانی رات میں بھاگی جا رہی ہے اور اب چک جمیر کا سٹیشن آ گیا ہے گاڑی رک گئی ہے، ریشم قاضی پور جانے والی سڑک پر آ گئی ہے۔ بادل زور سے گرجا ہے اور دور بینج ناگ کی پہاڑیوں میں اس کی ہیبت ناک گونج ابھی تک سنائی دے رہی ہے۔

یہ قاضی پور ہے۔ بارش میں قصبہ سنسان ہے۔ بازار بھیگ رہے ہیں، لوگ بند کوٹھڑیوں میں سو رہے ہیں، اڈے میں کھڑی کسی موٹر کے نیچے چھپا ہوا کتا رو رہا ہے، اوپر سے آنے والی برفانی ہواؤں میں دکانوں کے ٹپکتے ہوئے چھپر کھٹ کانپ رہے ہیں، ریشم بینج ناگ جانے والی چڑھائی چڑھنے لگی ہے۔ پھر راستے میں ایک جگہ بہت بڑی چٹان کھڑی ہے۔ ریشم وہاں سے گزرنے لگتی ہے۔ سامنے ایک گنجان درخت کے نیچے چھپر کھٹ تلے چھوٹا سا الاؤ روشن ہے۔

"لوٹتی مرتبہ بھی ملتی جانا بیٹیا۔ عبداللہ کی ماں آ گئی ہو گی۔ پھر وہ تمھیں بہت کچھ پکا کر کھلائے گی. . . . ہوں؛ اور بھٹے بھی دے گی!"

"ضرور ملوں گی بابا!"

"میں آ گئی ہوں بابا! میں تجھ سے ملنے آئی ہوں۔ میں بہت سے بھٹے لینے آئی ہوں۔ میرے بابا! عبداللہ کی ماں کہاں ہے؟ تم کہاں ہو؛ تم سب کہاں ہو؛ تم سب کہاں ہو؛ چھپر کھٹ تلے الاؤ کی آگ بارش کی چادر کے عقب میں مدھم ہوتی جا رہی ہے اور پاس ہی ایک کتا گرم زمین پر بیٹھا ریشم کو غمگین آنکھوں سے تک رہا ہے۔

وہ لوگ چلے گئے ہیں ریشی! عبداللہ کی ماں برسوں سے بیمار ہے۔ وہ سب سے پچھلی کوٹھڑی میں کھاٹ پہ پڑی موت کا انتظار کر رہی ہے اور بابا چیڑھ کے اس پیڑ تلے قبر میں لیٹا

عبداللہ کی ماں کا انتظار کر رہا ہے۔ یہاں میرے سوا کوئی نہیں اور مجھے بھی سردی لگ رہی ہے اور میں کل سے بھوکا ہوں. . . آج بڑا پالا ہے۔ آج بڑی ٹھنڈ ہے۔ تمھیں بھی سردی لگ رہی ہو گی تمھارے سب کپڑے بھیگ گئے ہیں، آؤ میں انھیں آگ پر سکھا دیتا ہوں۔ سکھا دیتا ہوں اور میری مالکن کے بچے اسے چھوڑ گئے ہیں اور میرا مالک چیڑھ کے درخت کے نیچے سو رہا ہے۔

بادل پھر گرجا۔

اور چیڑھ کے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا کوئی بوڑھا پٹہ مرمت کرتے ہوئے تھکی تھکی آواز میں گنگنانے لگا۔

پیاری ماں!

چلتے چلتے شام ہو گئی ہے۔

کھیلتے کھیلتے شام ہو گئی ہے۔

ہاں! ابھی شام ہوئی ہے بابا اور میں گھر آ گئی ہوں۔ میں نے کہا تھا نا کہ لوٹتی مرتبہ ضرور ملوں گی۔ لاؤ اب میرے بھٹے۔

درخت خاموش کھڑے ہیں اور ان کی ٹہنیوں اور پتوں سے بارش کا پانی ٹپک رہا ہے۔ وہ چیڑھ کا درخت بھی خاموش ہے اور اس کے سائے میں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں. . . پھر یہ آواز کہاں سے آئی تھی؛ یہ ابھی ابھی کون کہہ رہا تھا. . . چلتے چلتے شام ہو گئی ہے. . . یہ کون تھا؟

تڑپ۔ تڑپ۔ تڑپ۔

درخت ٹپک رہے ہیں اور مدھم ہوتے الاؤ کے پاس غمگین آنکھوں والا کتا نیند میں جیسے کچھ کھانے کے لیے جبڑے ہلا رہا ہے۔

یہاں تو کوئی نہیں۔ کوئی بھی نہیں!

بینج ناگ کی پہاڑیوں پر بجلی کی چمک کے ساتھ بادلوں کی گرج ابھر ابھر کر ڈوبتی جا رہی ہے ریشم کا سانس پھول گیا ہے۔ پاؤں سے خون بہنے لگا ہے، اس کا بدن تپ رہا ہے اور غراتی چیختی، چلاتی، خوفناک برفانی ہوا کے جھونکے اس کے لباس کو تار تار کر رہے ہیں۔ وہ سڑک کے موڑ پر کھڑی آگے کو جھکی، چمبہ گلی گاؤں کی خاموش چھتوں والے مکان دیکھ رہی ہے۔ ان

مکانوں میں ایک مکان کی چھت ڈھے چکی ہے اور ملبے کے بھیگتے ڈھیروں میں سے سیاہ رنگ شہتیر باہر نکلے ہوئے ہیں۔

یہاں ایک مکان تھا۔ خوبصورت کھُلے آنگن والا۔ پھوس کے چھپر والا، ایک چھوٹی سی گرم کوٹھڑی والا۔ وہ مکان کہاں چلا گیا ہے؟ اس کے آنگن میں خوبانی کا پیڑ تھا۔ اور اس کے ساتھ لمبے لمبے ریشمی کانوں والی ایک بکری بندھی ہوتی تھی۔ اور چولھے کے پاس ایک عورت مکی کی روٹیاں پکایا کرتی تھی۔ اور چھپر کے نیچے ایک بوڑھا گڑگڑی پیتے ہوئے کھانسا کرتا تھا اور قریب ہی کمبل میں سوئی لڑکی کو جگایا کرتا تھا۔

"ریشم!.... ریشی! اٹھو بیٹا دن چڑھ آیا۔"

کاؤ کے درخت سے لپٹی ہوئی بیل سوکھ گئی ہے۔ سیب کے باغ میں درختوں پر سے پتے جھڑ گئے ہیں اور ان کا رنگ سیاہ ہو گیا ہے۔ اور وہ رو رہے ہیں۔ ترناری کی جھاڑیوں میں باؤلی کا پانی رل ترل۔ رل ترل کی خواب گوں آواز کے ساتھ پتھروں پر سے ہو کر بہہ رہا ہے۔ اس کے اوپر اخروٹ کا گنجان درخت اسی طرح سایہ کیے ہے۔ درخت کی شاخوں پر سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر باؤلی کی سطح پر گر رہے ہیں۔

ریشم باؤلی کنارے چورس پتھر پر بیٹھ گئی ہے۔

میں ریشی ہوں، سیب کے درختو!

میں چمبہ گلی کی گوالن ہوں ترناری کی جھاڑیو!

میرا نام ریشم ہے۔ ریشم! تم نے مجھے پہچانا نہیں۔

ترپ۔ ترپ۔ ترپ۔

رل۔ ترل۔ رل۔....

ہوا اخروٹ کی گھنی شاخوں میں الجھ کر سر پٹخ رہی ہے اور جموں اور کشمیر کی برف پوش پہاڑیوں میں بادلوں کی دھیمی دھیمی گرج پھر سنائی دے گئی ہے۔ ریشم، اخروٹ کے گیلے تنے سے لپٹ گئی۔

تم سب چپ کیوں ہو؟ تم مجھ سے بولتے کیوں نہیں؟ میں ریشی ہوں۔ میں بڑا لمبا سفر طے کر کے تمھیں ملنے آئی ہوں۔ میں نے پُرشور دریا، اندھیری گھاٹیاں اور خوفناک جنگل عبور کیے ہیں۔ دیکھو! میرے کپڑے پھٹ گئے ہیں اور میرے تلوؤں سے خون بہنے لگا ہے، میرے سایہ دار درختو! میری سوکھی ہوئی بیلو!

میری پیاری سہیلیو!

ترپ۔ ترپ۔ ترپ۔

ہم سدا روتے رہے ہیں گوالن! یہ ہماری ٹہنیوں پر سے گرتا ہوا بارش کا پانی نہیں۔ یہ ہمارے آنسو ہیں۔ ہم نے بہار میں اپنی شاخوں پر شگوفوں کی موم بتیاں جلا کر تیرا انتظار کیا۔ ہم نے اپنی جھولیاں پھلوں سے بھر بھر کر جھکے جھکے سارا سارا دن تیری راہ دیکھی۔ ہم نے چاندنی راتوں میں تیرے گیتوں اور شوخ قہقہوں کو یاد کیا اور ہم نے اندھیری راتوں میں جاگ جاگ کر اپنے گھونسلوں میں سونے والے پرندوں کو تیری کہانی سنائی۔ جب کوئی مسافر ہمارے باغ میں سے گزرتا یا پانی پینے کے لیے پل بھر ہمارے چشموں پر رکتا تو ہم اس سے ڈر ڈر کر پوچھتے۔

"مسافر! تو نے کسی ایسی لڑکی کو دیکھا ہے جس کے بالوں میں ہمارے پھول تھے۔ اور ہونٹوں پر ہمارے گیت.... وہ شہر گئی تھی اور ابھی تک واپس نہیں آئی۔

کسی نے ہمارے سوال کا جواب نہ دیا۔ پھر ہمارے پتے ایک ایک کر کے جھڑنے لگے، ہماری ٹہنیاں سوکھ گئیں۔ ہمارے سایوں میں چھپے ہوئے چشمے ننگے ہو گئے اور ہماری شاخوں پر سے کتر کتر کر پھل کھانے والے خوش الحان پرندے اڑ گئے۔ ہم نے انھی پتھریلی پگڈنڈیوں پر گاؤں کے لوگوں کو تیرے بابا پر آوازے کستے سنا اور انھی پگڈنڈیوں پر تیرے بابا اور تیری ماں کو سامان باندھے، ڈھوروں کو ہنکاتے کسی نامعلوم منزل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ہم نے اس وقت بھی تجھے آواز دی اور اپنی سب سے بلند شاخوں کے ہاتھ پھیلا پھیلا کر تجھے پکارا۔ لیکن تو نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو نہ آئی.... اور اب ہمارے پتے جھڑ گئے ہیں۔ اور ٹہنیاں ویران ہو چکی ہیں۔ اور بارش ہو رہی ہے اور ہمارے دامن میں آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں... آنسو.... جو رک رک کر گر رہے ہیں۔

ترپ۔ ترپ۔ ترپ۔

ہم تیرے پہاڑ ہیں، تیرے چشمے ہیں۔ تیرے مرغزار ہیں۔ تیرے جنگل ہیں اور ہم ہمیشہ روتے رہے ہیں، سدا روتے رہے ہیں۔ تجھے شہر مبارک ہوں۔ کوثرا اور فرخندہ مبارک ہو۔ سگریٹ اور کیک مبارک ہوں۔ چمکیلی سڑکیں اور دو منزلہ بسیں مبارک ہوں۔ ہم تجھے اتنا کچھ کہاں دے سکتے تھے۔ ہم تو دیہاتی ہیں۔ ریشم! ہمارے پاس سوائے مکی، جوار اور چشمے کے پانی کے اور ہے ہی کیا؟۔

کبھی گرتے پتے، کبھی ٹپکتے قطرے!
کبھی خشک آنسو اور کبھی گیلے آنسو۔

کوئی وائٹ ہارس نہیں، کوئی سکاچ نہیں، کوئی پونڈز نہیں، کوئی ریڈ سٹار اور میٹرو پول نہیں۔ آنسوؤں کی اس جھڑی میں تو آزردہ ہو جائیگی اور پتوں کی زرد سیج پر تیرا جی نہ لگے گا۔ ہمارا کہا مان اور ہماری کھوئی ہوئی گوالن! اپنی دو منزلہ بسوں اور چمکیلی سڑکوں پر واپس چلی جا۔ وہاں کوثر تیرا انتظار کر رہی ہے۔ دیکھ تیرا بدن سردی میں ٹھٹھر رہا ہے اور تیری گرم چادر شہر میں ہے۔ تیرے تلووں سے خون بہہ رہا ہے اور بڑے ہسپتال میں تیری کتنی ہی نرسیں واقف ہیں، ملاپ کی اس خوبصورت گھڑی کو جدائی کا جشن بنا کر مناؤ اور رخصت ہونے سے پہلے ہمارے نیلے آسمان کو جی بھر کے دیکھ لو۔ اور ہمارے چشموں سے اچھی طرح مل لو۔

ہم ہر بہار میں ریشی کا انتظار کریں گے۔
ہم ہر بہار میں ریشم کی راہ دیکھیں گے۔

اور ہم ہر مسافر سے پوچھیں گے، ہر پردیسی سے پوچھیں گے، اے ہماری چھاؤں میں سے گزرنے والے! تو نے ہماری ریشم کو دیکھا ہے؟ اور ہم تجھ سے پوچھتے ہیں اے زرد چہرے اور گھنگھریالے بالوں، اے سُرخ پرس اور دو منزلہ بسوں اور عالیشان عمارتوں والی لڑکی! تو نے کہیں ہماری ریشی کو تو نہیں دیکھا۔ وہ گوالن تھی اور ہمارے چھاؤں میں بھینسیں چرایا کرتی تھی، اور اس کے گلے میں چاندی کی ہنسلی ہوتی تھی۔ اور کمر کے گرد رسی لپٹی ہوتی تھی۔ وہ شہر گئی تھی، اور ابھی تک واپس نہیں آئی۔

تو نے اسے کہیں دیکھا ہے، دیکھا ہے؟

تڑپ، تپ۔ تڑپ۔ رل ترل۔ رل ترل۔

اور کہتے ہیں کہ وہ پہاڑی گوالن شہر میں ایک بڑی سڑک پر سے گزر رہی تھی کہ ایک دو منزلہ بس کی لپیٹ میں آ کر ہلاک ہو گئی۔۔۔۔۔

سگریٹ کہانی ختم کر کے چپ ہو گیا اور اپنی بجھی بجھی ملول آنکھوں سے موم بتی کو تکنے لگا۔ موم بتی کا رنگ زرد تھا اور آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

ریشم کا ماتھا پسینے میں بھیگ رہا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھیں دیوار پر تھیں۔ جہاں کیلنڈر میں ایک خچر اپنی پیٹھ پر کسی شے کے بڑے بڑے ڈبے لادے چلا جا رہا تھا۔ معاً خچر نے گردن موڑ کر ریشم کو رحم طلب نگاہوں سے دیکھا۔

مالکن! تو کسی مرتبہ مجھ سے بھی مل لیتیں۔ میں اب بھی وہیں ہوں۔ قاضی پور کے قبرستان کے ساتھ ساتھ جو سڑک جاتی ہے وہاں کچھ دور جا کر ایک ٹیلہ دکھائی دیگا۔ اس ٹیلے کے عقب میں بڑے بڑے پتھر توڑے جا رہے ہوں گے، میں تمھیں وہیں ملوں گا۔ مالکن میں صبح سے شام تک پتھر ڈھوتا ہوں اور میرا نیا مالک مجھے بہت مارتا ہے۔ جب تو آئے گی تو۔۔۔۔

ٹِک ٹِک ٹِک۔

دروازے پر کسی نے دستک دی، اونگھتے ہوئے سگریٹ نے آنکھیں بند کر لیں، موم بتی کا زرد شعلہ لرز کر ساکت ہو گیا۔ خچر نے کیلنڈر پر گردن موڑ لی۔

ٹک ٹک ٹک۔

باہر کسی نے پھر دستک دی۔ ریشم نے پھٹی پھٹی آنکھیں گھما کر بند دروازے کی طرف دیکھا۔ اور اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلی۔ جیسے وہ پتھر کی مورت میں بدل گئی ہو۔

دستک بار بار ہونے لگی۔ اور کیفے ریڈ سٹار کے چیچک رُو منیجر کی آواز آئی۔

"کوثرا! کوثرا! دروازہ کھولو۔ نسرین آئی ہے۔ کوثرا! کوثرا!"

ریشم نے کوئی جواب نہ دیا۔ دروازہ اندر کی طرف زور زور سے دھکیلا جانے لگا۔

"کوثر! کوثرا! کوثر!!!"

چُپ۔ چُپ۔ چُپ۔

خاموشی، گہری خاموشی۔ دروازہ اندر کی طرف سمٹنے لگا۔ وہ ٹوٹ جائے گا، ٹوٹ جائے گا۔ اور دیو پیکر دو منزلہ بسیں چیختی، چلاتی اس کے اوپر سے گزر جائیں گی اور وہ ہلاک ہو جائیگی کچلی جائے گی۔ دروازے کی چٹخنی آہستہ آہستہ نیچے کھسکنے لگی۔

کوثر! کوثر!

ایک شعلے کی طرح لپک کر ریشم اٹھی اور دونوں بازو پھیلا کر ٹوٹتے دروازے سے لپٹ گئی اور وحشیوں کی طرح بلند، مہیب اور الم انگیز آواز میں چیخنے لگی۔

"کوثر نہیں ہے۔ کوثر نہیں ہے... چھوڑ دو... چھوڑ دو... چھوڑ دو..."

آج بھی جب پہاڑوں پر پھولوں کی رت آتی ہے اور نینج ناگ جانے والے مسافر خچروں پر بیٹھے چیبہ گلی میں سے گزرتے ہیں یا تھوڑی دیر ستانے کے لیے باؤلی پر رکتے ہیں تو اخروٹ کا بوڑھا درخت اپنی کانپتی ہوئی شاخیں جھکا کر ان سے ضرور پوچھتا ہے۔

"تم نے ہماری ریشی کو تو نہیں دیکھا؟"

ہاں! اے اخروٹ کے بوڑھے درخت! ہم نے تیری ریشی کو دیکھا ہے اب اس کا نام کوثر جہاں ہے اور اس نے برقعہ اتار دیا ہے اور جب وہ چمکیلی کار یا ٹیکسی میں بیٹھی مال پر سے گزرتی ہے تو اس کا ایک ہاتھ کھڑکی سے باہر ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں سگریٹ ہوتا ہے اور اس نے بالوں کو سنہری کروالیا ہے اور اب اسے کسی زرد، سبز یا سرخ بلڈنگ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس گوالن کا خیال نہیں آتا، جس نے ڈرتے ڈرتے ایک پواڑی سے پوچھا تھا

"میرے ویر! چائے کمپنی کا دفتر کہاں ہے؟"